مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (۲)

حزبُ اللہ کے اوصاف

اور

امیر و مأمورین کا باہمی تعلق



ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (۲)

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی حزب اللہ کے اوصاف

اور

امیر و مأمورین کا باہمی تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد

مرتب
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 35869501-03
www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتّب

ایک بندۂ مؤمن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبۂ اُخروی میں کامیابی ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے قرآن حکیم اور سنّت و سیرتِ رسول ﷺ سے ہمیں دین کے تقاضوں اور مطالبوں کی صورت میں دینی فرائض اور ان کے لوازم کا ایک مکمل خاکہ ملتا ہے۔ لیکن اُمّت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ جب دینی فرائض اور اُن کے لوازم کا یہ مکمل اور جامع خاکہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اسلام محض چند عقائد' عبادات اور معاشرتی رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہوا ہے کہ اس درویش خدا مست نے دورِ حاضر میں اُمّتِ مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے ایک طرف رجوع الی القرآن کی تحریک چلائی اور دروسِ قرآن و دورۂ ترجمۂ قرآن کے ذریعے دنیا بھر میں قرآن حکیم کے علم و حکمت اور مطالب و معانی کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت کا اہتمام کیا اور دوسری طرف قرآن حکیم پر غور و تدبر کے نتیجے میں حاصل ہونے والے دینی فرائض کے جامع تصور کو نہ صرف عام کیا اور سنت و سیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں ان فرائض کے لوازم اور تقاضوں کو واضح کیا' بلکہ ان دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک اسلامی انقلابی جماعت ''تنظیم اسلامی'' بھی قائم کی۔

ایک مسلمان کے سامنے یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ اُس کے دین کے اُس سے کیا تقاضے ہیں اور اس کا ربّ اُس سے کیا چاہتا ہے' یعنی عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین' محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن کریم کی فکری و عملی راہنمائی پر مبنی مطالعۂ قرآن حکیم کا ایک منتخب نصاب مرتب فرمایا اور متعدد بار اس کے مفصل اور مختصر دروس دیے۔ ان دروس کا ایک سلسلہ چوبیس کتابچوں اور ایک ضخیم کتاب (سورۃ الحدید کی مختصر تشریح) کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس منتخب نصاب کو دعوت رجوع الی القرآن اور تنظیم اسلامی کی دعوت و تحریک کی اساس کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ محترم ڈاکٹر صاحب نے مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (دوم) بھی مرتب فرمایا جو اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی

مسائل کے ضمن میں ہدایات پر مشتمل ہے۔ منتخب نصاب (اوّل) کے تیسرے حصے میں انفرادی سیرت و کردار کے اعتبار سے قرآن کے انسانِ مطلوب کے بنیادی اوصاف سے متعلق مقامات بھی شامل کیے گئے ہیں اور اس کے تکمیلی اوصاف کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کا حصہ چہارم جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مباحث پر مشتمل ہے اور اس میں قرآن حکیم کے وہ مقامات شامل ہیں جن سے غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کی فرضیت واضح ہوتی ہے' جبکہ حصہ پنجم مباحث صبر و مصابرت پر مشتمل ہے۔ البتہ یہ بحث کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والے اہل ایمان کے اندر جو خصوصی اوصاف پیدا ہونے لازم ہیں وہ کیا ہیں؟ اور یہ کہ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے قائم کی جانے والی جماعت کے ضمن میں قرآنی رہنمائی' یہ بحث ابھی تشنہ تھی— چنانچہ اس منتخب نصاب (دوم) میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جن اضافی اور خصوصی اوصاف کی ضرورت ہے نہ صرف یہ کہ اُن سے متعلق مقامات کو شامل کیا گیا ہے بلکہ مزید برآں اقامت دین کی انقلابی جدوجہد میں قیامِ جماعت' التزامِ جماعت' نظم کے تقاضے' امیر اور مأمورین کا باہمی رشتہ اور ان کے حقوق و فرائض جیسے نہایت اہم موضوعات کو بھی شاملِ نصاب کیا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب ''اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی حزبُ اللہ کے اوصاف اور امیر و مأمورین کا باہمی تعلق'' مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب (دوم) کے دس دروس پر مشتمل ہے جو محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے تنظیم اسلامی کی ایک خصوصی تربیت گاہ (منعقدہ اپریل ۱۹۸۶ء) میں ارشاد فرمائے تھے۔ ان خطابات (دروس) کو مرتب کر کے تحریری صورت میں پیش کرنے کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی ہے۔ خطابات کی ترتیب و تسوید اور تخریج احادیث کے ضمن میں راقم کو شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور کے ادارتی معاون جناب طارق اسماعیل ملک کا تعاون حاصل رہا ہے۔ ترتیب و تسوید کے بعد یہ دروس قبل ازیں ۰۴۔۲۰۰۳ء کے دوران ماہنامہ میثاق میں شائع کیے جا چکے ہیں اور اب نظر ثانی کے ساتھ انہیں کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو محترم ڈاکٹر صاحب اور ہم سب کے لیے اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ اور توشۂ آخرت بنائے۔ آمین!

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات

۲۰ جون ۲۰۰۶ء

ترتیب

درس ۱

اقامتِ دین کی فرضیت
اور اس کے لیے زوردار دعوت

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ
يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۴ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ
اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ
وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾ (الشورٰی)...... صدق اللّٰہ العظیم

چند تمہیدی امور

اِن صفحات میں ہم مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب نمبر۲ کا سلسلہ وار مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر اقامت دین یا ’’اظہارُ دینِ الحقّ علی الدّینِ کُلِّہٖ‘‘ کے لیے قائم ہونے والی اجتماعی قوت یا جماعت سے متعلق مسائل سے بحث کرتا ہے۔ ہمارا

بنیادی منتخب نصاب جو ہماری پوری دعوت وتحریک کی اساس بنا ہے' اس سے آپ میں سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ اس میں جہاں تک اوصاف کا تعلق ہے' افراد میں جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا ذکر اعمالِ صالحہ کے ضمن میں آتا ہے کہ ایمان کا جو نتیجہ انسان کے سیرت وکردار اور اس کے اعمال میں رونما ہونا چاہیے اور اس کے جن اثرات وثمرات کا ظہور انسانی شخصیت میں ہونا چاہیے وہ کیا ہیں۔

اس منتخب نصاب کے تیسرے حصّہ میں سب سے پہلے ہم نے انفرادی کردار اور انفرادی سیرت سے متعلق مقامات شامل کیے کہ از روئے قرآن ایک فرد کی سیرت کن اساسات پر تعمیر ہوگی اور ایک پورے طور سے تعمیر شدہ انسانی شخصیت' تعمیر شدہ انسانی خودی' یا ایک پوری طرح mature انسان' جو قرآن کا انسانِ مطلوب ہے' اس کی شخصیت کے خدوخال کیا ہیں۔ چنانچہ ایک فرد کے اعتبار سے ابتدا اور انتہا' یعنی بنیادی اوصاف اور تکمیلی اوصاف کو منتخب نصاب میں شامل کیا گیا۔ جہاں تک بنیادی اوصاف کا تعلق ہے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور ان کی بالکل ہم مضمون سورۃ المعارج کی آیات کے حوالے سے ہم نے یہ سمجھا کہ وہ عمل صالح جو انسان کی شخصیت میں پیدا ہونا چاہیے' اس کی اساسات کیا ہیں۔ یعنی عمل صالح کے اعتبار سے شخصیت کی تعمیر کن بنیادوں پر ہوگی۔ پھر ایک بندۂ مؤمن کی پختہ اور پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کی جھلک ہمارے سامنے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ''عباد الرحمٰن'' کے اوصاف کی صورت میں آ گئی' جہاں اس کی پوری طرح تکمیل شدہ وتیار (finished) اور ہر اعتبار سے پختہ (mature) حالت کی کامل تصویر کشی کر دی گئی۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا حصّہ چہارم جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے مباحث پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں قرآن حکیم کے وہ مقامات شامل ہیں جن میں دین کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی فرضیت واضح ہوتی ہے۔ اس جدوجہد سے جی کترانے کا جو نتیجہ نکلتا ہے' یعنی نفاق' اس کے اعتبار سے سورۃ المنافقون شاملِ نصاب کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ اقامتِ دین یا غلبۂ دین کی جدوجہد کے ضمن میں اساسی منہاج سورۃ الجمعۃ میں بیان

ہوا ہے۔ چنانچہ یہ مقامات اس میں شامل ہیں۔

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا حصّہ پنجم مباحث صبر ومصابرت پر مشتمل ہے۔ یہ حصّہ تواصی بالصبر سے متعلق ہے کہ غلبۂ دین کی جدوجہد میں بندۂ مؤمن کو جو تکالیف ومصائب' ابتلاءات اور آزمائشیں پیش آتی ہیں ان میں ثابت قدم رہنے کی ضرورت واہمیت کے ضمن میں ہمیں قرآن مجید سے کیا ہدایات ملتی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں گے تو یہ بات سامنے آ جائے گی کہ وہاں ایک خلا رہ گیا تھا۔ اور وہ یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کو اپنے اندر جو خصوصی اوصاف پیدا کرنے لازم ہیں وہ کیا ہیں؟ اگر ان اوصاف میں کوئی کمی رہ گئی تو وہ ایک اچھا انسان تو ہوگا' اچھا مسلمان بھی ہو گا' اس کی شخصیت کے اندر ایک دلآویزی بھی پیدا ہو جائے گی' اور عباد الرحمٰن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ اپنے سیرت وکردار میں پیدا کر لے تو وہ یقیناً اللہ کا محبوب بندہ بھی ہوگا اور وہ عبد الرحمٰن کہلانے کا مستحق ہو جائے گا' لیکن وہ اس جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ہر سطح پر کچھ نئے تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد' جہاد فی سبیل اللہ' اللہ کے دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد کے ضمن میں جن اضافی اور خصوصی اوصاف کی ضرورت ہے ان کو ہم نے اس منتخب نصاب نمبر۲ میں شامل کیا ہے اور اس طرح جو خلا وہاں رہ گیا تھا اُسے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح' جیسا کہ ہمیں معلوم ہے' اقامت دین کی جدوجہد ایک انقلابی جدوجہد ہے۔ لہٰذا قیامِ جماعت' التزامِ جماعت' نظم کا قیام' امیر اور مأمور کا باہمی رشتہ جیسے موضوعات اس انقلابی جدوجہد کے لوازم میں سے ہیں۔ یہ موضوع از خود نہایت اہم ہے کہ اس جماعت کی بنیاد کیا ہے' اس کی اساس کیا ہے' یہ کس طرح وجود میں آتی ہے' اس کا دستور کیا ہے' اس میں امیر کے حقوق اور اس کے فرائض کیا ہیں' مأمورین کے حقوق وفرائض کیا ہیں اور ان کے باہمی مشورے کا نظام کیا ہوگا! اقامت دین کی جدوجہد کے ضمن میں یہ نہایت اہم موضوعات بھی ہمارے اس بنیادی منتخب نصاب میں موجود نہیں تھے۔ تو اصل میں اس خلا کو پُر کرنے کے لیے یہ منتخب نصاب (۲) ترتیب دیا

گیا ہے' جسے آپ چاہیں تو اُسی منتخب نصاب کا ضمیمہ یا تتمہ سمجھ لیں۔

اِس منتخب نصاب کی ترتیب کے وقت میرے ذہن میں ایک پلان تھا' جس میں سب سے پہلی چیز یہ پیش نظر تھی کہ قرآن حکیم کی روشنی میں ہم پر واضح ہو جائے کہ دین کے ہم سے کیا تقاضے اور مطالبے ہیں! یعنی ہمارا دین ہم سے چاہتا کیا ہے! یہ چیز ہمارے سامنے رہے تو پھر ہم امکانی حد تک' جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید شاملِ حال ہوتی جائے' ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہوں۔ اس کی اہمیت پر میں نے بہت سے مواقع پر تقریریں کی ہیں اور دروس دیے ہیں' اس لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اگر یہ تصور ہی واضح نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی درمیانی منزل کو آخری منزل سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں۔ ورنہ ہمارے سامنے یہ بات تو رہے گی کہ ع چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی! اور یہ چیز ہمیں آگے سے آگے بڑھاتی رہے گی۔ لہٰذا ہمیں اپنی منزل متعین کرنی ہے اور بلند ترین ہدف کے اعتبار سے اس کا تعین کرنا ہے۔ باقی یہ کہ چلنا قدم بقدم ہے۔ اگر ہم نے کچھ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو گرنے کا شدید اندیشہ ہے۔ چنانچہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں توازن کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ منزل بلند ہو' اور دوسرے یہ کہ چلنے کے اندر جو بھی تدریج مطلوب ہے اس کو ہم نظر انداز نہ کریں۔ اور یہ دونوں چیزیں بیک وقت ہونی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاً اس منتخب نصاب (۲) کے درس اوّل کا عنوان ''فرائض دینی کا جامع تصور'' ہے اور یہ ہے اصل میں وہ ربط جو منتخب نصاب (۱) سے قائم ہوتا ہے' جس کا میں حوالہ دے چکا ہوں۔ اسی لیے یہاں پہلے سورۃ الحج کی آخری دو آیات کا ذکر ہے۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کا ایک بڑا امر کزی درس ہے۔

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا چوتھا حصہ جب شروع ہوتا ہے' تو اس حصے کا پہلا سبق یہی سورۃ الحج کا آخری رکوع ہے۔ اس کی پہلی چار آیات میں ایمانیات کی بحث ہے اور آخری دو آیات میں اب وہ تقاضے ہیں کہ اللہ چاہتا کیا ہے؟ چنانچہ ایک آیت میں تابڑ توڑ چار حکم ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا

رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ ''اے ایمان والو! رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے ربّ کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو''۔ یہ ہمارے فرائض دینی کی اوّلین سطح ہے: اللہ کی بندگی' اچھے اعمال اور اچھے کردار کو اختیار کرنا اور رکوع وسجود۔ یعنی ارکانِ اسلام پر کاربند ہونا۔

اس کے بعد اگلی آیت میں دوسری منزل کا ذکر ہے۔ وہ دوسری منزل جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے۔ فرائض دینی کی پہلی سطح پر بھی لفظ ''مجاہدہ'' استعمال تو ہوتا ہے' مجاہدہ مع النفس نہیں کریں گے تو اللہ کے بندے کیسے بنیں گے؟ حرام سے کیسے بچیں گے؟ نفس کے خلاف جہاد کرنا ہے' لیکن اس کے لیے ''فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ وہ اپنے نفس سے مجاہدہ ہے' کشمکش ہے' تاکہ اسے اللہ کی اطاعت کا خوگر بنایا جائے۔ لیکن ''جہاد فی سبیل اللہ'' جو ایک مستقل اور مکمل اصطلاح بنتی ہے' اُس کی پہلی منزل' جو فرائض دینی کے اعتبار سے دوسری منزل ہے' وہ شہادت علی الناس ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ''جہاد کرو اللہ کے لیے جتنا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے''۔ ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی'' ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ﴾ ''قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر''۔ ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ ''اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)''۔ آگے بیان کیا جا رہا ہے کہ اس جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کی غایتِ اولیٰ ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تاکہ رسول گواہ بنیں تم پر اور تم گواہ بنو پوری نوعِ انسانی پر''۔ رسول اتمامِ حجت فرمائیں تم پر اور تم اتمامِ حجت کرو پوری نوعِ انسانی پر۔ تو یہ گویا کہ ہمارے فرائض دینی ہیں۔ یہ دوسری منزل متعین ہو گئی۔ اس پر تفصیلی درس دینا اس وقت مقصود نہیں ہے' اس لیے کہ یہ ہمارے منتخب نصاب (۱) کا اہم درس ہے' اس کے بے شمار کیسٹس موجود ہیں اور بہت مرتبہ آپ حضرات نے یہ درس خود مجھ سے براہِ راست بھی سنا ہو گا۔

اب اس کے بعد تیسری منزل آتی ہے' جس کے لیے ہمارے اس منتخب نصاب (۱) میں اہم ترین اصطلاح ''اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ'' ہے۔ یعنی دینِ حق کو پورے کے پورے دین پر' پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دینا۔ اس منتخب نصاب میں سورۃ الصّف اسی موضوع پر مشتمل ہے اور یہ آیت اُس کا عمود ہے' main theme ہے' axis ہے' سنٹرل آئیڈیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ اللہ کے فضل وکرم سے اس پر نہ صرف میرے متعدد دروس موجود ہیں' بلکہ ''نبی اکرمﷺ کا مقصدِ بعثت'' کے عنوان سے میری ۲۴ صفحات کی ایک تحریر صرف اس ایک آیۂ مبارکہ پر ہے' جس کے بارے میں الحمدللہ مجھے اطمینان ہے کہ اس تحریر میں اس آیۂ مبارکہ کا حق ادا ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے' لہٰذا بعد میں آنے والوں کے لیے مزید راستے کھلے ہوں گے' لیکن اس وقت کی حد تک میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس تحریر کے بارے میں مجھے بعد میں کوئی ایسا احساس نہیں ہوا کہ کوئی بات غلط لکھی گئی ہے یا کہیں کوئی بات قابل اصلاح رہ گئی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کی نیت میں کھوٹ نہ ہو اور کوئی بغض وعناد' عداوت' ہٹ دھرمی یا تعصب حائل نہ ہو جائے تو ان ۲۴ صفحات کے بعد اس آیت کے بارے میں کسی کے لیے بھی اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ یہ دین کے تقاضوں میں آخری اور بلند ترین منزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہاں اس کا حوالہ سورۃ الصّف کی طرف سے دے دیا گیا کہ سورۃ الصّف میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے لیے جہاد کرو' یہ مقصدِ بعثتِ محمدیﷺ ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے اس کے لیے تن من دھن وہی لگائیں گے جو اہلِ ایمان ہیں' جو اللہ اور اس کے رسولﷺ پر ایمان کے مدعی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

تو یوں سمجھئے کہ اُس منتخب نصاب (۱) کی ان پانچ آیات (سورۃ الحج کی آخری دو آیات اور سورۃ الصّف کی آیات ۹ تا ۱۱) کے ذریعے اِس منتخب نصاب (۲) کے ساتھ اس کا تعلق جوڑا گیا ہے' جیسے ریل کی دو بوگیوں کو انٹرلاک کیا جاتا ہے۔

غلبہ وا قامت دین کے لیے مختلف اصطلاحات

اب ہم اس سلسلے کا پہلا درس شروع کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے ''اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے لیے زوردار دعوت''۔ یہ درس سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ اور آیات ۴۷' ۴۸ پر مشتمل ہے۔ ان آیات کا لفظ بلفظ مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الصّف اور سورۃ الفتح میں جو اصطلاح ''اظہار دین الحق علی الدّین کلہٖ'' وارد ہوئی ہے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے قرآن میں تین مزید اصطلاحات ہیں۔ ایک سورۃ المدثر کی اصطلاح ''تکبیر ربّ'' ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ ''اے لحاف میں لپٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ' لوگوں کو خبردار کرو اور اپنے ربّ کی بڑائی کرو!'' یعنی زبان سے بھی اللہ اکبر کا اعلان کرو کہ ہمارا ربّ سب سے بڑا ہے' سب چھوٹے ہیں وہ بڑا ہے۔ اور پھر اس کی بڑائی کو عملاً دنیا کے اندر قائم کرو کہ وہ نظام برپا ہو جائے جس میں بالفعل اللہ کی بڑائی مسلم ہو' اللہ کی بڑائی نافذ ہو۔ ورنہ تو وہ کہنے کی ایک بات ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو تکبیر ربّ کا مفہوم بھی وہی ہو گیا جو دین کے غلبے کا مفہوم ہے۔ ایک دوسری اصطلاح اقامت دین ہے' جو سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں وارد ہوئی ہے۔ تیسری اصطلاح مدنی سورتوں میں سورۃ الانفال اور سورۃ البقرۃ میں آئی ہے' لیکن سورۃ الانفال میں زیادہ کامل شکل میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ وفساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل صرف اللہ کے لیے ہو جائے''۔ یہ درحقیقت تین مزید اصطلاحات ہیں جو ''اظہار دین الحق علی الدّین کلہٖ'' ہی کے مفہوم کو ادا کر رہی ہیں' صرف یہ کہ الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ ؎ اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!

اس ضمن میں حدیث نبویؐ کی ایک اور اصطلاح اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا))(۱) ''تاکہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے''۔ سب کی باتیں نیچی رہ جائیں اور اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے۔ یہی مفہوم انجیل میں ''آسمانی بادشاہت'' کی اصطلاح کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ زمین پر آسمانی بادشاہت قائم کرنے کا مطلب وہی ہو گیا کہ اللہ کا دین قائم کرنا۔ زمین پر کسی بادشاہ' کسی فرعون' کسی نمرود کی بادشاہی نہیں' کسی قوم کی بادشاہی نہیں' بلکہ آسمان کی بادشاہی قائم ہو۔ اور آسمان سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ بائبل کی Lord's Prayer میں اسے اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

Thy Kingdom come,
Thy will be done on earth
as it is in Heavens.

''اے ربّ! تیری حکومت آئے' تیری سلطنت قائم ہو جائے' اور تیری مرضی زمین پر بھی اسی طرح پوری ہو جس طرح آسمانوں میں پوری ہوتی ہے''۔

بیسویں صدی میں ہمارے کچھ اسلاف نے' جو اَب اللہ کے ہاں جا چکے' اس کام کے لیے اپنی کوششیں کیں اور اس ضمن میں مختلف اصطلاحات استعمال کیں۔ اس سے قطع نظر کہ کون راستے میں تھک ہار کر رہ گیا اور کون غلط موڑ مڑ گیا' ہم ان اصطلاحات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں اوّلین مولانا ابوالکلام آزاد ہیں' جنہوں نے ''حکومتِ الٰہیہ کا قیام'' کی اصطلاح اختیار کی۔ یہی اصطلاح پھر مولانا مودودی نے اپنائی اور اسی زمانے میں علامہ مشرقی اور خیری برادران نے بھی غلبہ دین کے لیے یہی ''حکومتِ الٰہیہ کا قیام'' کی اصطلاح اپنائی' یعنی اللہ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پھر جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کی جگہ ''اقامت دین'' کی اصطلاح متعارف کرائی۔ مولانا مودودی کے قلم سے جماعت اسلامی کے قیام سے قبل جو ابتدائی تحریریں نکلی ہیں ان میں حکومتِ الٰہیہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ اصلاحی صاحب

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من سأل وھو قائم عالما جالسا۔

مولانا فراہیؒ کے شاگرد تھے' ان کا خصوصی شغف قرآن مجید کے ساتھ تھا۔ چنانچہ شہادت علی الناس کی اصطلاح بھی اور اقامت دین کی اصطلاح بھی انہوں نے متعارف کرائی' یہاں تک کہ جماعت اسلامی کی تحریک میں یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ پھر حکومت الٰہیہ کی اصطلاح کو ترک کر دیا گیا اور جماعت اسلامی کے زیر اثر ایک ایک بچے کی زبان پر جو لفظ سب سے زیادہ سننے میں آنے لگا وہ اقامتِ دین تھا۔ البتہ ''اقامت دین'' چونکہ ایک ثقیل لفظ ہے جس کے معنی ہیں دین کو کھڑا کرنا' دین کو قائم کرنا' لہٰذا جب جماعت اسلامی نے سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا تو انہوں نے کوشش کی کہ اب اصطلاحات بھی ذرا زیادہ عام فہم ہونی چاہئیں تو انہوں نے ''قیامِ نظامِ اسلامی'' کی اصطلاح استعمال کی۔ مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ پھر ہمارے ہاں ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب کے خلاف پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی جو تحریک چلی تھی' اس کے اندر جب دینی جذبہ پیدا ہوا اور اس کو مشرف باسلام کیا گیا تو اس میں ایک اصطلاح استعمال کی گئی ''نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ''۔ یہ اصطلاح مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے پیش کی تھی جسے اتحاد میں شامل جماعتوں نے قبول کر لیا اور پھر یہی اصطلاح اس تحریک کا عنوان بن گئی۔ مفہوم کے اعتبار سے یہ اصطلاح بھی متذکرہ بالا اصطلاحات کے ہم معنی ہے۔

اِس دور میں ان اصطلاحات میں ایک اصطلاح ''اسلامی انقلاب'' کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ جب زمانہ بدلتا ہے تو لوگوں کے ذہن کا صغریٰ کبریٰ تک بدلتا ہے' لہٰذا ابلاغ کے لیے نئی اصطلاحات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلۂ اصطلاحات میں ''اسلامی انقلاب'' کی اصطلاح سب سے زیادہ مؤثر' سریع الاثر اور سمجھنے میں آسان ہے۔ تو یہ ساری اصطلاحات ''عباراتُنا شتّٰی وحسنك واحدٌ'' کی مصداق ہیں۔ آپ اسے اظہار دین حق علی الدین کلہ کہیں' اقامتِ دین کہیں' ویکون الدین کلہ للہ کہیں' تکبیر ربّ کہیں' اعلائے کلمۃ اللہ کہیں' آسمانی بادشاہت کہیں' اللہ کی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہیں' نظامِ مصطفیٰؐ کا نفاذ کہیں' نظامِ اسلامی کا نفاذ کہیں یا اسلامی انقلاب کا

نام دیں، مفہوم ایک ہی ہے۔

اس موضوع پر ''اقامت دین'' کی اس اصطلاح کو متعارف کرانے کے لیے سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ اور آیات ۴۷، ۴۸ ہمارے اس منتخب نصاب (۲) میں درسِ اوّل کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔

سورۃ الحدید اور سورۃ الشوریٰ میں باہمی مماثلت

ان آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے قبل ایک بات آپ آغاز ہی میں نوٹ فرمالیں۔ میرے مختلف دروس کے ذریعے سے بہت سے حضرات کے علم میں یہ بات آچکی ہوگی کہ میرے قلب پر سورۃ الحدید کا انتہائی گہرا تاثر ہے اور میں مسلمانوں سے خطاب کے ضمن میں اس سورۂ مبارکہ کو قرآن مجید کا ذروۂ سنام سمجھتا ہوں، اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ میں نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب (۱) کا حرفِ آخر سورۃ الحدید کو قرار دیا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے اور حرفِ آخر سورۃ الحدید۔ میرے نزدیک جو مقام مدنی سورتوں میں سورۃ الحدید کا ہے بالکل وہی مقام مکی سورتوں میں سورۃ الشوریٰ کا ہے۔ اور ان دونوں میں بڑی عجیب مماثلت ہے۔

سورۃ الشوریٰ حجم کے اعتبار سے سورۃ الحدید سے دوگنی ہے۔ اِس کی آیات ۵۳ ہیں، اُس کی ۲۹ ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ جس طرح سورۃ الحدید کی ابتدائی چھ آیات ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں نہایت اہم ہیں اور ان میں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ اعلیٰ ترین علمی و عقلی سطح پر اور اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح پر زیر بحث آئی ہیں، اسی طرح (دوگنے حجم کے پہلو سے) سورۃ الشوریٰ کی ابتدائی بارہ آیات ذات و صفاتِ باری تعالیٰ سے بحث کرتی ہیں اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور صفاتِ جلال کا بیان ہے۔ وہاں چھ آیات کے بعد ساتویں آیت میں تقاضا سامنے آتا ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ......﴾ یہاں بارہویں آیت کے بعد تیرہویں آیت اس تقاضے پر مشتمل ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾۔ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے اللہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ تو حقیقتِ کبریٰ ہے، وہ تو حقیقتِ مطلقہ ہے۔ لیکن اصل میں تمہاری نجات،

تمہاری فلاح، تمہاری کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کو مانو جیسا کہ ماننے کا حق ہے اور اس کے حکم کو مانو جیسا کہ اس کے حکم کو ماننے کا حق ہے۔ اس کو ماننے کا حق کیا ہے؟ اس کا تقاضا کیا ہے؟ ایمان! چنانچہ فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر''۔ اور اس کے حکم کو ماننا کیا ہے؟ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ''اور (اُس کی راہ میں) لگادو، کھپادو، صرف کردو اُن سب چیزوں میں سے کہ جن میں اس نے تمہیں خلافت اور اختیار عطا فرمایا''۔ سورۃ الحدید میں یہ انداز تھا۔ یہاں وہی چیز اقامتِ دین کی اصطلاح کے حوالے سے سامنے آئی: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ ''کہ قائم کرو دین کو اور اس میں باہم تفرقہ مت ڈالو!''

پھر یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ میزان کا لفظ کتاب کے ساتھ جڑ کر قرآن مجید میں صرف دو سورتوں میں آیا ہے، ایک سورۃ الشوریٰ اور دوسری سورۃ الحدید۔ یہاں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾ (آیت ۱۶) اور اسی انداز سے بریکٹ ہو کر یہ دو الفاظ سورۃ الحدید میں آئے ہیں: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ کسی اور جگہ آپ کو یہ دو الفاظ اس طرح جڑے ہوئے نہیں ملیں گے۔ اور اس ضمن میں وہ اصول بھی پھر دوبارہ ہمارے سامنے آیا کہ اہم مضامین قرآن میں دو مرتبہ لازماً آتے ہیں۔ اس کی بھی گویا کہ ایک اور مثال آپ کے سامنے آ گئی۔

آیت ۱۳ کا مطالعہ اور مختلف تراجم کا تقابل

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کے بارے میں ایک بات یہ نوٹ کیجیے کہ یہ آیت بھی مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس کی ترکیب نحوی بہت مشکل ہے۔ اس میں کہیں کوئی چیز محذوف ماننی پڑتی ہے اور اس کے دو ترجمے کیے گئے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں صرف ونحو میں اس مہارت کا مدعی نہیں ہوں کہ میں حَکم بن کر بیٹھوں کہ کون سا ترجمہ غلط ہے اور کون سا ترجمہ صحیح ہے، لیکن میرا دعویٰ یہ ہے کہ ان دونوں ترجموں سے نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اگر الفاظ کے اس طرح کے

اختلاف کے باوجود نتیجہ وہیں پہنچ رہا ہو تو پھر الفاظ کے چکر میں اپنے آپ کو زیادہ الجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' بلکہ مفہوم کو دیکھئے' اس طرح بھی وہی مفہوم ہے اور اُس طرح بھی وہی۔ یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے جیسے آیۂ اظہارِ دین کا ہے کہ ﴿لِیُظْهِرَهٗ﴾ میں ایک ضمیر فاعلی ہے اور ایک ضمیر مفعولی ''تاکہ وہ غالب کر دے اس کو''۔ اب ایک ہے غالب کرنے والا' ایک وہ جس کو غالب کیا جائے۔ اب ان دو ضمیروں کے جتنے بھی ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں ان سب کا احاطہ کر کے میں نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں ثابت کر دیا ہے کہ کہیں مفہوم میں فرق واقع نہیں ہوتا' بات ایک ہی ہے۔ اُسی کی ایک مثال یہ ہے کہ یہاں بھی آیت کے ایک ٹکڑے کے دو ترجمے کیے گئے ہیں' جو نتیجے کے اعتبار سے ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔

اب ہم اس آیۂ مبارکہ (۱۳) کا مطالعہ شروع کرتے ہیں: ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ﴾ شارع کہتے ہیں راستے کو۔ چلنے کی جو ہمارے پاس ایک سیدھی راہ ہے' صراطِ مستقیم ہے' وہ شریعت ہے۔ طریق بھی راستے کو کہتے ہیں' طریقت بھی چلنا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شریعت ظاہری چلنا ہے اور طریقت باطنی چلنا ہے۔ لیکن ان دونوں میں کوئی فصل نہیں ہے۔ ظاہر و باطن ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں چیزیں (شریعت اور طریقت) ایک ہی مفہوم کی حامل ہیں' البتہ ان کا اطلاق مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ہو جاتا ہے۔ شارع بمعنی راستہ اردو میں مستعمل ہے' آپ کہتے ہیں یہ شارع عام نہیں ہے۔ تو ﴿شَرَعَ لَکُمْ﴾ کا مفہوم ہوگا: ''راہ ڈالی تمہارے لیے''۔ اس کا مفہوم یہ بھی ہے: ''معین کیا تمہارے لیے' عائد کر دیا تم پر''۔ آپ ان میں سے جو چاہیں ترجمہ اختیار کر لیں' اس کے مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ ﴿مِنَ الدِّیْنِ﴾ کے بھی دو مفہوم لیے گئے ہیں۔ یعنی ''از قسم دین'' یا ''در بارۂ دین''۔ یہ میں نے فارسی کی دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''دین میں وہ چیز مقرر کی گئی'' یا ''دین کے سلسلے میں وہ چیز مقرر کی گئی''۔ نتیجہ مَیں آپ کو بعد میں بتا دوں گا کہ کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ ''تمہارے لیے دین میں (یا دین کے سلسلے میں یا دین کے ضمن میں) وہ چیز مقرر کی

گئی''۔ ﴿مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا﴾ ''جس کی وصیت کی تھی نوح کو''۔ ''وَصّٰی'' کا فاعل کون ہے؟ اللہ! یعنی اللہ تعالیٰ نے وصیت کی نوح کو۔ وصیت کا لفظ ہمارے پہلے ہی درس (سورۃ العصر) کے اندر آتا ہے اور وہاں اس پر تفصیل سے بحث ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ مختلف ابواب سے آتا ہے۔ باب اِفعال سے اَوْصٰی ۔ یُوْصِیْ ۔ اِیْصَاءً : وصیت کرنا اور باب تفعیل سے وَصّٰی ۔ یُوَصِّیْ ۔ تَوْصِیَةً۔ اس میں اہتمام ہے' یعنی پیہم اور مسلسل وصیت کرتے رہنا' جیسے ''اِعْلَام'' کا مفہوم کسی کو کوئی چیز بتا دینا ہے' جبکہ ''تعلیم'' کسی کو ذہن نشین کرانا' اس کو hammer کرنا ہے۔ اسی طرح باب تفاعل سے آتا ہے تَواصی کہ آپس میں ایک دوسرے کو وصیت کرنا' یا اس میں مبالغے کا انداز پیدا ہو جائے گا کہ کثرت سے وصیت کرنا۔ یہاں وَصّٰی ہے' یعنی بہت تاکیدی حکم۔ ''راہ ڈالی تمہارے لیے دین کے ضمن میں یا دین کے بارے میں (بسلسلۂ دین یا در بارۂ دین) وہی جس کی وصیت کی تھی نوح کو'' ﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ﴾ ''اور جس کی وحی کی ہے ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف''۔ اِلَیْكَ کی ضمیرِ مخاطب کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے حضور ﷺ مراد ہیں۔ ﴿وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی﴾ ''اور جس کی ہم نے وصیت کی اور تاکید کی ابراہیمؑ کو بھی اور موسیٰؑ کو بھی اور عیسیٰؑ کو بھی''۔

اب یہاں تک بات آپ نے سمجھ لی۔ تو یوں سمجھئے کہ اگر تو آپ ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ﴾ کا یہ ترجمہ کریں گے کہ ''دین کے ضمن میں وہی چیز مقرر کی ہے'' تو اس کا مطلب ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک دین ایک ہی ہے۔ یعنی وہی دین تمہارے لیے مقرر کیا جو نوح کے لیے' ابراہیم کے لیے' موسیٰ کے لیے اور عیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے لیے مقرر کیا اور اسی کی وحی کی ہے ہم نے اے محمد ﷺ آپ کی طرف۔ تو یہ تو ایک مراد ہوئی۔ دوسری مراد یہ ہوگی کہ اس دین کے ضمن میں جو ذمہ داری نوح پر' ابراہیم پر' موسیٰ پر اور عیسیٰ پر (علیہم الصلوٰۃ والسلام) عائد کی تھی اور جس کی وحی اے محمد ﷺ ہم آپ کو بھی کر چکے ہیں وہی ذمہ داری اے مسلمانو! ہم تم پر عائد کر رہے ہیں۔ تو نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ دین وہی ہے اور دین

کے ضمن میں ذمہ داری بھی وہی ہے۔ عام طور پر یہ دوسرا مفہوم زیادہ لیا گیا ہے‘ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نتیجے کے اعتبار سے ان دونوں میں سرِ مو کوئی فرق نہیں۔

ہمارے اور سابقہ اُمتوں کے مابین دین کی قدرِ مشترک؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کی وحدت کیا ہے؟ اس میں ہمارے مفسرین کو بحث کرنی پڑی ہے۔ اس لیے کہ شریعت میں تو فرق ہے‘ شریعت موسوی اور ہے‘ شریعت محمدی اور ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اس اعتبار سے فرق ہے تو پھر دین ایک کیسے ہوا؟ ظاہر ہے اس میں وہی چیز مراد ہو سکتی ہے جو قدرِ مشترک ہو۔ اگر یہ مانا جائے کہ اس سے مراد ہے ''دین وہی مقرر کیا'' تب یہ بحث اٹھتی ہے‘ اگر یہ مانا جائے کہ دین کے ضمن میں وہی ذمہ داری تم پر عائد کی جو سب پر تھی‘ تو یہ بحث نہیں اٹھتی۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ وہی دین مقرر کیا گیا‘ تو اب دین میں جو ظاہری فرق وتفاوت ہے وہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آ جائے گا۔ اس کو ہمارے مفسرین نے resolve کیا ہے کہ دین کی وہ چیزیں جو قدرِ مشترک ہیں‘ وہی یہاں مراد ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا اور ان کا نظامِ صلوٰۃ یکسر مختلف ہے‘ روزے کے احکام میں ان کے اور ہمارے درمیان بڑا فرق ہے۔ ان کے ہاں قربانی پر بہت زور تھا‘ ہمارے ہاں قربانی کا معاملہ کم رہ گیا‘ ان کے ہاں نماز پر اتنا زور نہیں تھا‘ مگر ہمارے ہاں نماز کو عماد الدین یعنی اصل رکنِ دین قرار دیا گیا ہے۔ ان کے ہاں یومِ سبت کا ایک حکم تھا جو اُن پر عائد کیا گیا تھا کہ اس روز کاروبارِ زندگی حرامِ مطلق تھا۔ ہمارے ہاں پورے ہفتے میں کوئی دن بھی ایسا نہیں ہے جس میں کاروبارِ دُنیوی حرامِ مطلق ہو۔ تاہم وہ حکم سمٹ کر آ گیا ہے ایک ساعت کے لیے‘ یعنی اذانِ جمعہ سے لے کر نمازِ جمعہ ادا ہونے تک۔ چنانچہ ہمارے ہاں وہ حکم بہت مختصر رہ گیا۔ تو یہ جو فرق وتفاوت ہے یہ اظہر من الشمس ہے۔ تو پھر قدرِ مشترک کیا ہے؟ ویسے تو ایمان قدرِ مشترک ہے‘ یعنی توحید‘ معاد اور رسالت۔ البتہ رسالت کے معاملے میں فرق ہو جائے گا‘ کہ ان کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ضروری تھا‘ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا لازم نہیں تھا‘ اس لیے کہ محمدٌ رسول

اللہ ﷺ تو ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے لیے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر بھی اور سابقہ رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ بھی ایک ضمنی سا فرق ہوا۔ لیکن اکثر مفسرین کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد توحید ہے اور اس پر تقریباً اجماع ہے۔ اس لیے کہ واقعتاً توحید ہی قدرِ مشترک ہے۔ توحید ہی اصل دین ہے‘ دین نام ہی توحید کا ہے۔

اقامتِ دین کا مفہوم اور مغالطوں کا ازالہ

اب آگے چلیے۔ فرمایا: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ جنہوں نے یہ مانا کہ تمہارے لیے دین وہی مقرر کیا جس کی نصیحت کی تھی نوح کو‘ ابراہیم کو‘ موسیٰ کو‘ عیسیٰ کو (علیہم الصلوٰۃ والسلام) انہوں نے اس سے آگے محذوف مانا کہ اس کے ضمن میں تم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ کہ دین کو قائم رکھو یا قائم کرو‘ اور دین کے ضمن میں آپس میں متفرق مت ہو جاؤ۔ اور جن لوگوں نے یہ مانا ہے کہ آیت کے آغاز ہی سے مطلب یہ ہے کہ دین کے ضمن میں (دربارۂ دین) تمہارے لیے وہی بات طے کی گئی ہے جو سب کے لیے طے تھی‘ تو وہاں اب محذوف نہیں ماننا ہوگا ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ گویا اس کا بیان ہے کہ کیا چیز ہمیشہ سے عائد کی گئی تھی‘ کیا چیز لازم کی گئی تھی‘ سب کو خطاب یہی تھا ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ کہ دین کو قائم کرو یا دین کو قائم رکھو۔ یہ بحث مَیں بعد میں کروں گا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے جو دو متبادل آراء ہمارے ہاں موجود ہیں وہ دونوں میں نے بیان کر دی ہیں‘ اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ نتیجے کے اعتبار سے دونوں میں سرِ مو کوئی فرق نہیں۔

اب آیئے اس پر کہ ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ کے معنی کیا ہیں! اس پر بدقسمتی سے اس زمانے میں ایک علامہ صاحب نے مورچہ لگایا ہے اور اس ضمن میں سب سے بڑی افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے ایک کتابچے پر تائیدی مقدمہ اُن صاحب نے لکھا ہے کہ جو ''اقامت دین'' کی اصطلاح کو جماعت اسلامی کی تحریک میں متعارف کرانے والے تھے۔ ہوتا یہی ہے کہ جب کسی چیز سے کسی سبب سے کوئی بُعد ہو جائے‘ کوئی بغض پیدا ہو جائے تو اب معاملہ حبِّ علی کا نہیں بلکہ بغضِ مُعاویہ کا ہو جاتا ہے۔ اب جو بھی اس

کا مخالف ہوگا وہ اس کو اپنے سے قریب محسوس کرتے ہوئے اس کی تائید وتوثیق کرنی شروع کردے گا۔ اس کی بدترین مثال اِس دَور میں مولانا اصلاحی صاحب نے قائم کی ہے اور میرے نزدیک ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

اس شعر کا اس معاملے میں صد فی صد اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خود انہوں نے پورے قرآن مجید میں ترجمہ وہی کیا ہے جس کو وہ علامہ صاحب غلط قرار دے رہے ہیں۔ اُن علامہ صاحب کی تو ہمیں کوئی پروا نہیں ہے' لیکن مولانا اصلاحی صاحب کا ایک علمی مقام ہے اور بڑا افسوس ہوتا ہے اس پر کہ عمر کے آخری درجے میں آدمی اپنے کیے دھرے پر پانی پھیرنے پر تل جائے۔[1] اصلاحی صاحب یا تو صاف صاف تسلیم کر لیتے کہ اس معاملے میں میرا سابقہ موقف غلط تھا اور آج مجھے اِنشراحِ صدر ہو گیا ہے' لیکن معاملہ یہ بھی نہیں۔ بہرحال چونکہ اسے بہت سے لوگوں تک پہنچایا گیا ہے اور اس ضمن میں کافی اشکالات ذہنوں میں پیدا کیے گئے ہیں' لہٰذا اِس وقت یہ ہماری ایک جماعتی' تنظیمی اور تحریکی ضرورت ہے کہ اس جنگل کو صاف کیا جائے۔ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ کا جو ترجمہ سب نے کیا وہی اصلاحی صاحب نے بھی کیا ''کہ اس دین کو قائم رکھو''۔ یہ لفظ سورۃ المائدۃ میں بھی آیا ہے' وہاں بھی اصلاحی صاحب نے اس کا ترجمہ ''قائم کرو'' کیا ہے' ملاحظہ ہو آیت ۶۸:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾

''کہہ دو: اے اہل کتاب! تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک تم تورات' انجیل اور اُس چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے ربّ کی جانب سے اتاری گئی ہے''۔ (تدبر قرآن)

یعنی اصلاحی صاحب نے ایک جگہ ''قائم رکھنا'' اور ایک جگہ ''قائم کرنا'' ترجمہ کیا ہے

(۱) واضح رہے کہ یہ دروس اُس دَور کے ہیں جب مولانا امین احسن اصلاحی بقید حیات تھے۔

اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی چیز اگر بالفعل قائم نہیں ہے تو قائم کی جائے گی' قائم ہے تو قائم رکھی جائے گی۔ مثال کے طور پر خیمہ گرا ہوا ہے تو اسے کھڑا کیا جائے اور اگر کھڑا ہے تو کھڑا رکھا جائے۔ اگر آندھی آ رہی ہے تو اس کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے کہ خیمہ گر نہ جائے۔ اس کے کھونٹے خوب اچھی طرح مضبوط کر دیے جائیں' اس کی رسیاں خوب کس دی جائیں' کوئی رسی کمزور ہو تو اس کو بدل دیا جائے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جھکڑ بہت زوردار آ رہا ہو تو لوگ خیمے کی طنابیں اور بانس پکڑ کر کھڑے رہیں۔ یہ سارے کام اس لیے ہیں کہ خیمے کو کھڑا رکھنا ہے۔ اور اگر وہ گر جائے تو لامحالہ اب اس کو از سرِ نو کھڑا کرنا ہوگا۔ تو ''اَقِيْمُوْا'' فعل متعدی ہے' اس کا ترجمہ یہی ہوگا کہ کسی دوسری شے کو کھڑا کرنا یا کھڑا رکھنا۔ لیکن آج ہمیں یہ نیا ترجمہ بتایا جا رہا ہے کہ اس کے معنی تو ہیں ''کھڑا رہنا' قائم رہنا''۔ گویا کہ یہ فعل لازم ہے۔ اس کے لیے بہت سے جاہلی اشعار سے استدلال کیا گیا ہے اور اس میں بھی بڑی چالاکی اور بددیانتی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک شعر میں اقامت کے بعد ''عَلٰی'' کا صلہ آیا ہے' اس سے تو معنی یقیناً بدل جائیں گے' کیونکہ verb سے preposition کے مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ to give کے معنی اور ہیں' to give up کے معنی کچھ اور ہیں' to give in کے معنی کچھ اور ہیں۔ preposition بدلنے سے تو معنی میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اب سارے پڑھنے والے اتنی باریک بینی سے تو پڑھیں گے نہیں۔ تو یہ ایک دھوکے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ایک جگہ لفظ استقامة آیا ہے' اس کے معنی ہم بھی مانتے ہیں کہ ''کھڑے رہنا'' کے ہیں۔

یعنی اقامت کس شے کی ہے؟ کوئی معنوی شے ہے' کوئی مادی شے ہے جسے کھڑا کرنا ہے' کوئی ستون گرا ہوا ہے اسے کھڑا کرنا ہے۔ یہ اقامت ہے۔ نماز معنوی شے ہے' اس کو کھڑا کرنا ہے' اس کو قائم کرنا ہے۔ ہمیں ہمیشہ سے یہی بتایا جاتا رہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ نماز کے پورے نظام کو اس کے شرائط و آداب کے ساتھ قائم کرنا ہے۔ جمعہ اور جماعت کا نظام' اس کے لیے اذان کا

معاملۂ یہ ساری چیزیں بھی اقامت صلوٰۃ میں شامل ہیں۔ تو اقامت کے معنی کھڑا کرنا یا کھڑا رکھنا کے ہیں' اگرچہ اس کا شاذ استعمال کھڑا ہونے کے لیے بھی ہو جاتا ہے۔

اچھا اب اس میں ایک اور بات پر غور کیجیے! اگر ہم یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ''قائم رہو دین پر'' تو سوال پیدا ہوگا دین کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس کا مطلب جزوی دین پر قائم رہنا ہوگا یا کلی دین پر قائم رہنا؟ اگر کلی دین پر قائم رہنا ہے تو پھر بھی اقامت دین فرض ہوگی' کیونکہ صرف عبادات اور اعتقادات ہی پر تو قائم نہیں رہنا ہے۔ کیا شریعت دین کا جزو ہے یا نہیں؟ کیا حلال اور حرام کے احکام دین کا جزو ہیں یا نہیں؟ کیا حدود و تعزیرات دین کا جزو ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ دین میں شامل ہے تو ''قائم رہو دین پر'' ٹھیک ہے۔ اس پورے دین پر قائم رہنا ہے تو اس کے ایک تقاضے اور منطقی نتیجہ کے طور پر دین کو ایک کامل نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنا از خود شامل ہو جائے گا۔ تو وہ ترجمہ کریں تب بھی نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے' بشرطیکہ آپ کا دین کا تصور محدود نہ ہو۔ اگر آپ کا تصورِ دین صرف عقائد اور عبادات تک محدود ہے تو اور بات ہو جائے گی۔ پھر تو آپ نے اپنے عقائد درست کر لیے' عبادات پر کاربند ہو گئے تو گویا کہ آپ دین پر قائم ہو گئے۔ لیکن اگر آپ کا تصورِ دین یہ ہے کہ دین تو اس سے وسیع تر شے ہے' دین پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے تو پھر اگر کوئی شخص ﴿اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ﴾ کا یہ ترجمہ کرنے پر تل ہی جائے تب بھی قرآن مجید اپنے مفاہیم کی حفاظت کر سکتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِہٖ ؕ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۲)

''باطل اس پر حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے''۔

کچھ کم علم لوگ' یا جن کی نیتوں میں خلل ہو جائے' کچھ لوگوں کو کچھ عرصہ کے لیے مغالطے اور اشتباہ میں ڈال دیں تو یہ بات اور ہے' ورنہ قرآن تو اپنی اتنی حفاظت کرتا ہے کہ چلو کر لو دین پر قائم رہنے کا ترجمہ' تب بھی نتیجہ وہیں پہنچے گا۔ تمہارے لیے اس سے مفر نہیں' کہ اس کا بھی ایک لازمی تقاضا دین کو قائم کرنا ہے۔

توحید کی اقسام اور ان کا مفہوم

یہاں اب ایک اور لطیف نکتہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ تک دین کس طرح ایک رہا ہے۔ دراصل یہ توحید ہے جو قدرِ مشترک رہی ہے' یہی دین کا اصل الاصول ہے۔ میں اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل و احسان سمجھتا ہوں کہ توحید کو میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ توحید کے دو حصے ہیں:

i) توحید نظری یا توحید فی العقیدہ۔ یعنی اللہ کو ایک ماننا۔

ii) توحید عملی — ایک اللہ کا بندہ بن جانا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾ (الکھف) ''اور وہ بندگی میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے''۔ یعنی بندہ عبادات کے اندر یکسو ہو جائے' اس کی اطاعت منقسم نہ ہو کہ ایک معاملے میں تو اللہ کی اطاعت کر رہا ہو اور دوسرے معاملے میں اس کی اطاعت نہ کرے۔ دوسری تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہو جائیں۔ والدین کی اطاعت' اساتذہ کی اطاعت' حکام کی اطاعت' امیر اور مرشد کی اطاعت' ان میں سے اگر کوئی بھی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد (independent) ہو تو وہ شرک ہے۔ اگر اپنے نفس کی اطاعت اس درجے کی ہو تو اسے بھی قرآن نے شرک قرار دیا ہے: ﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ؕ﴾ (الفرقان:۴۳) ''(اے نبی!) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟''

توحید عملی کے بھی دو حصے ہیں: (۱) انفرادی (۲) اجتماعی۔

انفرادی توحید پر بحث سورۃ الزمر میں آتی ہے' جبکہ اجتماعی توحید کا مطلب اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ اس اجتماعی توحید ہی کے لیے تکبیر ربّ' اقامت دین' اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ اور یکون الدین کلہٗ للہ کی قرآنی اصطلاحات آئی ہیں۔ اس اجتماعی توحید ہی کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ' حکومت الٰہیہ کا قیام اور زمین پر آسمانی بادشاہت کا قیام جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی پورا نظامِ زندگی ایک اللہ کے اختیارِ کلی کے تحت آ جائے۔ تو وہی بات ہوگئی کہ ''عباراتنا شتّٰی وحسنک واحدٌ''۔

جنت کے بہت سے دروازے ہیں' جس دروازے سے بھی داخلہ ہو جائے سعادت ہی سعادت ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ شہرِ معانی ہے' اس کے دروازے بہت سے ہیں' آپ کسی دروازے سے داخل ہو جائیں' کسی اصطلاح کے حوالے سے بات سمجھ لیں۔ ایک اصطلاح آپ کے ذہن کی ساخت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تو دوسری اصطلاح حاضر ہے' شاید آپ کے ذہن کے سانچے میں یہ زیادہ فٹ بیٹھ جائے۔ مطلب تو پیڑ گننے سے نہیں' آم کھانے سے ہے۔ اگر مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہو رہا تو خواہ مخواہ کا قیل وقال کس لیے!

''تفرق فی الدین'' کی ممانعت

آگے فرمایا: ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ ''اور اس (دین) میں متفرق نہ جاؤ''۔ فَرَّقَ يُفَرِّقُ (باب تفعیل) کا مفہوم ہے: کسی چیز کو پھاڑ دینا' کاٹ دینا' ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' جبکہ تَفَرَّقَ۔ يَتَفَرَّقُ کا مطلب ہے: خود متفرق ہو جانا' خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' خود بٹ جانا' گروہوں میں منقسم ہو جانا۔

﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ میں فِيْهِ (اس میں) کا معنی ہے ''دین میں''۔ یعنی دین میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ اس کی وضاحت کے لیے ''القرآن یفسّر بعضُہ بعضًا'' کا اصول استعمال کرتے ہوئے سورۃ الممتحنہ کی آیات ۸ اور ۹ کا مطالعہ کرتے ہیں' جہاں ''فِی الدّین'' کا لفظ آیا ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹﴾

''اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور

تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی تو ظالم ہیں''۔

سورۃ الممتحنہ کی متذکرہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''دین کے معاملہ میں'' یا ''دین کے بارے میں'' یا ''دین کے ضمن میں'' کا مفہوم کیا ہے۔ چنانچہ ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ کا مطلب کیا ہوگا؟ ''فِيْهِ'' کی ضمیر مجرور ''ہ'' کا مرجع ''دین'' ہے۔ یعنی ''فِيْهِ'' سے مراد ''فِي الدِّيْنِ'' ہے۔ چنانچہ ﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ کا مفہوم ہوگا ''دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ!''

تفرقہ اور اختلاف میں فرق

اب یہ بہت ہی اہم نکتہ ہے اور اس میں آپ کو بہت گہری ہدایت اور رہنمائی ملے گی کہ تفرقہ اور اختلاف دو بالکل الگ چیزیں ہیں اور ان میں باہم خلط مبحث نہیں ہونا چاہیے۔ اوّل تو ان دونوں الفاظ میں فرق ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۰ میں اختلاف کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''تمہارے مابین جس معاملے میں بھی اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے''۔ اختلاف ایک لفظ ہے اور تفرقہ ایک دوسرا لفظ۔ اختلاف ہماری زبانوں میں ہے' ہمارے مزاجوں میں ہے' ہماری رنگتوں میں ہے' ہمارے افتادِ طبع میں ہے۔ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''۔ اور بقول شاعر ع

''اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!''

اختلاف تو اس فطرت کی تخلیق کے اندر جزو لاینفک کی حیثیت سے مضمر ہے۔ اصل میں قرآن جہاں مذمت کرتا ہے وہ تفرقے کی کرتا ہے۔ ایک دوسرے سے کٹ جانا' جدا ہو جانا' من دیگرم تو دیگری۔ یہ نہیں ہونا چاہیے' بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ اختلاف کو برداشت

کرو‘ اپنے سینے کشادہ رکھو‘ اپنے دلوں کو کشادہ رکھو۔ جہاں تک اختلاف جائز حدوں میں ہو اس کے لیے گنجائش خود پیدا کرو۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی گنجائش حضور ﷺ نے خود پیدا فرمائی ہے۔ آپؐ نے نماز میں کبھی ہاتھ سینے پر باندھے اور کبھی ناف پر۔ کبھی ہاتھ کھول کر بھی لازماً نماز پڑھی ہوگی‘ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ امامِ دارالہجرت امام مالکؒ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے! یقیناً یہ چیزیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ کس کس چیز میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ البتہ تفرقہ نہ ہو جائے کہ ”من دیگرم تو دیگری!“

مختلف فقہی مسالک کے مابین فقہی اختلافات موجود ہیں۔ ہر فرقہ کے استنباط کے کچھ اصول ہیں‘ جن کے اعتبار سے ایک فرق کیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف قطعاً نہیں ہے کہ شارع حقیقی اللہ اور اس کے رسول ہیں۔ لیکن اصولِ استنباط میں اختلاف ہو گیا۔ اب ان اصولوں کا انطباق کیا گیا تو مختلف فقہی مسالک وجود میں آ گئے۔ اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلک حنفی‘ مسلک شافعی‘ مسلک حنبلی اور مسلک مالکی کے اعتبار سے آپ علیحدہ علیحدہ رہیں۔ یہ کفر اور شرک نہیں ہے‘ جبکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ اصل میں شارع حقیقی اللہ ہے اور اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ اگر کسی نے یہ سمجھا کہ شارع کی حیثیت ابوحنیفہ‘ شافعی‘ مالک یا احمد بن حنبل (رحمہم اللہ) کو حاصل ہے تو وہ مشرک ہو جائے گا۔ لیکن جب استنباط‘ استدلال اور استنتاج کے مختلف اصولوں اور اسلوبوں کے فرق سے مسلک کا اختلاف ہو جائے تو اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ یہ تفرقہ نہیں کہلائے گا۔ البتہ جہاں یہ اختلاف توحید تک پہنچ جائے اور اللہ کے سوا کسی اور کو مستقل شارع مان لیا جائے تو یہ تفرقہ ہوگا‘ اسی طرح اللہ کی بجائے جمہور حاکم ہوں تو یہ تفرقہ ہو گیا۔ اللہ کی بجائے کوئی فرد حاکم ہے تو یہ تفرقہ ہو گیا۔ جب تک وہ بات قائم ہے‘ وہ توحید اصلی کہ حاکم مطلق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے تو اس سے نیچے نیچے اختلاف تفرقہ فی الدین نہیں شمار ہوگا۔ یعنی توحید جو قدرِ مشترک ہے‘ جو دین کی اساس ہے‘ جو دین کی جڑ ہے اس میں تفرقہ نہ ہو۔

﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ ”فِيْهِ“ میں ”ہ“ کی ضمیر مجرور دین سے متعلق بھی ہے کہ

اس دین کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ اور اس کا تعلق اقامت دین سے بھی ہے کہ دین کے قائم کرنے میں متفرق نہ ہو جاؤ! میں ابتدا سے جو دو ترجمے لے کر چل رہا ہوں ان کے اعتبار سے یہ دوسرا مفہوم ہوگا۔ پہلا مفہوم یہ ہوگا کہ دین تمہارے لیے ایک ہی مقرر کیا گیا‘ اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دین کے ضمن میں تم سب پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ اسے قائم کرو‘ اس فرض کی ادائیگی میں متفرق نہ ہو! حنفی‘ مالکی‘ حنبلی‘ شافعی اور اہل حدیث کا اختلاف اپنی جگہ رہے‘ لیکن اقامت دین میں آ کر سب جڑ جائیں۔ توحید عملی کے قیام میں تفرقہ نہ ہو۔ یہاں اگر کٹ گئے تو یہ ہے اصل کاٹ‘ یہ ہے اصل تفرقہ۔ تو ان دونوں اعتبارات سے میں بات کو مکمل کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہوں۔

یہی لفظ (تفریق) دین کو پھاڑنے کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ﴾ (الانعام:۱۵۹) ”جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں“۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اگر وہاں سے تفرقہ ہو گیا کہ حاکمیت خداوندی کے تصور کو اگر کہیں کوئی زک پہنچ گئی یا وہ مجروح ہو گیا تو یہ تفرقہ اور تفریق دین ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف جو یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ”جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو“ یہ تفریقِ فی الدین ہے۔ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ کا وہ مطلب نہیں سمجھتا لیکن جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ تو دین میں تفریق ہو گئی۔ آپ نے دین کو پھاڑ دیا کہ دین کا ایک حصہ اللہ کے لیے اور ایک حصہ قیصر کے لیے۔ یہ بلا شبہ دین کی تفریق ہے۔ سیکولرزم بھی دین کی تفریق ہے کہ جو احوالِ شخصیہ ہیں ان میں ہم دین پر چلیں گے‘ مگر جو احوالِ اجتماعیہ ہیں ان میں لوگوں کی جو مرضی ہوگی اس کے مطابق قانون سازی ہوگی۔ وہاں گویا کہ حاکمیت انسانی تسلیم کی جاتی ہے۔ البتہ مسلکوں کا جو اختلاف ہے اُس کے اوپر اس کا اطلاق درست نہیں ہے۔ اس میں دین پھٹتا نہیں ہے‘ دین برقرار رہتا ہے‘ سب اللہ ہی کو حاکم مانتے ہیں‘ سب اسی کو شارع

اصلی مانتے ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ یہ چیزیں اس وقت بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہو گئی ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کا تاریخی پس منظر

ارشاد ہوا:

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ إِلَيْهِ ۚ﴾

''(اے نبیؐ!) مشرکین پر یہ بات بہت ہی بھاری ہے جس کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں''۔

آیت کے اس ٹکڑے پر گفتگو سے پہلے آیات زیر مطالعہ کے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ مکی دور کی سورت ہے، لیکن مختلف احوال اور داخلی و خارجی شواہد سے اس سورۂ مبارکہ کا زمانۂ نزول سن ۸ نبوی کے آس پاس بنتا ہے۔

نزولِ قرآن کے ابتدائی چند سال تک تو حضورﷺ کے مخاطب صرف مکہ کے لوگ یا مشرکینِ عرب ہی رہے تھے، لیکن سن ۵، ۶ نبوی کے آس پاس یہ دعوت اب پھیل چکی تھی، اس کا چرچا ہو چکا تھا اور یہود کے ساتھ بھی اب بالواسطہ (indirect) معاملہ چل رہا تھا۔ قرآن میں ابھی خطاب یہودیوں سے ہوا تھا نہ عیسائیوں سے، لیکن اُن کو مسلسل خبریں مل رہی تھیں۔ یہودی منتظر بیٹھے تھے کہ آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے، لیکن وہ اس مغالطے میں تھے کہ وہ ہم میں سے ہو گا، حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر آج تک نبوت تو ہمارے خاندان بنی اسرائیل میں چلی آ رہی ہے، تو یہ کیسے باہر چلی جائے گی! لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو باہر جا رہی ہے تو ان میں اب غصہ بھی پیدا ہوا اور انہوں نے وہاں سے بیٹھ کر تار ہلانے شروع کیے۔ چنانچہ کبھی سوال بھجوا رہے ہیں کہ ذرا ان سے پوچھو رُوح کسے کہتے ہیں؟ اگر یہ نبی ہیں تو رُوح کی حقیقت بتائیں! ذرا ان سے پوچھو کہ اصحابِ کہف کون تھے؟ ان سے پوچھو ذوالقرنین کون تھا؟ اگر یہ نبی ہیں تو بتائیں! تو اب یہ وہاں سے بیٹھے مشرکینِ مکہ کے تار ہلا رہے تھے۔ اسی طرح ایک بالواسطہ معاملہ ان کے ساتھ شروع ہو چکا تھا، اگرچہ ابھی ان سے براہِ راست خطاب نہیں تھا۔

نبی اکرمﷺ کو مکہ مکرمہ میں دعوت دیتے ہوئے سات آٹھ سال گزر چکے تھے، لیکن ابھی اس دعوت کا بظاہر کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ان حالات میں بر بنائے طبع بشری حضورﷺ کی طبیعت میں ایک فکر اور تشویش ابھر رہی تھی کہ کہیں اس میں میری کوئی کوتاہی تو نہیں ہے، میری طرف سے کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے، میرے بیان میں کوئی ابہام تو نہیں ہے، میری ذات کے اندر تو کوئی ایسی خرابی نہیں ہے جو اس حقیقت کے انکشاف میں آڑے آ گئی ہو؟ یہ احساسات ہر شریف اور بامروّت انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف پیرایوں میں حضورﷺ کو تسلی دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپؐ نہ گھبرائیں، انہیں راہ راست پر لانے کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے، آپؐ پر صرف ابلاغ اور تبلیغ کی ذمہ داری ہے، ہم نے آپؐ کو داروغہ بنا کر نہیں بھیجا، انہیں زبردستی اسلام پر لے آنا آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور سیاقِ کلام پر غور کرتے ہوئے دیکھئے کہ یہاں اب کیا بات کہی جا رہی ہے۔ یہاں بھی وہی تسلی کا انداز ہے کہ اے محمدﷺ! آپ پریشان نہ ہوں، آپ تشویش میں مبتلا نہ ہوں، آپ رنج وصدمے سے دوچار نہ ہوں، یہ معاملہ درحقیقت اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ آپؐ اپنی شرافت کی بناء پر سمجھ رہے ہیں کہ سچی بات ہے، اسے قبول کیا جانا چاہیے۔ ہر سچا آدمی اسی انداز سے سوچے گا، اسے کیا پتا کہ لوگوں کے دلوں میں کیسے کیسے فساد پڑے ہوئے ہیں، کسی کو اپنی چودھراہٹ کی فکر ہے، کسی کو اپنی سیادت کی فکر ہے، کسی کو اپنی گدی کی فکر ہے، کوئی مذہبی اور روحانی اعتبار سے لوگوں کا مقتدا اور پیشوا بنا بیٹھا ہے، اسے اس سے تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ اب آپؐ کو کیا پتا کہ کیا کیا چیزیں لوگوں کے پاؤں میں بیڑیاں بن کر پڑی ہوئی ہیں۔ ہر شریف آدمی اپنے بارے میں جو کچھ سوچتا ہے اسی پر دوسروں کو قیاس کرتا ہے، لیکن دراصل بات کچھ اور ہے!

یہ بھی جان لیجیے کہ اُس وقت دو گروہ تھے جو اب سامنے آ گئے تھے، ایک تو مشرکین عرب، جن کو دعوت دیتے ہوئے سات آٹھ برس ہو چکے تھے، جبکہ دوسرا گروہ اہلِ

کتاب کا تھا جن سے بالواسطہ معاملہ شروع ہو چکا تھا۔حضورﷺ کے دل میں یہ بات آئی ہوگی کہ اہلِ کتاب کو تو فوراً لپک کر میری تصدیق کرنی چاہیے۔مشرکین مکہ کے ہاں تو کوئی شریعت موجود نہیں تھی' حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اُن کے ہاں کوئی نبی نہیں آیا تھا' دو ہزار برس بیت چکے تھے اور اس عرصے میں ان کے اندر بہت سی گمراہیاں پیدا ہو چکی تھیں' حالانکہ نبی اکرمﷺ کی دعوت ان کے لیے بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔الفاظِ قرآنی ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ کے مصداق آپﷺ ان کے سامنے ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام ہی کا طریقہ پیش کر رہے تھے' لیکن وقت کے دریا میں اتنا پانی بہہ چکا تھا کہ ان کو اگر اس میں استبعاد محسوس ہو رہا تھا تو یہ بات ناقابل فہم نہ تھی' لیکن اہلِ کتاب کے بارے میں آنحضورﷺ یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے! یہ تو انبیاء کے ماننے والے ہیں' موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کے ماننے والے ہیں' قیامت کے ماننے والے ہیں' توحید کے دعوے دار ہیں (چاہے وہ شرک میں مبتلا تھے لیکن دعوے دار تو توحید ہی کے تھے) ان کے لیے تو آسمانی ہدایت کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں' ان کے پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں' ویسی ہی ایک کتاب مجھ پر نازل ہو رہی ہے' میں نے ان کی کتابوں کی نفی نہیں کی ہے' قرآن ان کی تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے' پھر یہ قرآن پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ان دونوں چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آیت کے اگلے الفاظ کا مطالعہ کیجیے۔دیکھئے کس قدر تسلی آمیز انداز ہے: ﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ ''(اے نبیؐ!) مشرکین پر تو بہت ہی بھاری ہے وہ چیز جس کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں''۔خود حضورﷺ کا بھی احساس یہی تھا کہ ان مشرکین کا معاملہ تو ''ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا'' والا ہو چکا' یہ تو گمراہی میں بہت دور چلے گئے' تین سو ساٹھ خداؤں کو ماننے والے' ان کے لیے تو واقعتاً یہ بات قبول کرنا بہت مشکل ہے۔آپﷺ کو اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ان میں کتنے ہوں گے جو اس بھاری پتھر کو چوم کر پیچھے ہٹ جاتے ہوں گے' جی چاہتا ہوگا کہ ایمان لے آئیں' لیکن پاؤں کی بیڑیاں آگے نہیں بڑھنے

دیتی ہوں گی۔ولید بن مغیرہ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بالکل قریب آ جاتا تھا جیسے کہ اب مانا کہ مانا' پھر واپس ہو جاتا تھا' پاؤں میں جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں وہ پھر کھینچ لیتی تھیں۔تو ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے کہ جو آتے تھے' پھر رہ جاتے تھے' اس لیے کہ یہ ان کے لیے بہت بھاری پتھر تھا۔ان کی سیادتیں' قیادتیں' چودھراہٹیں اور ان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ سب کی سب ان کے پاؤں میں بیڑیاں بن کر پڑی ہوئی تھیں۔پھر ان کی آباء پرستی اور روایت پرستی آڑے آتی تھیں کہ اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر کیسے چلے جائیں! تو فرمایا کہ اے نبیؐ! یہ آسان کام نہیں ہے۔یہ ان پر بہت بھاری ہے۔

راہِ ہدایت پر آنے کے دو طریقے

اس سلسلے میں آگے جو دو باتیں آ رہی ہیں یہ حکمتِ قرآنی کا بہت اہم موضوع ہے۔فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾﴾

''اللہ تعالیٰ کھینچ لیتا ہے اپنی طرف جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو اُدھر رجوع کرتا ہے''۔

یہ حق کی طرف آنے کے دو مختلف راستے ہیں۔صوفیاء نے اس کے لیے مستقل اصطلاحات وضع کی ہیں: ''سالک مجذوب'' اور ''مجذوب سالک''۔ایک وہ ہوتا ہے جسے اللہ پہلے کھینچ لیتا ہے اور پھر اس کی تربیت فرماتا ہے' اس کو راستے طے کراتا ہے۔اور ایک وہ ہوتا ہے جو بے چارہ خود چل کر آتا ہے' قدم بقدم خود سفر طے کر کے آ رہا ہوتا ہے' وہ از خود دستک دے رہا ہوتا ہے کہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے کہ خوش آمدید! تم چل کر آئے ہو' تم نے محنت کی ہے' تم نے اس کے لیے قربانیاں دی ہیں! ان اصطلاحات کا انطباق کریں تو ''سالک مجذوب'' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں اور ''مجذوب سالک'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں' جو نکلے تو تھے قتل کرنے کے ارادے سے' اللہ نے کیا شکل پیدا کی کہ راستے ہی میں کھینچ لیا۔یہ ہیں دو راستے! تو اے محمدؐ! آپ مطمئن رہیے! ان میں سے جسے ہم چاہیں گے کسی وقت کھینچ لیں گے۔اور ان میں سے کوئی رفتہ رفتہ قدم

بڑھاتے ہوئے آئے گا۔ ان کے اندر جو بھی کسی درجے میں بھی حق کا جویا اور متلاشی ہے اور ابھی وہ اپنی ہمت کو مجتمع نہیں کر پا رہا، ہم اس کو ہمت عطا فرما دیں گے۔ جس پر حق تو منکشف ہو گیا، آگے بڑھنا چاہتا ہے، لیکن ﴿مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کے مصداق اب برادریاں ہیں، رشتہ داریاں ہیں، تعلقات ہیں، دوستیاں ہیں، ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، پچیس پچیس برس، تیس تیس برس بیت گئے ہیں، اب ایک دم ان میں سے آدمی کیسے نکل آئے، جیسے کہ دودھ میں سے مکھی نکل آتی ہے، یہ بڑی مشکل بات ہے، بہت کٹھن مرحلہ ہے ان تمام بیڑیوں کو کاٹ کر نکل آنا۔ تو اس کے لیے اطمینان کے ساتھ منتظر رہیے۔ جس کو ہم چاہیں گے، جب چاہیں گے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیں گے اور پھر اُسے راستہ طے کرا دیں گے۔ اور جو کوئی ان میں سے ایسا ہے کہ جس پر حق منکشف ہو رہا ہے، طبیعت مائل ہو رہی ہے، اس کی بیڑیوں کو رفتہ رفتہ کاٹ دیں گے۔

اہل کتاب کی مخالفانہ روش کا اصل سبب

دوسرا گروہ اہل کتاب کا تھا، جس میں نصاریٰ بھی تھے اور یہودی بھی۔ یہ ایک ہی کتاب کے ماننے والے تھے، کم از کم Old Testament تو دونوں میں مشترک تھی، اختلاف تو صرف New Testament پر ہو سکتا ہے جو چھوٹی سی ہے۔ پھر یہ دونوں موسیٰ علیہ السلام اور شریعت موسوی کے ماننے والے تھے۔ عیسائیوں میں اگرچہ حضرت مسیحؑ کے بعد سینٹ پال نے شریعت ساقط کر دی تھی، لیکن اُس وقت جب قرآن نازل ہوا ابھی وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اس کو ساقط نہیں مانا تھا۔ اس کے بعد تو پھر سارے فرقے ختم ہوتے چلے گئے اور عیسائیت میں صرف پال کے ماننے والے ہی رہ گئے۔ اب جتنے عیسائی ہیں وہ اصل میں ''پالسٹ'' ہیں، کرسچین نہیں ہیں۔ وہ اگر اپنے لیے کرسچین کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو غلط کرتے ہیں۔ اب اہل کتاب کے ان دونوں گروہوں کے بارے میں اس حوالے سے تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ آپ ﷺ کی بات کیا مانیں گے، ان کا تو آپس میں سر پھٹول ہے، اپنی سیادت و قیادت کا جھگڑا ان کو مل کر بیٹھنے نہیں دے رہا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میں یہ ساری تفسیر تأویل خاص کے اعتبار سے کر رہا ہوں، یعنی جس ماحول میں یہ آیات نازل ہوئیں اس کے اعتبار سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ اگرچہ ہم ان سے استنباط کریں گے، انہیں generalize بھی کریں گے کہ

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

بات وہی رہتی ہے، لیبلز بدلتے ہیں، آج آپ کو اپنے ہاں یہ سب مثالیں مل جائیں گی۔ آپ کے جو عوام کالانعام ہیں، ان کی اکثریت بدترین شرک کے اندر مبتلا ہے۔ ان کے لیے تو بڑا بھاری ہے اپنے عرس چھوڑ دینا، اور قبروں پر جا کر جو کچھ کر رہے ہیں اس کو چھوڑ دینا۔ یہ کوئی آسان کام ہے؟ یہ ان کا مکمل دین بنا ہوا ہے۔ پھر جو اس طرح کی خرافات میں مبتلا نہیں ہیں وہ آپس کے سر پھٹول کا شکار ہیں۔ تو آپ الفاظِ قرآنی کو ہر دَور کے انسانوں پر منطبق کر سکتے ہیں، اس لیے کہ وہی ساری کیفیات رہیں گی، اس دنیا کی سٹیج پر ہر وقت وہی ایکٹرز رہیں گے، منافق بھی رہیں گے اور مؤمن صادق بھی رہیں گے۔ ہرچہ بادا باد والے بھی ہوں گے اور وہ بھی رہیں گے کہ جن کی گاڑی قدم قدم پر knocking کرتی ہے، جو مذبذب رہتے ہیں کہ چلیں کہ نہ چلیں؟ روشنی ہوئی تو کچھ چل لیے، تاریکی ہوگئی تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اس لیے کہ اندر کا نور تو ہے ہی نہیں۔ اب یہ جو کیفیات اس وقت تھیں اب بھی ہیں۔ اسی طریقے سے جو مشرکین کی دُوری تھی وہ اب بھی ہے۔

باقی رہ گئے یہ اہل کتاب تو ان کے بارے میں جان لیجیے کہ ﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ''انہوں نے جو تفرقہ کیا وہ اس کے بعد کیا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا، اور اس بناء پر کیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰي شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰي شَيْءٍ ۙ وَّھُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ﴾ (آیت ۱۱۳) ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں (ان کا کوئی مقام نہیں

ہے‘ کوئی حیثیت نہیں ہے) اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے‘ جبکہ دونوں ایک ہی کتاب کے پڑھنے والے ہیں!‘‘ ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں اور پھر حال یہ ہے! البتہ مسلمانوں کے مقابلے میں آ کر وہ جمع ہو جاتے تھے‘ آپس میں جو سرپھٹول تھا وہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ ﴿تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى ؕ﴾ (الحشر:۱۴) ’’تم سمجھتے ہو (اے مسلمانو!) کہ یہ جمع ہیں‘ حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں‘‘۔ یہ جمع کہاں ہیں! یہ تو صرف ’’بغض معاویہ‘‘ میں جمع ہوئے ہیں‘ ان کے مابین کوئی ’’حبِّ علی‘‘ نہیں ہے جو ان کو جمع کر رہی ہے۔ ﴿وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ﴾ ان میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ ان کے پاس علم کے آنے کے بعد ہوا۔ اب دیکھئے اس میں ایک لطیف بات سامنے آ گئی۔ ان مشرکین کے پاس تو علم آیا نہیں‘ اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد سے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی نبوت نہیں‘ کوئی کتاب نہیں‘ کوئی شریعت نہیں۔ اور یہ جو اہل کتاب ہیں یہ تو علم کے ٹھیکے دار ہیں‘ ان میں ایک سے ایک بڑا علامہ بیٹھا ہوا ہے‘ ان کے ہاں ایک سے ایک بڑا کتاب کا جاننے والا‘ ایک سے ایک بڑا قاری اور ایک سے ایک بڑا مفتی موجود ہے۔ پھر یہ تفرقہ کیوں ہے؟ تو معلوم ہوا کہ تفرقے کا سبب کچھ اور ہوتا ہے‘ لاعلمی نہیں ہوتی۔ یہ من جو پاپی ہوتا ہے‘ یہ کسی اور سبب سے ہوتا ہے۔ حق کو جاننے کے باوجود انسان اسے ٹھکراتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ ہے ﴿بَغۡيًۢا بَيۡنَهُمۡ﴾ یعنی آپس کی ضدم ضدا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ ان کے تفرقہ کی وجہ آپس کی ضدم ضدا ہے کہ یہ کیوں آگے بڑھ جائے‘ میں کیوں پیچھے رہ جاؤں؟ اس میں کیا سرخاب کا پر ہے؟ ہماری سیادت و قیادت مسلّمہ ہے‘ لوگ آ کر ہمارے ہاتھ چومتے ہیں اور ہماری جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ یہ کہاں سے آ گیا دین کا نام لینے والا اور دین کا علم بردار؟ یہ ہے اصل مسئلہ!

﴿وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر تیرے ربّ کی طرف سے ایک وقتِ معین کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کا قضیہ چکا دیا جاتا‘‘۔ یعنی ان یہود اور نصاریٰ کے مابین فیصلہ کر دیا جاتا‘ لیکن فیصلہ کرنے کا ابھی یہ

وقت نہیں ہے‘ ہم نے تو مہلتِ عمل دی ہوئی ہے‘ امتحان کا دور ہے‘ اس دنیا میں ہر شخص جو کماتا ہے کما لے‘ جسے خیر بنانا ہے خیر بنائے‘ جسے شر کی گٹھڑیاں باندھ کر اپنے سر پر اٹھانی ہیں وہ انہیں تیار کر لے۔ ﴿لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ ؕ﴾ (الانفال:۴۲) ’’تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے‘‘۔ لہٰذا یہ ہے وہ بات جس کی وجہ سے ہم نے انہیں چھوٹ دی ہوئی ہے‘ ورنہ ان کا قصہ ہم ابھی چکا دیتے۔

وارثین کتاب کا نقشہ

﴿وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور وہ لوگ کہ جو ان کے بعد کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کتاب کے بارے میں بڑے اضطراب انگیز شک میں مبتلا ہیں‘‘۔ وہ ایسے شک میں پڑے ہیں کہ جو ان کے دلوں میں خلجان اور الجھن پیدا کر رہا ہے۔ یہ ایک بہت اہم مضمون ہے۔ دیکھئے‘ آپ کے علم میں ہو گا کہ شاہ اسماعیل شہید اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے مابین ایک خالص علمی بحث کا آغاز ہو گیا تھا اور اس میں ابتذال کسی طرف سے نہیں تھا‘ دونوں علم‘ منطق اور فلسفے کی تلواروں سے لڑ رہے تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ دو نسلوں کے بعد کیا نکلا؟ یہ کہ آج آپ کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ایک کثیر تعداد دین ہی سے برگشتہ ہو گئی ہے کہ یہ ان مولویوں کا حال ہے‘ یہ ان چیزوں پر لڑتے ہیں! ان کا قرآن ایک‘ ان کا رسول ایک‘ ان کا کعبہ ایک‘ اور پھر ان کے مابین سر پھٹول ہے‘ کفر کے فتوے ہیں! پھر یہ ہے ان کا حال جو ہو رہا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ نئی نسل کے اندر دین ہی سے بے اعتباری کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ ہے وہ بات جو یہاں کہی گئی ہے۔ علماء جب اس کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں اور جب وہ جغادری لوگ جو دین کے ٹھیکے دار اور دین کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں‘ ان کا حال یہ نظر آتا ہے تو اگلی نسل کے لوگ جو وارث ہوتے ہیں وہ کتاب ہی کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ قرآن تو کہتا ہے کہ یہ جمع کرنے والی شے ہے‘ مگر ہمارے یہ علماء قرآن پڑھتے

ہیں اور پھٹے ہوئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے‘ یہ نمازیں پڑھنے پڑھانے کے بہت پابند ہیں مگر کردار ان کا یہ ہے! یہی چیز ہے جو لوگوں کو دین سے برگشتہ کر دیتی ہے اور لوگ خود کتاب اللہ ہی کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اے نبیؐ! جو آپؐ کے سامنے اہل کتاب ہیں‘ یہ بس نام کے اہل کتاب ہیں‘ ان سے آپؐ کوئی اچھی توقع نہ رکھئے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:
﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۲۰)
’’آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے نہ یہود نہ نصاریٰ جب تک کہ آپؐ ان کے طریقے کی پیروی نہ کریں‘‘۔ سارا جھگڑا تو یہ ہے۔ یہ کبھی نہیں مانیں گے‘ کبھی آپ سے راضی نہیں ہوں گے۔ یعنی آپؐ کو ان کی مخالفت کے علی الرغم آگے بڑھنا ہے۔ اس کے لیے آپ ذہناً تیار رہیے۔ اگر آپؐ ان سے کوئی امید وابستہ کر لیں گے تو ناامیدی ہوگی‘ صدمہ ہوگا۔ اور اگر آپؐ امید پہلے ہی منقطع کر دیں تو صدمہ نہیں ہوگا۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی!

جب توقع ہی نہیں تو پھر صدمہ نہیں ہوگا‘ اعصاب پر تناؤ نہیں آئے گا۔ تو دراصل حضورﷺ کو دونوں گروہوں کے بارے میں بتا دیا گیا۔ اس کی تأویل عام کے لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا‘ اس کا انطباق اور اطلاق آپ خود کر سکتے ہیں۔ یہ سارے کیریکٹر ہر دَور میں موجود رہے ہیں اور ہمارا دَور کوئی استثنائی دَور نہیں ہے۔

آنحضورﷺ سے خصوصی خطاب

اب چلیے‘ اس حال میں کرنا کیا ہے! فرمایا: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ﴾ ’’پس آپ اسی (دین) کی دعوت دیتے رہیں!‘‘ اب دیکھئے‘ یہاں خطاب جمع کے صیغے سے نہیں ہے‘ واحد کے صیغے سے ہے۔ اس سے پہلے ایک فعل امر (اَقِيْمُوا الدِّيْنَ) اور ایک فعل نہی (وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ) جمع کے صیغے میں آ چکے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کام ایک آدمی کے کرنے

کا نہیں ہے‘ اس کے لیے مددگار درکار ہیں۔ اب آپ دیکھئے‘ یہ بھی ایک لطیف نکتہ ہے کہ صیغہ کیوں بدل گیا؟ وہاں جمع کیوں ہے اور یہاں واحد کیوں آ گیا؟ آپ یوں سمجھئے کہ یہ جواَب احکام آ رہے ہیں‘ یہ اصلاً حضورﷺ کے لیے ہیں‘ اور تبعاً ہر اُس شخص کے لیے جو بھی تا قیامِ قیامت اُمت محمدؐ میں سے اسی کام کو لے کر داعی کی حیثیت سے اٹھے گا۔ اس داعی کو اس ساری صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس کا سامنا جن لوگوں سے ہوگا ان میں اس اُمت کے مشرکین بھی ہوں گے اور اس اُمت کے یہود و نصاریٰ بھی ہوں گے۔ اور یہ یہود و مشرکین اس کی دشمنی میں اسی طرح شدید ترین ہوں گے جیسے قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾ (النساء:۸۲) ’’تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے‘‘۔ چنانچہ تمام لوگوں میں سب سے شدید دشمن حضرت محمدﷺ اور اس دین کے یہودی تھے‘ حالانکہ ان کو تو قریب ترین ہونا چاہیے تھا‘ اس لیے کہ ان کے ہاں علم کا چرچا تھا‘ ان کے ہاں فقہاء تھے‘ عالم تھے‘ قاضی تھے‘ مدینہ میں ان کی شرعی عدالتیں تھیں‘ لیکن بدترین دشمن وہ ہوئے‘ اور آج تک ہیں۔ تو ان حقائق کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ تو یہاں اب اصلاً خطاب ہے محمدٌ رسول اللہﷺ سے صیغہ واحد میں‘ اور تبعاً یہ خطاب ہر اُس شخص سے ہے جو بھی کبھی تا قیامِ قیامت اُمت محمدﷺ میں سے ایک داعی کی حیثیت سے اسی کام کا بیڑا اٹھا کر کھڑا ہوگا۔ کسے باشد۔

وہ خطاب کیا ہے: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ﴾ ’’تو اسی کی دعوت دیتے رہو‘‘۔ ’’ذٰلِكَ‘‘ اسم اشارہ ہے‘ اس کا مشارٌ الیہ کیا ہے؟ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ یعنی اقامتِ دین کی دعوت دیتے رہیے۔ آپ کم پر سودا نہ کیجیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ دباؤ سے متأثر ہو کر مداہنت اختیار کر لیں۔ سورۃ القلم میں فرما دیا تھا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹﴾ کہ اے نبیؐ! آپ ان جھٹلانے والوں کی باتوں میں نہ آئیے! یہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا ڈھیلے پڑیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں۔ They have tested your metal. وہ پوری طرح ٹھونک بجا کر آپؐ کو دیکھ چکے ہیں کہ

آپؐ جھکنے والے نہیں ہیں' اور کسی تشدد' دباؤ یا کسی لالچ سے آپؐ کو جھکایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اب وہ پوری کوشش کریں گے کہ کوئی معاہدہ ہو جائے' کوئی لے دے کر صلح ہو جائے اور کچھ تو آپؐ کو اپنے مقام سے کھسکائیں۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل (آیات ۷۳ تا ۷۵) میں بایں الفاظ فرمائی گئی:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِىَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾﴾

''(اے نبی!) یہ تو اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ آپ کو بچلا کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے تاکہ آپ ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لیں۔ (اس سے کم پر کوئی مصالحت کر لیں' کچھ give & take کا معاملہ کر لیں) اور اگر آپ کہیں ایسا کر لیتے تو وہ ضرور آپ کو اپنا دوست بنا لیتے''۔

اس طرح ان کا جھگڑا ختم ہو جاتا' اس لیے کہ ان کی اصل لڑائی تو اس قرآن سے ہے' آپؐ سے تو ان کی کوئی شخصی لڑائی نہیں ہے۔

﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾﴾

''اور اگر ہم نے ہی آپ کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو بعید نہ تھا کہ آپ ان کی طرف کسی درجے میں جھک ہی جاتے''۔

﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾﴾

''اور اگر کہیں ایسا ہو جاتا تو پھر ہم آپ کو دوہری سزا دیتے دنیا کی اور دوہری سزا دیتے موت کی' پھر ہمارے مقابلے میں آپ کوئی مددگار نہ پاتے''۔

لہٰذا یہاں فرمایا: اے نبیؐ! ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ﴾ ''پس آپ اسی کی دعوت دیتے رہیے اور اسی پر مضبوطی سے ڈٹے رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے''۔ یہاں اب جس چیز کا حکم دیا جا رہا ہے وہ اقامت نہیں' استقامت ہے اور میں کہا کرتا ہوں کہ اس استقامت میں ایک قیامت مضمر ہے۔ آپ اپنی دعوت پر جمے رہیں' کوئی آپ کو ہلا نہ سکے' آپ کو اپنے موقف سے بال برابر اِدھر سے اُدھر منحرف نہ کر سکے' جھکا نہ سکے' مداہنت پر آمادہ نہ کر سکے' کسی معاملے میں نرم نہ کر سکے۔ آپ کی کیفیت یہ ہونی چاہیے جو ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ اور ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ ایک چٹان ہے جس کو ہلایا نہیں جا سکتا' اس کو کہیں بھی جھکنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے اصل میں داعی کا مطلوبہ کردار۔

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے''۔ اس کا کوئی سوال نہیں تھا کہ حضورﷺ ان کی خواہشات کی پیروی کرتے' لیکن پھر بھی اصولی طور پر وارننگ دے دی گئی' اس لیے کہ یہ ہدایت صرف حضورﷺ کے لیے نہیں' ہمارے لیے بھی تو یہی ہدایت ہے نا! حضورﷺ کے لیے یہ چیز اگر خارج از بحث بھی ہو جائے تو بعد میں آنے والے کسی داعی کے لیے تو خارج از بحث نہیں ہے کہ وہ کسی مداہنت یا compromise پر آ جائے' کہیں کوئی شارٹ کٹ نکالنے پر آ جائے' کہیں اپنے اصولوں کے اندر کتر بیونت کرنے پر آ جائے' تو یہ اس کے لیے راہنمائی ہے۔ یہاں بھی ''اتباع'' کا لفظ آیا ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۰ میں آیا ہے: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ﴾ ان کی کیا ملت ہے! ان کی تو خواہشات ہیں' ملت تو یہ ہے' دین یہ ہے' حق یہ ہے جو آپؐ پر نازل ہوا ہے۔ اب اگر یہ آپؐ پر دباؤ ڈال رہے ہیں' آپ کو pressurize کر رہے ہیں تو کس چیز کی طرف؟ اپنی خواہشِ نفس کی طرف!

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور (ڈنکے کی چوٹ) کہہ دیجیے مَیں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی''۔ یہاں یہ ''مِنْ'' تبعیضیہ نہیں ہے کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتا ہوں' بلکہ یہ مِنْ بیانیہ ہے' یہ ''بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کا بیان ہے' یعنی وہ کتاب جو اللہ نے نازل فرمائی ہے' میرا ایمان تو اس پر ہے' میں اس پر ڈٹا ہوا ہوں' میں اس سے نہیں ہٹوں گا۔ اسی قرآن سے تو وہ آپﷺ کو بچلانے کی فکر میں تھے' اسی کے لیے وہ زور لگا رہے تھے' تاکہ آپؐ (معاذ اللہ) کوئی چیز

اپنی طرف سے گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔ یہی بات سورۂ یونس (آیت ۱۵) میں بھی آئی کہ اے نبیؐ! وہ آپ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ﴾ ''اس کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجیے''۔ ﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے کہ میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے جی سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں''۔ ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ﴾ ''میں تو بس اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے''۔ میں تو خود وحیِ الٰہی کا پابند ہوں۔ میں تو خود عبد ہوں، معبود تو نہیں ہوں، میں حاکم تو نہیں ہوں، میں تو اللہ کا محکوم ہوں، لہٰذا میں وحیِ الٰہی میں ترمیم کیسے کر دوں؟ وہی بات یہاں فرمائی جا رہی ہے: ﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور کہہ دیجیے میرا پختہ یقین ہے اس پر جو اللہ نے نازل فرمایا، یعنی کتاب''۔ البتہ اس کتاب میں قرآن بھی شامل ہے اور تورات اور دوسری آسمانی کتب کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو وحیِ الٰہی پر مشتمل ہے۔ ان سب پر ہمارا ایمان ہے، از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾۔

آنحضور ﷺ کی دعوت کا اصل ہدف

آگے فرمایا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ ''اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں''۔ اس ضمن میں آپ کو متداول تفاسیر میں تھوڑا سا ابہام ملے گا۔ اکثر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ ''لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ'' سے مراد یہود و نصاریٰ کے مابین عدل ہے کہ ان کے جو تفرقے تھے ان میں کون کس معاملے میں حق پر ہے۔ یعنی مجھے حکم ہوا ہے کہ بجائے اس کے کہ میں تمہاری پیروی کروں، میں تو خود تمہارے معاملے میں عدل اور انصاف کرنے آیا ہوں۔ اس مفہوم کا تعلق آیت ماسبق (آیت ۱۴) سے جڑ جاتا ہے: ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ﴾ کہ اگر ایک وقت معین نہ ہو گیا ہوتا اور بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ابھی ان کا قصہ چکا دیا جاتا۔ لیکن اے نبیؐ آپ کہہ دیں کہ میں تمہارے مابین عدل کر سکتا ہوں، میں تمہیں

بتاؤں گا کہ کیا درست ہے، کیا باطل ہے! یہود کس معاملے میں غلط چلے گئے ہیں اور نصاریٰ نے کس معاملے میں غلو کیا ہے، اُن کی گمراہی کیا ہے، تمہاری غلطی کیا ہے۔ تو اس مفہوم کے اندر بھی بالکل کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس ''عدل'' کا تعلق بھی اقامت دین سے ہے، کہ دین اس لیے آیا ہے کہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔

میں نے درس کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ سورۃ الشوریٰ اور سورۃ الحدید میں گہری مماثلت ہے اور یہ کہ ''الکتاب'' اور ''المیزان'' کے دو الفاظ جمع ہو کر قرآن مجید میں صرف ان دو سورتوں میں آئے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت (نمبر ۱۷) میں یہ الفاظ آ رہے ہیں: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ﴾ اور سورۃ الحدید (آیت ۲۵) میں ارشاد ہوا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ ہم نے قرآن نازل کیا، دوسری کتابیں نازل کیں، رسول بھیجے، شریعتیں نازل کیں اور میزان اتاری۔ آخر کس لیے؟ اس لیے کہ اسے نصب کرو! دین اس لیے دیا کہ اسے قائم کرو! شریعت اس لیے دی کہ اسے نافذ کرو! حدود اس لیے دیں کہ ان کا اجراء کرو! اگر یہ نہیں کرتے ہو تو یہ سب کھیل ہے، تماشا ہے، hobby ہے، پیشہ ہے، کاروبار ہے! تو یہ سمجھ لیجیے کہ اقامت دین کا اصل مقصد اقامتِ عدل و قسط ہے۔ ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''تاکہ لوگ عدل پر کاربند ہوں'' اور اگر کوئی اس میں آڑے آتا ہے تو بگڑے تگڑوں کے علاج کے لیے ہم نے تلوار بھی اتاری۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ......﴾ چنانچہ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ کا مفہوم سمجھنے کے لیے سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو یہاں مندرج مانیے۔ یہ عدل صرف نصاریٰ اور یہود کے مابین نہیں ہے، یہ عدل تو طبقات کے مابین ہے، یہ عدل مرد اور عورت کے مابین ہے، یہ عدل جماعت اور فرد کے مابین ہے، یہ عدل اجتماعیت اور انفرادیت کے مابین ہے، یہ عدل سرمائے اور محنت کے مابین ہے، یہ عدل حکومت اور شہریوں کے مابین ہے۔

چنانچہ ہر اعتبار سے عدل وتوازن اور میزان کو نصب کرنے اور عدل وقسط کے نظام کو قائم کرنے کے لیے آئے ہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ گویا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اعلان یہ تھا کہ تم مجھے محض واعظ نہ سمجھو' میں تمہارے مابین عدل قائم کرنے کے لیے آیا ہوں۔

ایک واعظ کی دعوت اور رسول کی دعوت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ وعظ کہنے والا وعظ کہتا ہے' لفاظی کے جوہر دکھاتا ہے' اپنے اسلوبِ بیان کا لوگوں کو نظارہ کراتا ہے اور پھر وہ اپنا راستہ لیتا ہے۔ اگلی منزل پر پہنچ کر وہ پھر اپنا وعظ کہتا ہے۔ لوگ اس کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں' اس لیے کہ وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ ٹھیک ہو جاؤ' اپنے سودی کاروبار چھوڑ دو! اگر یہ کہے گا تو اسے کون حلوہ کھلائے گا اور کون نذرانے پیش کرے گا؟ واعظ کا کام یہ ہے کہ بات کہی اور ''وَمَا عَلَيْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ'' پر ختم کر دی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام' ہم تو جا رہے ہیں۔ لیکن نبی ورسول کی دعوت اور وہ دعوت جو علیٰ منہاج النبوۃ ہوگی وہ بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس لیے کہ وہ تو عدل قائم کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں' جیسا کہ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار' اللہ کے لیے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ!'' جبکہ سورۃ المائدۃ میں یہی بات ان الفاظ میں فرمائی گئی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۸) بات ایک ہی ہے' ترتیب بدل گئی۔ مضمون وہی ہے' ترتیب عکسی ہوگئی۔

حجت بازی سے کنارہ کشی کا اصل الاصول

اب آگے خطاب کا جو انداز آ رہا ہے اس میں ان لوگوں کے لیے جو دین کے خادم ہونے کے مدعی ہوں' بہت بڑا سبق ہے۔ ہم بچپن میں مٹھیوں پر مٹھیاں رکھ کر کھیل کھیلا کرتے تھے ''آم والے آم دے___ آم ہیں سرکار کے۔ ہم بھی ہیں دربار کے''۔ تو اس جدوجہد میں ہم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں! تم دین کا کام کر رہے ہو تو ہم بھی کر رہے ہیں۔ دین کی خدمت تم بھی کر رہے ہو' ہم بھی کر رہے ہیں! تو اس کی نفی نہ کیجیے' اس کو recognize کیجیے کہ اگر تم بھی واقعتاً دین ہی کا کام کر رہے ہو تو ہمارا تم سے

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ انداز نہ ہو کہ تم کہاں سے دین کے نئے نویلے ٹھیکے دار آ گئے؟ یہ ضرور ہے کہ طریق کار میں اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن اگر دین ہی کے لیے تم کام کر رہے ہو اور دین ہی کے لیے ہم کر رہے ہیں تو جھگڑا کاہے کا؟ تو فرمایا: ﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ﴾ ''اللہ ہی ہمارا ربّ بھی ہے اور تمہارا ربّ بھی!'' ﴿لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ﴾ ''ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال''۔ اگر ہم سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں تو ان کا وبال تم پر نہیں جائے گا اور تم اگر صحیح راستے پر ہو تو تمہارا اجر وثواب تمہی کو ملے گا' اس میں سے ہم حصہ نہیں بٹوا سکیں گے۔ ﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۚ﴾ ''ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے''۔ آپس میں کوئی دلیل بازی' کوئی جھگڑا' کوئی فساد' کوئی ایک دوسرے کو اڑنگا لگانا آخر کس لیے؟

اس آیت میں دعوت واقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہونے والی جماعت یا تنظیم کے لیے یہ ہدایت ہے کہ اس مقصد کے لیے جو بھی دوسری ہم عصر دینی تنظیمیں اور تحریکیں کام کر رہی ہوں ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ قرآن حکیم کا اہم ترین مقام ہے۔ ﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۚ﴾ ''اللہ ہی ہمارا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے' ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں' ہمارے اور تمہارے مابین کوئی جھگڑا نہیں ہے''۔ تم جو محنت کر رہے ہو اگر صحیح ہے تو اس کا اجر وثواب تمہی کو ملے گا' ہم اس میں سے کچھ claim نہیں کر سکتے اور اگر ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں تو اس کا وبال ہم پر ہی آئے گا' تم پر نہیں جائے گا۔ تو جھگڑا کاہے کا ہے! یہ آپس کی حجت بازی' آپس میں سر پھٹول' آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہونا' آپس میں بحث و تکرار' آپس میں مناظرہ اور مجادلہ___ آخر اس کا کیا فائدہ!

﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ﴾ ''اللہ ہمارے مابین جمعیت پیدا فرما دے گا''۔ عجیب نکتہ ہے کہ یہاں ''يَجْمَعُنَا'' نہیں فرمایا کہ ''اللہ ہمیں جمع کر دے گا''۔ اس مفہوم کے لیے

یہاں ''بَیۡنَنَا'' کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ ذرا سا فصل کر دیا کہ ﴿اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا﴾ ''اللہ ہمارے مابین جمعیت پیدا کر دے گا''۔ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ ایک ہوتا ہے جماعتوں کا یا افراد کا جمع ہو جانا' متحد ہو جانا' جبکہ ایک ہوتا ہے کام کا کسی ایک کھاتے میں جمع ہوتے رہنا۔ اگر تم بھی دین کا کام کر رہے ہو اور ہم بھی کر رہے ہیں تو کام تو جمع ہو رہا ہے! مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر کوئی نوجوان جماعت اسلامی یا اسلامی جمعیت طلبہ کے ذریعے دین کے قریب آ گیا اور کوئی دوسرا تبلیغی جماعت کے ذریعے دین کے قریب آ گیا تو دونوں صورتوں میں کام تو دین ہی کا ہوا۔ یہ جماعتیں اگر اتحاد نہ کریں' جمع نہ ہوں' پھر بھی کام تو جمع ہو رہا ہے۔ کم از کم اس بات کو اپنے ذہن میں رکھو تو باہم دست و گریبان ہونے میں وقت ضائع نہیں کرو گے۔ اگر ہمارا ہدف ایک ہے اور اہم ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں تو جتنا آگے بڑھیں گے قریب تر آئیں گے۔ بہت سی جماعتوں اور تنظیموں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں' ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم بھی دین کا کام کر رہے ہیں' تو ہدف تو ایک ہوا نا! تو فرض کیجیے اس وقت ہماری approaches مختلف ہیں' ہم مختلف راستوں سے اس ہدف پر جا رہے ہیں' لیکن اگر ہدف ایک ہے تو جتنا آگے بڑھیں گے' قریب تر ہوں گے یا بعید تر ہوں گے؟

اس کے لیے میں منیٰ اور عرفات کی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ اندازہ کریں کہ پچیس تیس لاکھ افراد منیٰ سے عرفات کی طرف move کر رہے ہیں۔ تقریباً چھ میل کا فاصلہ ہے اور وقت بڑا محدود ہے جس میں وہاں پہنچنا ہے۔ جو وہاں پہنچنے سے رہ گیا اس کا حج ہی رہ گیا۔ اس لیے کہ از روئے حدیث نبویؐ ((اَلۡحَجُّ عَرَفَۃٌ))[1] حج تو نام ہی عرفہ کا ہے۔ کوئی اور چیز رہ جائے تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے' لیکن عرفہ کا وقوف نہیں کیا تو حج ہی نہیں ہوا۔ اُس وقت کیا قیامت ہوتی ہے! یہی وجہ ہے کہ وہاں پر اب چھ چھ' آٹھ آٹھ سڑکیں بنا دی گئی ہیں جو مختلف راستوں سے جا رہی ہیں۔ کوئی اس پہاڑ کے اُدھر

(۱) سنن الترمذی' کتاب الحج' باب ما جاء فیمن ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج

سے جا رہی ہے' کوئی اس پہاڑ کے اِدھر سے جا رہی ہے' کوئی اس پل کے نیچے سے نکل رہی ہے۔ پھر وہ سڑکیں بھی اتنی چوڑی چوڑی ہیں کہ فٹ بال کے گراؤنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے اوپر ایک اژدھام چل رہا ہے۔ قافلے رواں دواں ہیں۔ پیدل جانے والوں کے لیے الگ راستے مختص ہیں اور ٹریفک کے لیے الگ سڑکیں ہیں۔ جو قافلے پیدل جا رہے ہیں انہوں نے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں تا کہ اس نشانی کو دیکھ کر اس قافلے کے لوگ جمع رہیں۔ تو اگرچہ وہ قافلے جدا ہیں' ان کے عَلم جدا ہیں' سڑکیں جدا ہیں' لیکن منزل سب کی ایک ہے۔ تو اس concept کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ جھگڑا کاہے کا ہے' لڑائی کاہے کی ہے' دنگا فساد کی کیا ضرورت ہے۔ ﴿اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا﴾ ''اللہ ہمارے مابین جمعیت پیدا فرما دے گا''۔

﴿وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف (سب کو) جانا ہے''۔ اگر ہم یہاں نہ بھی جمع ہوئے تو قیامت کے میدان میں تو جمع ہوں گے ہی! وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کیوں بےصبرے ہو رہے ہو؟ کیا ضروری ہے کہ سارے قضیے یہیں چکا دیے جائیں! آخر میدانِ حشر میں بھی تو جمع ہوں گے۔ لوٹنا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہاں تو ہم جمع ہو کر ہی رہیں گے۔

تو اب یہ جمعیت کے تین درجے ہو گئے: (۱) ہم علیحدہ علیحدہ رہتے ہوئے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں تو کام اسلام ہی کے حق میں جمع ہو رہا ہے۔ (۲) اگر ہم بھی آگے بڑھیں اور آپ بھی آگے بڑھیں' چاہے اپنے اپنے طریقہ کار پر بڑھیں' فاصلہ تو لازماً کم ہو گا اور کیا عجب کہ ہم physically بھی جمع ہو جائیں۔ (۳) اور یہاں جمع نہ ہوئے تو وہاں قیامت میں تو جمع ہونا ہی ہے۔ وہاں فیصلہ ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں تھا' کون واقعی اسی ہدف کو معین کر کے چل رہا تھا۔ تو بےصبری کی ضرورت نہیں۔ یہ تین آیات (۱۳ تا ۱۵) میرے نزدیک اقامتِ دین کے موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی کلائمکس ہیں۔

☆ ☆ ☆

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی پُر زور دعوت

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۴۷‘ ۴۸ کا مطالعہ کرتے ہیں جو اسی درس کا حصہ ہیں:

﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَۃً فَرِحَ بِہَا ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ فَاِنَّ الۡاِنۡسَانَ کَفُوۡرٌ ﴿۴۸﴾﴾

ارشاد ہوا: ﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ﴾ ’’لبیک کہو اپنے ربّ کی بات پر!‘‘ یہاں پھر جمع کا صیغہ آ گیا ہے۔ ایک اہم بات نوٹ کر لیجیے کہ ۵۳ آیات پر مشتمل اس سورۂ مبارکہ میں‘ جو پانچ رکوعوں میں منقسم ہے‘ فعل امر جمع کے صیغے صرف ان ہی دو مقامات پر آئے ہیں۔ ابھی تک پوری سورت میں جمع کے صیغے میں اُمت یا مسلمانوں سے خطاب کے لیے صرف ایک امر اور ایک نہی آیا ہے۔ یعنی ﴿اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ﴾ اب اس امر ﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ﴾ کا تعلق اسی سے ہے۔ آپ نوٹ کیجیے کہ سورۃ الشوریٰ پوری کی پوری خبریہ کلام پر مشتمل ہے اور انشائیہ کلام اس پوری سورت میں صرف ان دو مقامات پر آیا ہے۔ جمع کے صیغے سے آیت ۱۳ میں ایک امر اور ایک نہی‘ اور یہاں آیت ۴۷ میں ایک امر۔ جبکہ حضور ﷺ کے لیے واحد کے صیغے سے آیت ۱۵ میں تین امر اور ایک نہی۔ یہ کل انشائیہ کلام ہے اس پوری سورت میں‘ باقی سارا کلام خبریہ ہے۔ لہٰذا ﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ﴾ کا تعلق اسی امر و نہی سے ہوگا: ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ﴾ یہ ہے وہ قول‘ وہ پکار‘ وہ ذمہ داری جو تم پر عائد کی گئی ہے۔ اب فرمایا: لبیک کہو اپنے ربّ کی پکار پر! قبول کرو اپنے ربّ کی دعوت کو! استجابت اور اجابت دونوں کے معنی ایک ہیں۔ اللہ پکار رہا ہے‘ آؤ اس کی پکار پر لبیک کہو‘ آغاز کرو‘ بسم اللہ کرو‘ کھڑے نہ رہو‘ گومگو میں نہ رہو‘ تذبذب میں نہ رہو‘ تأخیر نہ کرو‘ معاملے کو

تعویق میں نہ ڈالو۔ یہی تأخیر اور تعویق تباہ کن ہے۔ آخر تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ قدم بڑھاؤ‘ دعوت قبول کرو‘ لبیک کہو اپنے ربّ کی پکار پر!

دیکھئے‘ اس میں کہیں یہ حکم نہیں آیا کہ نماز پڑھو‘ یا روزہ رکھو‘ یا زکوٰۃ دو یا حج کرو! ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّمہ ہے‘ لیکن غور کیجیے کہ یہاں اِسۡتَجِیۡبُوۡا کا معنی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ کون سی پکار ہے جس پر یہاں لبیک کہنے کی دعوت دی جا رہی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ پکار آیت ۱۳ میں ہمارے سامنے آ چکی: ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ﴾ کہ قائم کرو دین کو اور اس دین کے بارے میں یا اس دین کی اقامت کے بارے میں متفرق مت ہو! تفرقے‘ تفرقے میں فرق ہے‘ بازی بازی باریش بابا ہم بازی!

اب یہاں جو اپیل ہے اس کو صرف اپنے ان ظاہری کانوں سے نہیں‘ دل کے کانوں سے سنئے! اس کا مخاطب میں بھی ہوں‘ آپ بھی ہیں‘ ہر مسلمان ہے۔ فرمایا: ﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’لبیک کہو اپنے ربّ کی پکار پر اس سے پہلے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آ دھمکے جس کے ٹلنے کی پھر کوئی صورت نہیں‘‘۔ یہاں ترکیب دراصل یوں ہے: ’’اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ مِنَ اللّٰہِ لَا مَرَدَّ لَہٗ‘‘ لیکن قرآن کی اپنی ایک موسیقی اور اپنا ایک آہنگ (rhythm) ہے جس میں الفاظ کی تقدیم وتأخیر کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کے حکم سے جب وہ دن آ دھمکے گا تو پھر کوئی اس کا لوٹانے والا نہیں ہوگا۔ وہ دن جب آ جائے گا تو لوٹایا نہیں جائے گا۔ سورۃ المنافقون کی آخری آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَ لَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور اللہ ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا کسی کو جب اُس (کی مہلتِ عمل پوری ہونے) کا وقت آ جاتا ہے‘ اور اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو‘‘۔ آیت زیر مطالعہ میں ﴿یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ﴾ سے قیامت صغریٰ یعنی ہماری موت بھی مراد ہے اور قیامت کبریٰ بھی جس کو ہم یوم قیامت کہتے ہیں۔

﴿مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ﴿۴۷﴾﴾ ’’نہیں ہوگی تمہارے لیے اُس دن کوئی جائے پناہ اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے والا ہوگا‘‘۔ اُس دن تمہارے

لیے کوئی ملجا‘ کوئی ماً ویٰ‘ کوئی ٹھکانہ‘ کوئی پناہ گاہ‘ کوئی جائے فرار نہیں ہوگی۔ ’’ملجا‘‘ کہتے ہیں جہاں آدمی جا کر کسی کی پناہ لے لیتا ہے۔ یہ لفظ ایک ماً ثور دعا میں بڑی عجیب شان سے آیا ہے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا ہوگا کہ بچے کو اگر ماں مار رہی ہو تو بچہ بھاگتا نہیں ہے‘ بلکہ ماں ہی سے لپٹتا ہے۔ ماں اگرچہ مار رہی ہے‘ لیکن وہ جائے کہاں! کس در پہ جائے؟ اس کا تو ملجا اور ماً ویٰ وہی ہے۔ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ)) (۱) یعنی اے اللہ! تجھ سے بچ کر جائیں کہاں سوائے تیری ہی پناہ میں آنے کے؟ تجھ سے بھاگ کر کوئی جائے پناہ کہاں تلاش کی جا سکتی ہے؟ کوئی ملجا‘ کوئی ماً ویٰ‘ کوئی ٹھکانہ‘ کوئی پناہ گاہ تجھ سے بھاگ کر جانے کی نہیں ہے‘ سوائے اس کے کہ تیرے ہی دامنِ عفو کے اندر آ کر پناہ لیں!

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی‘ جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں!

کہاں جاؤں‘ کس دروازے پر دستک دوں؟ کوئی ہے ہی نہیں! تو یہ ہے وہ بات کہ ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ﴾ اُس دن کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ٹھکانہ تو آج بھی کوئی نہیں ہے‘ لیکن آج کچھ سراب نظر آ رہے ہیں جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے جی سے گھڑ لیے ہیں۔ کچھ شفاعت باطلہ کے تصورات ہیں‘ کچھ اور چیزوں کو ہم نے اپنے ذہنوں کے اندر پناہ گاہیں بنایا ہوا ہے۔ اُس روز حقیقت کھل جائے گی کہ ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝۴۷﴾ ’’نکیر‘‘ سے مراد ہے کوئی نکیر کرنے والا‘ کوئی انکار کرنے والا‘ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا۔ آپ کے کسی پڑوسی کو پولیس پکڑ کر لے جائے تو آپ تھانے جا کر پوچھتے ہیں کہ بھئی اسے کیوں پکڑا ہے‘ کیا مسئلہ ہے‘ کیا معاملہ ہے؟ لیکن اُس روز تمہارا کوئی پوچھنے والا تک نہیں ہوگا۔ تمہارے حق میں کوئی کچھ کہنے والا‘ کوئی باز پرس کرنے والا‘ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الدعوات‘ باب اذا بات طاهرا وفضله۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار‘ باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔

رسول کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے

آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ﴾ ’’اب اگر یہ لوگ مُنہ موڑتے ہیں تو (اے نبیﷺ!) ہم نے آپ کو اِن پر نگران بنا کر تو نہیں بھیجا ہے‘‘۔ اگر یہ سب کچھ سن کر پی جائیں‘ ہضم کر جائیں‘ ٹس سے مس نہ ہوں‘ تو بھی اے نبیﷺ! آپ ملول نہ ہوں‘ غمگین نہ ہوں‘ ہم نے آپؐ کو اِن پر نگران بنا کر نہیں بھیجا‘ ہم نے آپؐ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا‘ ان کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی‘ آپؐ ان کی طرف سے مسئول نہیں ہیں۔ ﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ﴾ ’’نہیں ہے آپؐ پر سوائے پہنچا دینے کی ذمہ داری کے‘‘۔ آپ پر صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ آپؐ نے پہنچا دیا‘ حق ادا کر دیا‘ اب آپ بَری ہیں‘ کوئی مانے گا تو اپنے لیے‘ نہیں مانے گا تو اپنے لیے۔ جس نے خیر کمایا اپنے لیے اور جس نے شر کمایا اپنے لیے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ ہاں اگر ابلاغ کا حق آپؐ ادا نہ کریں تو آپؐ جواب دہ ہوں گے۔ آپؐ نے ابلاغ کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ بَری الذمہ ہیں‘ اب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے‘ وہ اللہ کے ہاں جواب دہی کرے گا۔

اعراض کا اصل سبب۔ نقطۂ نظر کی غلطی

اس اعراض کا اصل سبب کیا ہے! آدمی اس طرف کیوں نہیں آتا؟ اس لیے کہ دنیا کی نعمتوں اور دنیا کی تکالیف کے بارے میں اس کے ذہن میں ایک غلط تصور بیٹھا ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ﴾ ’’اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے‘‘۔ جب ہم اسے اپنے خاص خزانۂ فضل سے کچھ رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں‘ فراوانی ہے‘ عیش ہے‘ آرام ہے‘ سکون ہے تو اترانے لگتا ہے‘ پھولے نہیں سماتا۔ ہم سے غافل ہو جاتا ہے‘ آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝۴۸﴾ ’’اور اگر

ان کے اپنے ہی کرتوتوں کی پاداش میں اُن پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے تو پھر یقیناً انسان انتہائی ناشکرا بن جاتا ہے‘‘۔ پھر وہ انتہائی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے‘ اس کی کمر ہمت ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں‘ میں نے سنا تھا کہ یوپی کے مشرقی حصے پُرب کے لوگ جو پُربیے کہلاتے ہیں‘ کسی زمانے میں ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ چوبیس گھنٹے میں صرف دوپہر کے وقت ایک ہی کھانا کھاتے تھے۔ اب آپ خود سمجھ لیجیے کہ صرف دوپہر کے وقت چوبیس گھنٹے کے لیے کھاتے تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاتے تھے۔ لہٰذا شام تک تو پیٹ میں سخت گرانی رہتی تھی‘ اور اگلی صبح اٹھتے ہی سخت بھوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تو ان کے ہاں یہ محاورہ تھا ’’آدھا دن دھاپت مرت‘ آدھا دن بھوکت مرت‘‘۔ یعنی ایک عذاب ہے کہ آدھا دن تو شکم سیری سے مر رہے ہیں‘ اس سے پیٹ میں ایک بے چینی ہے‘ گرانی ہے اور آدھا دن بھوک سے مر رہے ہیں۔ صبح سے جو بھوک لگنی شروع ہوئی تو دوپہر تک برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ تو یہی حال ہے کہ کثرت ہوئی تو مرت اور تکلیف آ گئی تو مرت۔ نہ اِدھر کام کے رہے نہ اُدھر کام کے رہے۔ فراوانی ہوئی تو غافل ہو گئے‘ اترا رہے ہیں‘ اکڑ رہے ہیں‘ دندنا رہے ہیں اور کہیں مصیبت آ گئی تو ناشکری پر اتر آئے ہیں کہ کیا کریں جی‘ ہمارے تو یہ مسائل ہیں‘ ہمارا تو معاش کا معاملہ ہے‘ ہم کیا کریں‘ ہم دین کا کام کیسے کر سکتے ہیں! یہ ہے اصل میں اس نقطۂ نظر کی غلطی۔ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب امتحان ہیں‘ آزمائشیں ہیں‘ ہمت کرو‘ بسم اللہ کرو‘ قدم بڑھاؤ‘ اللہ آسانی کرے گا‘ تیسیر کرے گا۔ وہ تمہیں وہاں سے دے گا جہاں سے تمہیں گمان تک نہیں‘ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ﴾ (الطلاق:۳) اور اگر اپنے حالات کو دلیل کے طور پر اپنے سامنے رکھ کر کھڑے رہ گئے تو پھر کھڑے رہ گئے! پھر تو آپ خس وخاشاک کی مانند ہوا میں اڑ گئے یا پانی میں بہہ گئے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس سے بچائے!

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم OO

درس ۲

اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے
مطلوبہ اوصاف

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ (الفتح)... صدق اللہ العظیم

اس منتخب نصاب (۲) کا اصل موضوع ’’اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور اس کے تنظیمی مسائل‘‘ ہے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق قرآن مجید کے کچھ مقامات منتخب کر کے اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے اوّلین دو مقامات درحقیقت اُس پہلے اور اصل منتخب نصاب اور اِس دوسرے منتخب نصاب کے مابین نقطۂ اتصال ہیں اور ان کے باہمی ربط کو ظاہر کر رہے ہیں۔ سورۃ الحج کی آخری دو آیات میں شہادت علی الناس کا تصور ہمارے سامنے آیا: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ﴾ ’’تاکہ رسولؐ گواہ ہو جائے تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر‘‘۔ اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور اس سے عہدہ برآ

ہونے کے لیے جہاد کا ذکر آیا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ’’جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اس مقصد کے لیے) چن لیا ہے۔‘‘ درحقیقت اب اس کا تعلق سورۃ الصّف سے جڑ رہا ہے جس میں نہ صرف جہاد بلکہ قتال کا تصور دیا گیا ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیات یہ ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

چنانچہ ازروئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کا پہلا ہدف ہے ’’شہادت علی الناس‘‘ اور دوسرا ہدف ہے ’’اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ‘‘ یعنی دینِ حق کو کُل کے کُل دین پر غالب کر دینا۔ سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے اور متذکرہ بالا آیات اس کی مرکزی آیات ہیں‘ لہٰذا اس ضمن میں ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ان آیات میں سے پہلی آیت‘ جس کو ایک روایت کے مطابق امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ اس پر اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں تفصیل موجود ہے‘ بلکہ بڑی طویل بحثیں موجود ہیں۔

چند مغالطے اور اُن کا ازالہ

میرے اکثر و بیشتر کتابچے بلکہ بڑی کتابیں بھی میرے دروس و خطابات پر مشتمل ہیں‘ جنہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے‘ لیکن مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم ہوا ہے کہ چند اہم موضوعات پر میرے قلم سے کچھ تحریریں نکلی ہیں اور شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے (جیسا کہ گزشتہ نشست میں عرض کیا گیا) ’’نبی ٔاکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت‘‘ نہایت اہمیت کی حامل تحریر ہے اور اس میں ۲۴ صفحات کا مقالہ اس ایک آیت پر مشتمل ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ اس مقالہ میں مَیں نے اللہ کے فضل و کرم سے اس آیت مبارکہ کے ضمن میں جو بھی ممکن سوال ہو سکتا تھا اس سے بحث کی ہے۔ اس کی ساری لغوی شرح و تراکیب‘ ضمائر کے جتنے بھی ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں اور اس بارے میں جتنی آراء پیش کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں اور اس میں کسی اشتباہ کا امکان باقی نہیں رہا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے بعض دانشور حضرات کا حال علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہے؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجے فقیہانِ حرم بے توفیق!

چنانچہ ایک صاحب نے اس بارے میں ہمارے موقف پر جرح کی ہے اور اس پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ کے ضمن میں جو کچھ ہم بیان کرتے رہے ہیں اس پر ان صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ مراد لینا کہ پورے کرۂ ارضی اور روئے زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنا نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی غرض اور مقصد ہے‘ غلط ہے‘ بلکہ ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ سے مراد صرف جزیرہ نمائے عرب کے ادیان پر دینِ حق کو غالب کر دینا ہے اور یہی درحقیقت رسولِ اکرم ﷺ کا فرضِ منصبی تھا‘ جو آپ ﷺ نے ادا فرما دیا۔

یہ بات اگر اس انداز میں کہی جائے کہ اوّلین فریضہ جو بنفسِ نفیس محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے پورا ہونا تھا وہ جزیرہ نمائے عرب پر دین اسلام کا غلبہ تھا‘ تو اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ بات تو ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ترتیب و تدریج ہے۔ جیسا کہ ’’شہادت علی الناس‘‘ کے ضمن میں اگرچہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہے اور ہر انسان جو قیامت تک اس دنیا میں آئے گا وہ درحقیقت حضور ﷺ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے‘ لیکن اس شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی ترتیب یہ قائم ہوئی کہ حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس اہل عرب کو تبلیغ فرمائی اور ان میں ایک اُمت برپا کر دی۔ اور اس طرح جو اُمت وجود میں آئی اب تا قیامِ قیامت اس تبلیغ کی

ذمہ داری اس کے حوالے کر دی۔ اس طرح شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری نبیؐ اکرم ﷺ کے ذریعے سے دو مرحلوں میں پوری ہوئی۔ پہلے مرحلہ میں حضور ﷺ نے خود اِس ذمہ داری کو پورا فرمایا اور اس کی دوسرے مرحلے میں تکمیل بذریعہ اُمتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوگی۔ یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے فرمان ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً))(۱) میں درحقیقت اسی فرضِ منصبی کی تاکید ہے کہ ہر اُمتی اس ذمہ داری کی تکمیل میں حصّہ لے' خواہ ایک ہی آیت کی حد تک لے۔ اور یہاں ''عَنِّیْ'' کا اصل مفہوم انگریزی زبان میں اردو کی نسبت زیادہ واضح طور پر ''on my behalf'' کے الفاظ سے ادا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی تبلیغ کر رہا ہے' جس نے بھی کی ہے' وہ معین الدین اجمیریؒ ہوں یا علی ہجویریؒ ہوں' جو بھی اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لے کر کہیں بھی گیا ہے تو یہ درحقیقت تبلیغ محمدیؐ ہے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا فیض ہے جو جاری ہے۔ جو کوئی بھی یہ تبلیغ کر رہا ہے وہ آپ ﷺ ہی کی جانب سے' آپؐ ہی کے behalf پر کر رہا ہے اور جو کوئی کرے گا وہ بھی آپ ﷺ ہی کے behalf پر کرے گا۔

بالکل یہی ترتیب و تدریج ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب پر دین کو غالب کر دیا اور اس حد تک غلبۂ دین کی تکمیل ہو گئی۔ اب اس عمل کو آخری مرحلے اور آخری درجے تک پہنچانا اُمت کی ذمہ داری ہے' لیکن اس ضمن میں اُمت کے ہاتھوں جو کچھ ہوگا وہ بھی اصل میں حضور ﷺ ہی کا فیض ہے۔ لہٰذا اس تدریج کو اگر یہاں بیان کیا جائے تو قطعاً کوئی حرج نہیں ہے' لیکن اگر اس معاملے کو محدود کر دیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔

دراصل اِن حضرات نے اصل ٹھوکر سورۃ الجمعۃ میں وارد الفاظ ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں کھائی ہے۔ سورۃ الجمعۃ کی دوسری آیت یوں ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ......﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

اُمّیین میں سے ایک رسول انہی میں سے......''۔ اور اگلی آیت میں عطف آتا ہے: ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ ''اور دوسرے انہی میں سے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔'' ان حضرات نے یہ رائے قائم کر لی کہ ''اٰخَرِیْنَ'' سے مراد بھی عرب ہی کے لوگ ہیں کہ جو اس آیت کے نزول تک ایمان نہیں لائے تھے' بعد میں ایمان لائے۔

''آخَرِیْنَ'' کے اس مفہوم سے ہمیں اختلاف ہے' کیونکہ اوّلاً تو یہ بات اس کلام کی عظمت کے منافی ہے' اس لیے کہ یہاں عطف جس اہتمام سے لایا جا رہا ہے یہ اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والی بات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس ایک صحیح حدیثِ مرفوع موجود ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ اُن کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا گیا اور آپؐ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد بھی کسی اور طرف دیکھنا اور اِدھر اُدھر جھانکنا تو درحقیقت حدیثِ نبویؐ سے اعراض کی صورت ہو جائے گی' اس لیے کہ قرآن مجید کے اجمال کی تفصیل اور قرآن مجید میں اگر کہیں وضاحت مطلوب ہے تو اس کی توضیح اور تبیین بھی درحقیقت فرضِ منصبی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا۔ چنانچہ قرآن کے کسی مقام کی وضاحت میں جب ہمیں رسول اللہ ﷺ کا کوئی قول مل جاتا ہے تو دیگر اقوال کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ مثال کے طور پر حروفِ مقطعات کے بارے میں اگر ہمیں حضور ﷺ سے کوئی مرفوع قول مل جائے تو ہمیں اِس وادی اور اُس وادی میں سرگردانی کی کوئی احتیاج نہیں۔ حروفِ مقطعات کے ضمن میں مَیں نے بارہا کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا ایک قول ہمیں ملتا ہے لیکن مرفوع نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ان کا اپنا ایک وجدانی اور ذوقی خیال ہے' لہٰذا اُمت میں سے کسی نے چاہا تو قبول کیا' کسی نے چاہا تو قبول نہیں کیا۔ لیکن اگر مرفوع قول ہوتا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا قطعاً کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر کوئی شخص قولِ رسولؐ کی موجودگی میں کسی اور قول کی طرف التفات کرتا ہے یا اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں ان صاحب سے یہی ہوا۔

حضور ﷺ کی متفق علیہ مرفوع حدیث موجود ہے' حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ'' کون ہیں؟ اسی محفل میں حضرت سلمان فارسیؓ موجود تھے' آپؐ نے ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ یعنی ''اس کی قوم''۔ اور پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایمان اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔ ایک روایت میں ''ایمان'' کی جگہ ''علم'' کا لفظ ہے۔ اور اس سے مراد صرف ایرانی قوم نہیں' بلکہ یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ نے آریائی نسل کے خاص وصف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آریائی نسل میں علم وحکمت' فلسفہ اور منطق کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ آریائی نسل یونان' ایران اور ہندوستان میں آباد ہوئی اور دنیا میں علم اور فلسفہ وحکمت کے یہی تین عظیم مراکز رہے ہیں۔ فلسفہ ومنطق' مسائل کی گہرائی میں جانا' بال کی کھال اُتارنا اور حقیقت تک اپنی عقل کے ذریعے سے پہنچنے کی کوشش کرنا آریائی نسل کا ایک خصوصی وصف اور ان کے مزاج کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور جب ﴿اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ﴾ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی صراحت موجود ہے تو اس کے بعد اب اس کی کوئی اور توجیہہ کرنا درست نہیں ہے' بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے قول کا استخفاف ہے۔

اس کے علاوہ ان صاحب نے جو ستم ڈھایا ہے اس کو میں تحریف فی الترجمہ کہوں گا۔ میرے نزدیک یہ قرآن مجید میں تحریف کے ہم وزن بات ہے۔ اس سے پہلے یہ ہوتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے مفہوم میں اگر مترجم نے یہ سمجھا کہ کچھ الفاظ مقدر ہیں تو بریکٹ میں ان کو شامل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام مولانا ابوالکلام آزاد نے کثرت سے کیا ہے۔ اس سے پہلے کے تراجم میں ہمیں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ جس دَور میں یہ ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا جائے اُس وقت احتیاط کی وہ انتہا تھی کہ ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آئے' چاہے اردو میں جملے کی ترکیب کا حق ادا نہ ہو' تقدیم و تاخیر ہو جائے' کوئی پرواہ نہیں' لیکن قرآنی الفاظ کی ترتیب برقرار رہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا لفظی ہی نہیں لفظ بلفظ ترجمہ کیا جاتا تا کہ مفہوم میں کسی اونچ نیچ کی کوئی ذمہ داری

مترجم پر نہ آئے۔ پھر ایک رجحان یہ آیا کہ ترجمہ کو بامحاورہ کرنے کی کوشش کی جائے' چاہے الفاظ میں کچھ تقدیم وتاخیر ہو جائے' لیکن پھر بھی التزام کیا گیا کہ لفظی ترجمہ ہو۔

بیسویں صدی کے تراجم میں ایک نیا ذوق پیدا ہوا کہ ایسا ترجمہ ہو جس کو پڑھ کر انسان اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لے۔ لہٰذا اس میں کچھ اضافے قوسین (بریکٹ) میں کرنے کا آغاز کیا گیا۔ بریکٹ میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ قرآن کے متن میں نہیں ہیں' لیکن مترجم کے نزدیک ان الفاظ کے اضافے سے اس آیت کا مفہوم رواں بن جاتا ہے اور بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا فتح محمد جالندھریؒ کے تراجم میں بھی قوسین (brackets) کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی توجیہات و تاویلات کو بھی ترجمہ میں شامل کیا ہے' مگر قوسین کے اندر۔ لیکن آج یہ غضب ڈھایا گیا ہے کہ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''تاکہ اسے عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دے۔'' اور اپنے اس اضافے کو بغیر بریکٹس کے باضابطہ متن کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت میرے نزدیک نہ صرف بہت بڑی جسارت اور گمراہی ہے' بلکہ تحریف فی القرآن کے مساوی ہے۔ آپ ایک آیت کا جو مفہوم سمجھتے ہیں آپ کا حق ہے کہ اسے بیان کریں۔ اس کی بہترین شکل تو یہ ہے کہ آپ اپنی وضاحت حواشی میں بیان کریں۔ مزید اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو بریکٹس میں کریں۔ جو چیز قرآن کے متن میں سرے سے موجود ہی نہیں' وہ آپ کا اپنا ذہن وفکر ہے' وہ ایک تاویل ہے جو آپ کے سامنے آئی ہے' اسے قرآن کے متن میں شامل کر دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سبب سے کسی شے کی مخالفت پر کمر کس لے تو یہ چیز اسے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ)) (ابوداؤد ومسند احمد) ''تیرا کسی چیز سے محبت کرنا تجھے اندھا بہرا بنا دیتا ہے۔'' اسی طرح مخالفت' دشمنی اور بغض وعناد بھی انسان کو اندھا بہرا کر دیتا

ہے۔ اِن آیات کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا موقف جو انہوں نے ’’ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء‘‘ میں بیان کیا ہے‘ میثاق (اپریل ۱۹۸۶ء) میں شائع کیا جا چکا ہے۔ کسی کو چند عربی اشعار ازبر ہوں اور جاہلی شاعری سے کچھ مناسبت ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ شاہ ولی اللہؒ سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن کی اس عبارت کی صرفی ونحوی ترکیب شاہ ولی اللہ کی نظروں سے بھی اوجھل رہی۔ یہی درحقیقت انسان کی طبیعت کا وہ نشوز ہے جس سے پھر فتنے جنم لیتے ہیں۔ اسی سے اُمت کے اندر طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور پھلی پھولیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

اس نشست میں مَیں اس آیۂ مبارکہ پر کچھ عرض نہیں کر رہا ہوں۔ اس پر میں ’’نبیٔ اکرمﷺ کا مقصد بعثت‘‘ نامی کتابچے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور مجھے اس پر پورا انشراح ہے۔ اس آیت کے جو مختلف ترجمے کیے گئے ہیں میں نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے اور لِیُظْهِرَهٗ کی ضمیر فاعلی اور ’’ہٗ‘‘ کی ضمیر مفعولی کے تمام امکانات کو زیر بحث لا کر یہ ثابت کیا ہے کہ کسی بھی طرح مراد میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لِیُظْهِرَ کا فاعل رسول ہو یا اللہ‘ نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ ’’تاکہ رسول غالب کر دے دین حق کو‘‘ مفہوم لیا جائے یا ’’تاکہ اللہ غالب کر دے اپنے دین کو‘‘ اس سے نتیجے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ فاعل حقیقی تو اللہ ہی ہے‘ لیکن اس کے لیے محنت انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مشقت محمدٌ رسول اللہﷺ نے جھیلی ہے‘ فاقے آپؐ کو برداشت کرنے پڑے ہیں‘ شعب بنی ہاشم کی تین سال کی اسیری کے تمام شدائد و مصائب کا معاملہ حضورﷺ کے ساتھ ہوا ہے۔ آپؐ کو اپنے جسم اطہر پر پتھراؤ برداشت کرنا پڑا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو اپنی جانیں دینی پڑی ہیں‘ مگر فاعل حقیقی اللہ ہی ہے‘ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: ۱۷) عالمِ واقعہ میں تو حضورﷺ نے مٹھی بھر کر کنکریاں پھینکی تھیں لیکن اللہ نے فرمایا کہ آپؐ نے نہیں‘ ہم نے پھینکی ہیں۔ گویا ع ’’ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!‘‘ تو

نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ رازقِ حقیقی یقیناً اللہ ہے‘ اگرچہ رزق کے لیے محنت ومشقت اور معاشی بھاگ دوڑ انسان کرتا ہے۔ اسی طرح ’’اظهارُ دينِ الحقّ على الدِّينِ كُلِّهٖ‘‘ کا فاعل حقیقی اللہ ہے جبکہ اس کے لیے محنت ومشقت کرنی پڑی ہے ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ‘‘ کو۔ صلی اللہ علیہ وسلم ورضوان اللہ علیہم اجمعین۔

کسی نے کہا کہ ہٗ کی ضمیر مفعولی حضورﷺ کی طرف جاتی ہے ’’تاکہ اللہ غالب کر دے اپنے رسول کو‘‘۔ نتیجہ پھر بھی وہی آئے گا‘ اس لیے کہ رسولؐ کے غلبے کا مطلب دین ہی کا غلبہ تھا۔ رسولؐ نے کوئی اپنی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھی‘ کوئی اپنے نام سے حکومت قائم نہیں کی‘ بلکہ رسول اللہﷺ کا معاملہ تو دوسری انتہا پر نظر آتا ہے کہ جب عام مسلمانوں کے گھروں میں بھی کشادگی وفراوانی آ چکی تھی‘ تنگی ختم ہو چکی تھی‘ اُس وقت بھی آپؐ نے اپنا چولہا ٹھنڈا رکھا ہے۔ جب تمام مسلمانوں کے ہاں خدام اور کنیزیں تھیں اُس وقت بھی اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی کنیز یا غلام عطا نہیں کیا۔ تو وہ غلبہ محمدٌﷺ کا اس معنی میں نہیں تھا کہ کسی شخصیت کا غلبہ تھا‘ بلکہ وہ دین کا غلبہ تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب حضرات میرے مقالے ’’نبی اکرمﷺ کا مقصدِ بعثت‘‘ کا مطالعہ ضرور کریں‘ تاکہ یہ جو فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ہم نے اپنی اجتماعی جدوجہد کا جو ہدف معین کیا ہے ’’اقامت دین‘‘ اور ’’اظهارُ دينِ الحقّ على الدِّينِ كُلِّهٖ‘‘ اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں تو ہم کہیں لاعلمی میں اور اپنی کم فہمی کے باعث یا ان حقائق کے واضح نہ رہنے کے باعث کسی ایسی تحریک یا کوشش سے متاثر نہ ہو جائیں۔

سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کا زیرِ مطالعہ آیت سے ربط وتعلق

اب اصل میں اس آیۂ مبارکہ کا سورۃ الفتح کی آخری آیت سے جو ربط وتعلق ہے اس درس میں اس پر گفتگو ہوگی۔ اقامت دین اور غلبۂ دین کی جو یہ جدوجہد ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ یہ جدوجہد کس نے کی؟ اور وہ لوگ کن اوصاف کے حامل تھے؟ یہ

اس آخری آیت کا مضمون ہے اور ہمارے اِس منتخب نصاب نمبر۲ کے ساتھ منتخب نصاب نمبر ایک کا ربط اب یہاں سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ پہلے تو اس کی ترکیب کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کو سمجھ لیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ‘‘ ایک مکمل جملہ ہے اور ’’وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ‘‘ سے ایک جملہ مستانفہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی یہاں سے ایک نئی بات کا آغاز ہو رہا ہے اور اس جملے کا سابقہ جملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ترجمہ ہوگا: ’’محمد اللہ کے رسول ہیں‘‘۔ یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ ’’محمد‘‘ مبتدأ اور ’’رسول اللہ‘‘ مضاف‘ مضاف الیہ مل کر خبر ہوگئی‘ جملہ کامل ہوگیا۔ اگلے الفاظ سے نیا جملہ شروع ہوگا: ’’اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں......‘‘ دوسری رائے کی رو سے ترجمہ ہو گا: ’’اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں‘‘۔ معطوف اور معطوف علیہ جمع ہو کر مبتدا بنیں گے‘ جبکہ خبر بعد میں آئے گی اور وہ ہے ’’اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ‘‘۔ خبر اوّل ہوگی ’’اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ‘‘ اور خبر دوم ہوگی ’’رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ‘‘ اور یہ سلسلہ آگے چلے گا۔ تو یہ پورا معاملہ خبر کا ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں ان کے یہ یہ اوصاف ہیں۔

اگر پہلی رائے قبول کی جائے تو یوں بات ہوگی کہ جہاں تک تعلق ہے محمد ﷺ کا وہ تو اللہ کے رسول ہیں ہی۔ گویا کہ وہ تو تمام کمال و محاسن کے جامع ہیں‘ ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی احتیاج ہے ہی نہیں‘ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ ان کے خصائص‘ اوصاف‘ محاسن اور کمالات از خود روشن ہیں۔ مزید اُن کے کسی ذکر کی حاجت نہیں‘ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ’’محمد اللہ کے رسول ہیں‘‘۔ جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘۔ تو گویا کہ ایک جملے میں وہ ساری بات آ گئی اور جتنی بھی ان کی مدح ہو سکتی تھی وہ اس میں ہو گئی کہ ’’محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘ اب اس پر مزید کسی اور شے کے اضافے کی کوئی احتیاج نہیں۔ اب جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں ان کے حامل حضور ﷺ کے ساتھی ہیں۔ یہ آپؐ کی جماعت کے افراد کے

اوصاف ہیں جن کو یہاں پر بیان کیا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تمام کمال و محاسن محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں تو یہ اوصاف بھی بدرجۂ اتم‘ بدرجۂ کمال آپ کے اندر بھی موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ان دونوں کو مبتدأ بنا لیا جائے تو خبر میں بھی دونوں شریک ہو جائیں گے‘ لیکن ہمارے لیے عملی اعتبار سے جو اہم تر پہلو ہے وہ آگے ہے کہ جو حضور ﷺ کے ساتھی ہیں اُن کے اوصاف کیا ہیں!

اسلامی انقلابی جماعت کی ہیئت ترکیبی

آگے بڑھنے سے پہلے نوٹ کیجیے کہ یہاں اقامت دین کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی کی طرف بھی ایک اشارہ موجود ہے۔ اس کا تعلق سورۃ الصّف کی آخری آیت سے جڑتا ہے کہ وہ جمعیت اس طور سے فراہم ہوتی ہے کہ کوئی داعی پکارتا ہے: ’’مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ؟‘‘ اور دوسرے اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے یہ اقرار کرتے ہیں: ’’نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ!‘‘ یہ اس جماعت کی ترکیب اور اس کا synthesis ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلے داعیانِ حق انبیاء و رُسل تھے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ’’مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ‘‘ کی ندا لگائی ﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ اب یہاں اُس کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آج یہ کام محمدؐ رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں‘ دین کو غالب کرنا اصلاً ان کا فرضِ منصبی ہے۔ جیسے دین کی تبلیغ اصلاً ان کا فرضِ منصبی ہے‘ اُمتی جو بھی اس میں حصّہ لے رہا ہے وہ آپؐ کی جانب سے (on his behalf) لے رہا ہے اور اس کام میں آپؐ کا مددگار بنا ہے۔ آپؐ کے سب ساتھی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں آپؐ کے اعوان و انصار بنے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں مَیں نے بارہا عرض کیا ہے کہ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے بعد وہ اس پیغام کو آگے پہنچانے پر جس طرح کمر بستہ ہوئے اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ وہ ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی دعوت و تبلیغ سے اسلام لائے۔ لیکن یہ ذمہ داری اصلاً محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے جبکہ آپؐ کے ساتھی درحقیقت آپؐ کی جانب سے اس

فرض کو ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح غلبۂ دین کی ذمہ داری اصلاً تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے اور جو حضرات بھی آپؐ کے ساتھ آئے ہیں ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ وہ آپؐ کے اعوان و انصار ہیں، آپؐ کے مددگار ہیں، آپؐ کے دست و بازو بنے ہیں۔

اس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک تو وہ حیثیت ہے کہ جو تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اب یہاں ایک اور نسبت قائم ہو گئی اور وہ امیر اور مأمور کی نسبت ہے۔ انفرادی طور پر نبی اکرم ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بہت سی نسبتیں قائم ہوئیں۔ جیسے حضور ﷺ کے ساتھ ایک نسبت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے، یہ شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ ایک نسبت آپؐ کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے، یہ داماد اور خسر کی نسبت ہے۔ مختلف نسبتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، داماد اور خسر کی نسبت بھی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی آپؐ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو نسبتیں قائم ہوئیں وہ یہ ہیں کہ حضور ﷺ امیر ہیں اور تمام صحابہؓ مأمور ہیں، حضور ﷺ حاکم ہیں اور باقی سب لوگ آپؐ کا حکم تسلیم کر رہے ہیں، حضور ﷺ اس ریاست کے چیف جسٹس ہیں، اور تمام صحابہؓ اپنے نزاعات آپؐ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اگر دو مسلمان کوئی مقدمہ لے کر آپ ﷺ کی عدالت میں پیش ہوئے ہیں تو اس وقت ان دونوں کی آپس میں نسبت مدعی اور مدعا علیہ کی ہے، جبکہ دونوں کے لیے منصف، جج اور قاضی کی حیثیت آپؐ کی ہے۔ تو یہ اضافی نسبتیں تھیں جو آپ ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قائم ہوئیں۔ اسی طرح ایک نسبت اس جماعت میں امیر اور مامور کی ہے جو آپؐ اور صحابہؓ کے مابین قائم ہوئی۔ لیکن یہ کہ اس کا اصل synthesis یہ ہے: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ''۔ اور اس کا ربط پھر ذہن میں قائم کر لیجیے ''مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ؟'' اور ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ'' کے ساتھ۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے آئندہ جو بھی جماعت قائم ہوگی اس کے لیے بنیاد ہمیں قرآن و سنت ہی سے اخذ کرنی ہے۔ اس لیے کہ ہمیں اتباع تو آپؐ ہی کا کرنا ہے، پیروی آپؐ ہی کی کرنی ہے، اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جتنی پیروی کی جا سکے

کرنی ہے۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے کہ اب جو کوئی بھی اس جدوجہد کے لیے کھڑا ہوگا وہ داعی تو ہوگا نبی نہیں ہوگا۔ اس حیثیت کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جائے۔ وہ سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ کسی غزوہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اپنے نائب یا خلیفہ کے طور پر مدینے میں مقیم رہنے کا حکم دیا۔ اب جنگ پیش آ رہی ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم شرکت کے لیے جا رہے ہوں، جان کی بازی لگانے کا موقع مل رہا ہو اور حضرت علیؓ مدینہ میں رہیں، یہ بات آپؓ کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے شکوہ کیا کہ آپؐ مجھے یہاں خواتین کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں! اس پر آپ ﷺ نے دلجوئی کے لیے فرمایا کہ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی؟ سوائے اس فرق کے کہ نبوت مجھ پر ختم ہو چکی ہے، وحی کا معاملہ بند ہو چکا ہے۔ یعنی اس تشبیہ سے کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ حضرت علیؓ حضرت ہارونؑ کی طرح نبی بھی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ساتھ ہی یہ صراحت فرما دی کہ مبادا لوگ اس کو حضرت علیؓ کی نبوت کے لیے دلیل بنا لیں۔ اگرچہ لوگوں نے تو حضرت علیؓ کو خدا تک بنا لیا، لیکن اگر حضور ﷺ نے یہ صراحت نہ فرمائی ہوتی تو کچھ لوگوں کے لیے اس کا امکان بھی پیدا ہو جاتا کہ اس قولِ رسولؐ کی بنیاد پر ان کی نبوت ثابت کر دیں۔ چنانچہ ایک بات ہمیشہ مستحضر رہنی چاہیے کہ معصومیت ختم ہو چکی، وحی کا دروازہ بند ہو چکا، نبوت کا سلسلہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا۔ البتہ اقامت دین کے لیے جو جماعت یا تنظیم قائم ہوگی اس کے لیے اگر وہی مسنون نسبت قائم نہ کی گئی تو وہ ''علیٰ منہاج النبوۃ'' نہیں ہوگی، وہ حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر نہیں ہوگی اور اس کا خاکہ ہم نے گویا کہیں اور سے مستعار لیا ہوگا۔ جبکہ ہمیں ہر چیز کے اندر رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنی ہے۔ اتباعِ رسولؐ صرف عبادات میں ہی نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد جو کہ دین کی بلند ترین منزل ہے، اس کے لیے بھی سارا نقشہ وہیں سے لینا ہے۔ لیکن یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اگر کہیں کسی شخصیت کے بارے میں کوئی مبالغہ، کسی کے بارے میں

عقیدت میں کوئی غلو یا کسی کے آداب کو ملحوظ رکھنے میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے گا تو شخصیت پرستی کی بنیاد پڑ جائے گی اور اس طرح ایک نیا فتنہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں باقی pattern وہیں سے لینا ہے' سارا نقشہ وہیں سے اخذ کرنا ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی نوعیت کے ضمن میں ہمیں قرآن وسنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کوئی ایک شخص داعی کی حیثیت سے اٹھتا ہے اور وہ ایک کام کا بیڑا اٹھاتا ہے' اللہ اس کو ہمت دیتا ہے اور اس کے اندر ایک جذبہ ابھارتا ہے۔ اس لیے کہ ہر چیز کا فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی تو اللہ ہی ہے۔ کسی کے دل میں اگر ارادہ پیدا ہوا ہے تو وہ بھی اللہ کا عطا کردہ ہے۔ پھر یہ کہ ایک تو منزل ہے جس کا قصد کیا جا رہا ہے کہ جانا کہاں ہے اور ایک یہ کہ وہ طریق' وہ راستہ کون سا ہے جو ہمیں اس منزل تک پہنچائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ اگر کسی کو انشراح عطا فرماتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ''جا ایں جاست'' بات یہی ہے' حق یہ ہے' تو اس کو جو انشراح ہوا ہے وہی کچھ ذہنوں اور کچھ سینوں کے اندر منتقل ہوگا اور وہ لوگ اب اس کے دست و بازو بنیں گے' اس کی پکار پر لبیک کہیں گے' اس کے ساتھ جڑیں گے۔ ''جوڑ'' اور ''جڑنا'' کے الفاظ ہمارے تبلیغی بھائی بالکل صحیح معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ اب اس ایک فرد کے ساتھ دوسرے افراد کے جڑنے سے اس کے گرد دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ پہلے چار چھ آدمی آئے' پھر اس کے بعد اور بڑھے' پھر اور بڑھے۔

یہ ہے اصل میں وہ فطری ترتیب جو ہمیں انبیاء ورُسل کی دعوت میں ملتی ہے' جبکہ اس کے برعکس اِس دور کا تصور یہ ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر ایک جماعت بنائیں۔ ہمارے ہاں انجمنیں اسی طرح بنتی ہیں۔ انجمنوں کے لیے کوئی داعی نہیں ہوا کرتا' بلکہ کوئی وقت کا تقاضا ہوتا ہے' کوئی ایک وقتی ضرورت ہوتی ہے جس کے تحت انجمن ظہور میں آجاتی ہے۔ انگریز کے زمانے میں محسوس کیا گیا کہ ہندو تعلیم میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں تو اختلافِ رائے ہو گیا تھا' ہمارے علمائے کرام نے

انگریزی پڑھنے کو اور انگریزی علوم حاصل کرنے کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا تھا' لہٰذا مسلمان پیچھے رہ گئے اور ہندو اس دوڑ میں آگے نکل گئے' انگریز کے دربار میں انہیں رسائی حاصل ہو گئی۔ اُس وقت ہر اعتبار سے محسوس ہونے لگا کہ اگر تعلیم کے میدان میں مسلمان کا یہی حال رہا تو پھر وہ صرف پلے دار یا بہشتی بن سکیں گے اور معاشرے کے اندر بالکل پسماندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر ایک جذبہ ابھرا اور پیش نظر تقاضے کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے ''انجمن حمایت اسلام'' بنالی جس کے تحت تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ اسی طرح کئی اور انجمنیں قائم ہوئیں' کسی کے تحت کوئی ہائی سکول قائم ہو گیا' کسی کے تحت کوئی کالج بن گیا' کوئی کالج بن کر یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ گیا۔ وہ درحقیقت ایک جذبہ تھا' وقت کی ایک ضرورت تھی جسے بہت سے لوگوں نے بیک وقت محسوس کیا اور بہت سے لوگوں نے مل جل کر اپنے آپ کو ایک انجمن کی صورت میں منظّم کر لیا۔ اس میں کسی فردِ واحد کی دعوت' اس کا فکر' اس کا انشراح' اس کا پکار بلند کرنا اصلاً فیصلہ کن نہیں تھا۔ تو انجمنیں بھی بلاشبہ ایک طرح کی ہیئت تنظیمی ہوتی ہیں' ان میں سب لوگ مساوی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں' پھر ووٹ کی بنیاد پر کسی کو صدر بناتے ہیں' ووٹ کی بنیاد پر مجلس منتظمہ معین کرتے ہیں اور ان کے مابین حدود و اختیارات اور حقوق میں توازن پیدا کیا جاتا ہے' اس طرح یہ گاڑی چلتی ہے۔

لیکن اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم جماعت کی ہیئت تشکیلی یہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اصل معاملہ داعی و مدعو کا ہے' یعنی ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ'' کی ندا لگانے والے کا اور جو اُس کی ندا پر لبیک کہے اس کا ہے۔ وہ شخص کہ جو آگے بڑھا ہے' جس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ لوگ کہ جو اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے ساتھی بنے ہیں اُن کے آپس میں جڑنے سے وہ جماعت وجود میں آتی ہے۔ تو یہ ایک اہم نکتہ ہے جو قرآن کے ان دو مقامات کے حوالے سے پوری طرح واضح ہو کر ذہن نشین رہنا چاہیے۔ ایک سورۃ الصّف کی آخری آیت: ﴿یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ اور دوسری سورۃ الفتح کی زیرنظر آیت: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ﴾ اس جماعت کی جو تشکیل ہوئی ہے' اس کی جو ہیئت ترکیبی ہے وہ یہی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں'' جنہوں نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا ہے اور حاضر ہو گئے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وصفِ اوّل

ان کا پہلا وصف یہ ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ ''کفار پر بہت سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔'' ظاہر ہے کہ جب وہ ایک ہیئت اجتماعی میں شریک ہو گئے تو اب ایک تفریق ہوئی ہے۔ ایک وہ ہیں جو اس ہیئت اجتماعیہ میں شامل ہیں اور ایک وہ ہیں جو شامل نہیں ہیں' تو ان میں حدّ فاصل قائم ہو گئی۔ پھر یہ کہ جو آ گئے ہیں ان میں بھی حفظِ مراتب ہو گا' سب برابر تو نہیں ہوتے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنا مقام و مرتبہ ہے' عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اپنا مقام و مرتبہ ہے' ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است! صحابہؓ کے اندر تفضیل تو ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں انبیاء و رُسل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ''یہ وہ رسول ہیں کہ بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی''۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اہل سنت کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ بالکل چوٹی پر تو چار خلفائے اربعہ ہیں اور ان میں جو ترتیب خلافت ہے یہی ترتیب فضیلت ہے کہ خلیفۂ اوّل تمام صحابہؓ میں افضل ہیں' پھر خلیفۂ ثانی' پھر خلیفۂ ثالث اور پھر خلیفۂ رابع۔ اس کے بعد پھر چھ حضرات عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ ان کے بعد پھر نیچے اتریں گے تو ۳۱۳ اصحابِ بدر ہیں۔ پھر ذرا اور نیچے اتریں تو ۱۴۰۰ یا ۱۸۰۰ اصحاب بیعت رضوان ہیں۔ اس سے پھر ایک سیڑھی نیچے اتریں تو وہ سب لوگ جو فتح سے پہلے ایمان لائے۔ (فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے یا فتح مکہ' اس میں اختلاف ہے) اور پھر اس کے بعد وہ سب صحابہؓ جو فتح کے بعد ایمان لائے۔ اس کے لیے سورۃ الحدید میں نص بھی موجود ہے:

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً

مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾

''تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بہرحال بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔''

تو یہ فرقِ مراتب اور حفظِ مراتب ان میں بھی ہے کہ جو ''اَلَّذِیْنَ مَعَهٗٓ'' میں شامل ہیں۔ وہ اس جماعت کے افراد ہیں' سب محمد ﷺ کے ساتھی ہیں' ان کے لیے علیحدہ علیحدہ کوئی نام بھی نہیں رکھے گئے' ان میں قانون کے درجے میں کوئی درجہ بندی نہیں تھی' جو اپنے جذبہ سے جتنا قریب آ گیا' جس نے جتنی محنت کی' جس نے جتنی قربانیاں دیں' جس نے جتنا زیادہ وقت صرف کیا' جس نے اپنے آپ کو جتنا چمٹا لیا محمد ﷺ سے اتنا ہی وہ قریب ہوتا چلا گیا اور اتنا ہی پھر حضور ﷺ مشوروں میں ان پر زیادہ اعتماد فرمانے لگے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین'' میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ آپؐ کے کلامِ مبارک میں یہ انداز بکثرت ملے گا: ((جِئْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ)) ''میں آیا اور ابوبکرؓ آئے اور عمرؓ آئے۔'' اسی طرح ((ذَهَبْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ)) ''میںؐ بھی گیا تھا اور ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی۔'' چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو دو حضرات ہیں ''صاحبین'' یہ تو گویا ہر وقت سائے کی طرح حضور ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے اور جب بھی کوئی مشورہ ہوتا تو اوّلیت انہی کو حاصل ہوتی۔ اسی طرح ایک فطری ترتیب تو وہاں قائم تھی' لیکن کوئی قانونی ترتیب قائم نہیں کی گئی۔ بہرحال ایک حد بندی تو یہ ہو گئی کہ جو آپؐ کے ساتھ نہیں ہیں وہ علیحدہ ہیں اور جو ساتھ ہیں وہ علیحدہ۔

پھر جس طرح ان ساتھ والوں میں درجہ بندی اور حفظ مراتب ہے اسی طرح ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد'' کے مصداق جو آپؐ کی جماعت میں شامل نہیں' جو باہر ہیں وہ بھی سب برابر نہیں ہیں۔ باہر تو ابوطالب اور مطعم بن عدی بھی ہیں' لیکن دونوں شریف لوگ ہیں' حضور ﷺ کی مخالفت نہیں کر رہے' بلکہ تعاون ہی کر رہے

ہیں۔ وہ لوگ بھی ابھی ساتھ نہیں آئے تھے کہ جو شعب بنی ہاشم میں پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر کے رات کے وقت جا کر کچھ کھانے پینے کا سامان پہنچاتے تھے۔ ان میں حکیم بن حزامؓ ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تو جو باہر ہیں ان میں بھی درجہ بندی ہوگی۔ ایک وہ ہیں جو ساتھ تو نہیں ہیں لیکن معاند اور مخالف بھی نہیں ہیں، دشمن نہیں ہیں، ایذا پر کمر بستہ نہیں ہیں اور ایک وہ ہیں کہ جو مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ اب ان میں بھی ہر ایک کا الگ درجہ ہوگا۔ کسی میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں سے عناد، بغض اور دشمنی آخری درجے کو پہنچی ہوئی ہے، جیسے ابوجہل اور ابولہب ہیں، چاہے وہ انتہائی قریبی رشتہ دار ہیں۔ ابوجہل کا قبیلہ ایک ہے مگر گھرانہ ایک نہیں ہے، لیکن ابولہب کا تو قبیلہ، گھرانہ اور خاندان وہی ہے۔ اس کا حضور ﷺ کے ساتھ چچا اور بھتیجے کا رشتہ ہے۔ لیکن جس طرح ابوجہل دشمن ہے اتنا ہی ابولہب بھی ہے۔ تو یہ درجہ بندی بھی ذہن میں رکھیں۔ اور اسی کے اعتبار سے اب نسبت بدل جائے گی۔ پہلی چیز جو اِس اجتماعیت کی تقویت کے لیے لازم ہے وہ یہ کہ دلی تعلق کا معیار اب اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ جو اجتماعیت ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے اس مقصد کے ساتھ جتنی گہری وابستگی (commitment) اور جتنا گہرا دلی تعلق ہے اس کا ظہور ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے حوالے سے جو لوگوں میں تقسیم ہوئی ہے اور درجہ بندی ہوئی ہے اس کا عکس اگر اس جماعت میں نظر آئے تب تو درحقیقت ظاہر و باطن اور قول و عمل میں ہم آہنگی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی اس مقصد کے ساتھ وابستگی صحیح نہیں ہے۔ آپ دعویٰ ضرور کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مقصد آپ کے احساسات میں جذب نہیں ہوا، ورنہ جس کو یہ مقصد جتنا عزیز ہوا اتنا ہی وہ آپ کو عزیز اور محبوب ہونا چاہیے اور جو اس مقصد سے جتنا دور ہے وہ اتنا ہی آپ کے دل سے دور ہونا چاہیے۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ایک ہمارا ظاہری برتاؤ ہے، اس میں قانون کا معاملہ ہوگا، کون باپ ہے، کون ماں ہے، کون دوسرے درجہ پر ہمارا عزیز ہے اور اس کے کیا حقوق ہیں۔ جیسا کہ والدین کے معاملے میں فرمایا کہ وہ تمہیں شرک پر

مجبور کر رہے ہوں تو تمہیں ان کا کہنا نہیں ماننا، لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہ اُن کے سارے حقوق ساقط ہو جائیں گے، بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک اسی طرح برقرار رہے گا ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾۔ اسی طرح بھائیوں کا یا دوسرے رشتہ داروں کا معاملہ ہے کہ ان کے جو بھی حقوق ہیں وہ ادا کیے جائیں۔ خاص طور پر جب معاملہ مسلمانوں کے مابین آ جائے گا تو جو بھی مسلمان کے قانونی حقوق ہیں وہ ادا کرنے ہوں گے۔ اور پھر شریعت میں قرابت دار مسلمان کا حق فائق ہے، وہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ لیکن ایک دلی تعلق ہوتا ہے، اس کے مستحق وہ ہیں جو آپ کے ہم مقصد ساتھی ہیں۔ اگر تمہارا قلبی میلان ان لوگوں کی طرف ہے جو اس مقصد میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں، جو اس سفر میں تمہارے ہم سفر نہیں ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر اس سفر کی قدر و قیمت ہی منکشف نہیں ہوئی، اس کی حیثیت کو تم نے جانا ہی نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الحج:۷۴) ''انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنی چاہیے۔'' اللہ کا اندازہ نہ کیا جیسا کہ اندازہ کرنا چاہیے۔

اس سارے معاملے کا دار و مدار ہمارے value system پر ہوتا ہے کہ کس چیز کی آپ کی نگاہ میں قدر و منزلت ہے، اسی کے اعتبار سے آپ کا رویہ طے پائے گا۔ اگر آپ نے اس کام کی قدر کو سمجھا ہے تو پھر ان لوگوں کی قدر و منزلت آپ کی نگاہ میں ہوگی اور ان سے محبت ہوگی جو آپ کے اس کام میں شریک ہیں، آپ کے دست و بازو ہیں، آپ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، جن کو آپ رفیق، کامریڈ، colleague، ہم سفر اور ہم مقصد ساتھی کہتے ہیں، اور آپ کی محبت ان کے ساتھ نہیں ہوگی جو آپ کے ساتھ نہیں ہیں، جو اس مقصد کے دشمن ہیں، جو اس کے ساتھ بغض وعناد رکھتے ہیں، جو اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں، اب ان کے ساتھ تو کسی درجے میں مودّت کا معاملہ بھی نہیں رہے گا، بلکہ حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ بالقوۃ (potentially) دشمنی کی نسبت قائم ہوگی۔ اس لیے کہ دوستی اور دشمنی کا معیار تو اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ جو اللہ کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے، جو اللہ کے دین کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے، چاہے وہ اپنے

آپ کو مسلمان کہلاتا ہو' چاہے وہ ہمارا بھائی یا بیٹا ہو' خواہ وہ ہمارے عزیز رشتہ دار ہوں۔ تو جہاں تک وہ لوگ ہیں کہ جو مخالفت پر کمر کس چکے ہوں ان کے باب میں ''اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ'' کا معاملہ ہوگا۔ یعنی بہت بھاری ہیں ان پر جو انکار کرنے والے ہیں' معاند ہیں۔

یہ وضاحت اس لیے کر رہا ہوں کہ سورۃ المُمتحنۃ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا کہ جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا' انہوں نے تمہارے خلاف کوئی جتھا بندی نہیں کی' ان کے ساتھ حسن سلوک ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ جن سے تمہیں شدت کے ساتھ روکتا ہے ان کی دوستی اور محبت سے باز آ جانا ایمان کا لازمی و بنیادی تقاضا ہے' اگر اس کو بھی پورا نہیں کرتے تو اصل میں تمہارا ایمان مشکوک ہو جائے گا۔ تو ان لوگوں کے ساتھ محبت' اخوت اور دوستی کا کوئی رشتہ برقرار رہنا ایمان کے منافی ہے کہ جو دین کے خلاف جتھا بندی اور محاذ آرائی کر رہے ہیں' جو جنگ میں تمہارے مدّ مقابل بن کر آئے ہیں۔ اب اس بنا پر کہ تمہارے ان سے خاندانی روابط تھے' یا تم کبھی ان کے حلیف رہے ہو' یا ان سے کوئی خونی رشتہ ہے' ان سے تمہاری محبت قائم رہی تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تمہاری محبت سچی نہیں ہے۔ تو یہ فرق و تفاوت قرآن نے کیا ہے۔ یہاں چونکہ اجمال ہے اس لیے وہ فرق یہاں بیان نہیں ہوا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو دوسرے مقام کے حوالے سے کھول کر بیان کر دوں کہ یہ صفات ایک دوسرے کا عکس ہیں: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾ کہ جو بھی مخالفین و معاندین ہیں ان پر بہت بھاری ہیں اور جو اپنے شریک سفر' ہم مقصد ساتھی ہیں ان کے لیے بہت نرم ہیں۔

بھاری یا سخت ہونے کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ ہر وقت ان کے درپے آزار رہنا اور ہر وقت ان کی جڑ کاٹتے رہنا۔ بھاری ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ یہ لوگ اپنے موقف پر بہت سخت ہیں' ڈٹے ہوئے ہیں' ان کو ہلانا آسان نہیں ہے۔

مخالفین و معاندین ایسے محسوس کریں جیسے ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ ان میں تو انگلی دھنسانے کا کوئی موقع نہیں ہے' یہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ جدھر ہم چاہیں انہیں موڑ لیں' ذرا سی کچھ خاطر مدارات کر کے ان کو اپنی طرف راغب کر لیں' ان کی ذرا سی تالیفِ قلب کریں اور انہیں اپنے مقصد سے منحرف کر دیں۔ نہیں' یہ بہت بھاری ہیں' چٹان کی مانند اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں' جس طرح کوہِ ہمالہ کو ہلانا ممکن نہیں ایسے ہی ان کو ہلانا بھی ممکن نہیں۔ جبکہ آپس میں یہ بہت رحیم اور شفیق ہیں۔ ان کا اپنا کوئی ساتھی آ کر اگر اپنی کوئی ضرورت بیان کرتا ہے تو ﴿یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ﴾ (الحشر:۹) کے مصداق وہ اسے خود اپنی ذات پر ترجیح دیں گے' چاہے خود تنگی میں ہوں' خود اس شے کی زیادہ احتیاج رکھتے ہوں' لیکن وہ اپنے بھائیوں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھیں گے۔ یہ ہے ان کا باہم مہربان ہونا' رحیم ہونا' شفیق ہونا۔ اور اصل میں رفیق کا بنیادی مفہوم یہی ہے۔ رفق کہتے ہیں دل کی نرمی کو۔ حدیث شریف میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((مَنۡ یُحۡرَمِ الرِّفۡقَ یُحۡرَمِ الۡخَیۡرَ))(۱) ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا''۔ رفیق اصل میں وہی کہلائیں گے جو باہم ایک دوسرے کے لیے نرم ہوں' جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نرم گوشے ہوں' جو ایک دوسرے کی تکلیف پر تڑپ اٹھیں' ایک دوسرے کے درد کو اپنے اندر محسوس کریں۔ تو یہ پہلا وصف ہے اس جماعت کے ''رفقاء'' کا جو اقامت دین کی کٹھن وادیوں میں قدم رکھنے کی تیاری کر رہی ہو' جو اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

تواصی بالحق اور اس کی بلند ترین منزل

ہمارے منتخب نصاب نمبر ایک کا حصّہ چہارم تواصی بالحق اور حصّہ پنجم تواصی بالصبر سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ ان دونوں حصّوں کے درمیان ایک خلا تھا جو اِس منتخب نصاب نمبر۲ کے ذریعے پُر ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ تواصی بالحق کے ضمن میں مَیں یہ بات

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل الرفق۔

عام طور پر بیان کیا کرتا ہوں کہ حق کا لفظ بہت وسیع ہے۔ حق چھوٹا بھی ہے اور حق بڑا بھی ہے۔ کسی نے کسی کے پانچ روپے دینے ہوں اور وہ نہ دے رہا ہو اور آپ جا کر تلقین کریں کہ بھائی وہ پانچ روپے جو تمہارے ذمہ ہیں ادا کرو' تو یہ بھی تواصی بالحق ہے۔ کوئی بچہ گلی میں کھیل رہا ہو' جو کہ اصلاً کھیلنے کی جگہ نہیں ہے' اور اس سے گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا اندیشہ ہو تو اس بچے کو یہ سمجھانا کہ بیٹا یہاں مت کھیلو' یہ بھی تواصی بالحق ہے۔ کوئی نوجوان اپنے والدین کے حقوق ادا نہ کر رہا ہو تو اسے یہ تلقین کرنا کہ اپنے والدین کے حقوق پہچانو اور ادا کرو' یہ بھی تواصی بالحق ہے۔ لیکن سب سے بڑا حق یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے' جائز حکمران صرف وہ ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

اب اس حق کا اعلان کرنا اور پھر اس حق کو فی الواقع بروئے کار لے آنا کہ ''حق بحق دار رسید'' کا معاملہ ہو جائے' جسے احقاقِ حق کہا جائے گا' یہ تواصی بالحق کی سب سے اونچی منزل ہے اور یہی بندۂ مؤمن کے فرائض دینی کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ اس کو ہم ''تکبیر ربّ'' سے بھی موسوم کرتے ہیں اور اقامت دین سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس کو ''اظھارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے لیے قرآن میں ''وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جسے آنحضورﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا بات ایک ہی ہے۔

آیۂ مبارکہ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ قرآن حکیم میں تین مقامات پر آئی ہے۔ سورۃ التوبۃ (آیت ۳۳) اور سورۃ الصّف (آیت ۹) میں آیت کا اختتام ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾ کے الفاظ پر ہوتا ہے' جبکہ سورۃ الفتح میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝۲۸﴾ ''اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ''۔ اس سے ایک اضافی بات سامنے آتی ہے۔ اگرچہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ''لِیُظْهِرَهٗ'' میں ضمیر فاعلی اور ضمیر مفعولی کے جتنے ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں ان

سب کو پیش نظر رکھنے کے باوجود مراد اور معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' لیکن اس آیۂ مبارکہ میں ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝۲۸﴾ کے الفاظ نے معین کر دیا ہے کہ یہاں ضمیرِ فاعلی میں ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ہی مراد ہو سکتے ہیں' اللہ نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ اللہ کو تو بطورِ گواہ لایا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ گواہ اس فعل کا خود کرنے والا نہیں ہوتا' وہ کوئی نہ کوئی اُس کا غیر ہو گا۔ ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝۲۸﴾ کے دونوں مفہوم ممکن ہیں۔ ''کافی ہے اللہ بطورِ گواہ'' یا ''کافی ہے اللہ بطورِ مددگار''۔ شہید کا لفظ قرآن مجید میں مددگار کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں چیلنج کے انداز میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۲۳﴾

''اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس کے مانند ایک سورت ہی بنا لاؤ' اور بلا لو اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو''۔

بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں ''لِیُظْهِرَهٗ'' کا فاعل اللہ نہیں ہے بلکہ محمدٌ رسول اللہﷺ ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگرچہ اُمت کے نمائندہ کی حیثیت سے اور داعیٔ اوّل کی حیثیت سے محمدٌ رسول اللہﷺ کو نمایاں کیا گیا ہے' لیکن یہ کام تنہا ان کے کرنے کا نہیں ہے۔ سورۃ الصّف میں اس بات کا اضافہ اس طور سے کیا گیا کہ اس آیت کے بعد اہل ایمان کو پکارا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

''اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو''۔

اس میں شک نہیں کہ دین کا غلبہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے' لیکن اس کے لیے تن من دھن کھپانا اُن کی ذمہ داری ہے جو اللہ پر اور محمد ﷺ پر ایمان کے مدعی ہیں۔ لہٰذا یہ ایک اجتماعی جدوجہد ہو سکتی ہے' اس کے بغیر اس مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ یہاں سورۃ الفتح میں اس کو واضح کر دیا یہ الفاظ لا کر: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ﴾ یعنی یہ ایک اجتماعی جدوجہد ہو گی محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور اُن کی جو اُن کے ساتھ ہیں (رضی اللہ عنہم)۔ گویا اس جدوجہد کے لیے ایک مضبوط اور منظم جماعت ایک ناگزیر تقاضے اور شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کے اَبعادِ ثلاثہ

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی اس جماعت کے رفقاء کے مطلوبہ اوصاف کے ضمن میں 3-dimensional space کا تصور ذہن میں رکھئے!

ہمارے بین الانسانی علائق میں جو خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے اس میں بھی وہی 3-dimensional space کا تصور سامنے آتا ہے۔ اس کا آغاز دو افراد سے ہوتا ہے۔ جب اولاد ہو جاتی ہے تو بُعد ثانی (2nd dimension) کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اولاد میں کثرت ہوتی ہے تو ان کے مابین رشتۂ اخوت قائم ہوتا ہے۔ یہ اس ادارے کا بُعد ثالث (3rd dimension) ہے۔ اسی طرح جو جماعت اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کمر کسے اس کے مطلوبہ اوصاف کو بھی آپ اَبعادِ ثلاثہ (3-dimensions) کے حوالے سے سمجھ لیں۔ اس میں اوّلین dimension جہاد ہے' جو مال سے بھی ہو گا اور جان سے بھی۔ اسے آپ انفاقِ مال اور بذلِ نفس کہہ لیں یا جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہہ لیں' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں بتمام و کمال وضاحت سے آ چکی ہے۔ سورۃ الصّف میں ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ''اظھارُ دینِ الحق'' کی آیت مبارکہ سے کچھ ہی پہلے یہ آیت آئی ہے:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ

وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبیؐ!) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے عزیز و اقارب' تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں' تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔''

پھر اس جہاد سے کنی کترانے پر جو سزا نفاق کی صورت میں ملتی ہے اس کا تذکرہ بھی منتخب نصاب میں سورۃ المنافقون اور سورۃ الحدید میں آ چکا ہے۔ اس جہاد کے لیے ابتدائی طریقۂ کار اور اساسی منہاج سورۃ الجمعہ میں بیان ہو گیا کہ ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ یعنی یہ سارے کا سارا کام قرآن حکیم ہی کے ذریعے ہو گا۔ پھر اس جہاد میں صبر و مصابرت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصّہ پنجم ان ہی مباحث پر مشتمل ہے۔ تو ایک dimension تو وہاں آ چکی۔

اب آیئے دوسری dimension کی طرف۔ ویسے تو عام اخلاقی اور معاشرتی و سماجی سطح پر اور دین کے اصل خلاصے اور لب لباب کی حیثیت سے وہ دو چیزیں بھی ہمارے منتخب نصاب میں آ چکی ہیں' یعنی اوّلاً مسلمانوں کا باہمی رشتۂ اخوت سورۃ الحجرات میں بیان ہو چکا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ''مؤمن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔ اور ثانیاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اس کے لیے خاص طور پر نماز کی اہمیت بھی قرآن حکیم کی روشنی میں بیان ہو چکی۔ سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں نماز کو تعمیر سیرت کی اساسات میں سے اہم ترین اساس کی حیثیت سے بیان کیا گیا۔ سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع میں الفاظ

آ گئے : ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۳) ’’اے اہل ایمان! صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو‘‘۔ ان دونوں dimensions میں سے ایک کا تعلق اپنے ہم مقصد ساتھیوں سے اور ایک کا تعلق اللہ سے ہے جس کے لیے یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی ایک اضافی شان اس سطح پر آ کر نمایاں ہونی چاہیے۔ چنانچہ ان دو اضافی شانوں کے لیے یہ مقامات ہم نے اس منتخب نصاب (۲) میں شامل کیے ہیں۔ یہ دو dimensions سورۃ الفتح کی زیر مطالعہ آیت میں بڑی خوبصورتی سے آ گئیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ﴾۔ اصل میں تو یہاں ’’رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ‘‘ ہی بیان کرنا مقصود ہے‘ لیکن **تُعرفُ الاشیاء باضدادھا**‘ کسی بھی شے کو اس کی ضد کے حوالے سے صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عام اسلوب یہ ہے کہ نفی پہلے ہوتی ہے‘ اثبات بعد میں۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ﴾۔ وقت کی کمی کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات یہاں بیان نہیں کیے جا سکتے‘ لیکن آپ ان واقعات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہا تھا کہ غزوۂ بدر کے دوران اگر تم میری تلوار کی زد میں آ جاتے تو کبھی نہ چھوڑتا۔ غزوۂ بدر میں رشتۂ ایمانی کے مقابلے میں سب رشتے کٹ گئے تھے اور ماموں بھانجا‘ چچا بھتیجا‘ بھائی بھائی اور باپ بیٹا ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس جدوجہد میں اگلا قدم اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ مؤمن کامل صرف وہی ہے جس کی محبت اور نفرت کا معیارِ واحد صرف اللہ رہ جائے۔ فرمایا:

((مَنۡ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبۡغَضَ لِلّٰهِ وَاَعۡطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسۡتَكۡمَلَ الۡاِیۡمَانَ))(۱)

’’جس نے محبت کی تو صرف اللہ کے لیے‘ کسی سے بغض وعداوت رکھی تو صرف اللہ کے لیے‘ کسی کو کچھ دیا تو صرف اللہ کے لیے اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لیے‘ اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی‘‘۔

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب السنۃ‘ باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

اب یہ تمام چیزیں ہمارے دروس وخطابات میں تفصیلاً آتی رہی ہیں۔ میں صرف حوالہ دے رہا ہوں۔ اس کو اب 2nd dimension سمجھیں کہ اس اجتماعی جدوجہد میں آ کر یہ رشتہ صرف اخوت ہی نہیں بلکہ رفاقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ رفیق کے لفظ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ’’رِفق‘‘ نرمی کو کہا جاتا ہے‘ اور اس کے لیے اقبال نے کہا ہے؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

لہٰذا اس سطح پر جو کیفیت مطلوب ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لفظ (رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ) اخوت کے لفظ سے بھی زیادہ مناسب ہے۔

اب تیسری dimension ملاحظہ کریں:

﴿تَرٰىهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ۫﴾

’’تم دیکھو گے انہیں تو رکوع وسجود‘ اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔‘‘

’’تَرٰی‘‘ فعل مضارع ہے‘ اس میں حال اور مستقبل دونوں cover ہو جاتے ہیں (تم دیکھتے ہو یا تم دیکھو گے)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ نقشہ بالفعل تھا جسے ہر دیکھنے والا بچشم سر دیکھ رہا تھا‘ اور آئندہ بھی کبھی یہ جدوجہد کامیاب نہیں ہو گی جب تک کہ اس کا ایک عکس اُن لوگوں کے اندر موجود نہ ہو جو اِس کام کا بیڑا اٹھائیں اور اس کا داعیہ لے کر اٹھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کام کا ایک محرک ہوتا ہے۔ اس جدوجہد کا محرکِ واحد اگر اللہ کی رضا نہیں ہے تو اب اس میں ملاوٹ ہو گئی۔ اس کو ہم ایک اعتبار سے شرک سے بھی تعبیر کریں گے‘ اس لیے کہ خلوص واخلاص توحید کا لازمی تقاضا ہے‘ جبکہ ریا اور سُمعہ شرک ہے۔ یہ شرکِ خفی ہے‘ لیکن شرک تو بہر حال ہے۔ حدیث نبویؐ ہے:

((مَنۡ صَلّٰی یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ وَمَنۡ صَامَ یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ وَمَنۡ تَصَدَّقَ یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ))(۱)

(۱) مسند احمد۔

"جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔"

اور یہ حدیث بھی ہمارے دروس میں بارہا بیان ہو چکی ہے کہ قیامت کے روز ایک ایسے شخص کو محاسبہ کے لیے پیش کیا جائے گا جو جہاد فی سبیل اللہ کے دوران مقتول ہوا تھا اور دنیا میں شہید سمجھا جاتا تھا۔ اس سے جب اس کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا جائے گا تو وہ کہے گا: اے اللہ! میں نے تیرے راستے میں جنگ کی تا کہ تو راضی ہو جائے اور میں نے اپنی جان دے دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی یہ بات اس کے مُنہ پر دے ماریں گے اور فرمائیں گے: ((لٰكِنَّكَ قَدْ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ))(۱) "تو نے تو جنگ اس لیے کی تھی کہ کہا جائے کہ تو بہت جری ہے"۔ کہا جائے کہ بڑا جی دار آدمی ہے‘ دیکھو کیسے لڑ رہا ہے۔ ((فَقَدْ قِيْلَ)) "پس وہ کہا جا چکا۔" تمہاری مراد مل چکی‘ اب یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور فرشتوں کو حکم ہوگا اور وہ اسے مُنہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں جھونک دیں گے۔ تو اب یہ جو خلوص و اخلاص ہے کہ یہ کام صرف اللہ کے لیے ہوگا‘ اس کے لیے ضروری ہے کہ بندے کا تعلق مع اللہ مضبوط ہو‘ اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ "تم ان کو دیکھتے ہو رکوع کرتے ہوئے‘ سجدہ کرتے ہوئے"۔ یہ ان کی شخصیت‘ سیرت اور ان کے کردار کا ایک ایسا جزوِ لاینفک بن جاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی نماز کے کھونٹے سے بندھی ہوئی ہے‘ وہ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف ہے۔

فضل خداوندی کا جامع مفہوم

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ "اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مشغول ہیں"۔ اب یہاں دو الفاظ آئے ہیں: اللہ کے فضل کی تلاش اور اللہ کی رضا کی تلاش۔ پہلے تو فضل کو سمجھئے۔ قرآن حکیم کے جو مقامات خود آپ کو مستحضر ہیں

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار۔

ان میں ذرا نوٹ کیجیے کہ فضل کس کس معنیٰ میں آیا ہے۔

سورۃ الجمعۃ میں اس دنیا کے مادی رزق کے لیے بھی فضل کا لفظ آیا ہے۔ ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ......﴾ (آیت ۱۰) "پھر جب نماز ادا ہو جائے تو (اب تمہیں اجازت ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو"، یعنی معاشی جدوجہد میں اب کوئی شے آڑے نہیں ہے‘ تمہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ تو اس دنیا میں انسان کو جو مادی رزق حاصل ہوتا ہے‘ یعنی خوراک اور زندگی کے وسائل و ضروریات‘ یہ بھی فضل ہے۔

سورۃ الجمعۃ ہی میں حضور ﷺ کی بعثت کو اہل ایمان کے لیے اللہ کا فضل قرار دیا گیا۔ اُمیین پر یہ فضل کہ نبی ﷺ اُن میں مبعوث ہوئے ہیں اور آخرین پر یہ فضل کہ وہ بھی اس اُمت میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ سب کیا ہے؟ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ "یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے‘ اور اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے"۔ یہ فضل حضور ﷺ پر ہوا تو سب سے بڑا فضل ہوا: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) "(اے محمدؐ!) آپ پر تو جو اللہ کا فضل ہوا ہے وہ یقیناً بہت بڑا ہے"۔ جو مقام و مرتبہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو عطا فرمایا وہ یقیناً بہت اعلیٰ و ارفع ہے ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! تو یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

تیسرا فضل سورۃ الحدید میں بیان ہوا جہاں جنت کو اللہ کا فضل کہا گیا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾

"دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے‘ جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے‘ اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

اب ظاہر ہے کہ ﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ میں فضل کا پہلا مفہوم تو مراد نہیں ہوسکتا۔ معاشی جدوجہد اپنی جگہ ایک جائز جدوجہد ہے' لیکن اس مقام پر یہ مفہوم سیاق وسباق کے اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔ بقیہ دونوں مفہوم موجود ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ معین طور پر سورۃ الحدید کے حوالے سے جب آپ اس کو سمجھیں گے تو وہ جنت کا حصول ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ادنیٰ نصب العین ہے۔ یہاں اب ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ''صعود'' ہوگا۔ یہ صعودی ترتیب ہے۔ کہیں ترتیب نزولی ہوتی ہے کہ پہلے اعلیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور پھر ادنیٰ کا۔ لیکن یہاں صعودی ترتیب ہے کہ پہلا مقصود جنت ہے' لیکن بلندتر مقصد اللہ کی رضا ہے' جو ایک بندۂ مؤمن کے لیے بلندترین مقام ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صحابہ کرامؓ کے لیے خاص طور پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ''اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے''۔

یہاں یہ بات نوٹ کرلیں کہ ہم پر یہ اللہ کا فضل ہوا ہے کہ ابتدا ہی سے ہم پر یہ بات واضح تھی کہ نصب العین کے درجے میں ہمارے سامنے دنیا کی کوئی شے نہیں ہو گی۔ چنانچہ دین کا غلبہ بھی ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ اس کے لیے جدوجہد ایک فرض ہے' نصب العین نہیں ہے۔ ہمارا نصب العین صرف آخرت کی فوز و فلاح' نجات' کامیابی اور اللہ کی رضا ہے۔ نصب العین کے مقام پر اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شامل کرنا اپنے فکر کے اندر کجی پیدا کرنا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ نماز اور روزہ دونوں فرض ہیں۔ اب ان میں سے ایک کو مقصود سمجھ لینا اور دوسرے کو اس کا ذریعہ قرار دے دینا یہ ترجیح بلامرجح ہو جائے گا۔ یہ تمام فرائض ہیں' نماز اپنی جگہ فرض ہے' زکوٰۃ اپنی جگہ فرض ہے' اقامتِ دین کی جدوجہد اپنی جگہ فرض ہے' دعوتِ دین میں اپنی صلاحیتیں لگانا اپنی جگہ فرض ہے' لیکن ان میں سے کسی ایک فرض کو اٹھا کر نصب العین بنا دینا اور دوسرے کو اس کا ذریعہ بنا کر ایک ثانوی حیثیت تفویض کر دینا یہ بھی ترجیح بلامرجح ہے۔ نصب العین صرف ایک ہے اور وہ ہے اُخروی نجات' جنت کا حصول اور اللہ کی رضا۔ اور ان میں بھی بلندترین شے اللہ کی رضا ہے۔

چہروں پر نورِ بندگی کا ظہور

آگے فرمایا: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ﴾ ''علامت ہے اُن کی اُن کے چہروں پر سجدوں کے آثار سے''۔ اس علامت سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ خداترسی کا نور اُن کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ اب اس ضمن میں خواہ مخواہ کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ آیا کثرتِ سجود سے پیشانی پر جو نشان پڑ جاتا ہے آیا یہ بھی اس میں شامل ہے یا نہیں! اِس دَور کی تفاسیر میں اس موضوع پر آپس میں کچھ نوک جھونک بھی ہوئی ہے' حالانکہ میرے نزدیک وہ بے محل ہے' اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھی یقیناً آثار میں سے ہے' اس کی نفی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی تکلفاً اپنی پیشانی کو خوب رگڑ رہا ہے کہ ذرا نشان اورا بھر آئے پھر تو یہ ریاکاری ہے۔ مزید یہ کہ سجدوں کا صرف وہی ایک اثر چہرے پر نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ تو چہرے کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے کہ مقامِ بندگی کا اس سے ظہور ہو رہا ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے بندے کا چہرہ ہے۔ سجدوں کے آثار کسی معین نشان تک محدود نہیں ہیں' لیکن اس معین نشان کو اس سے زبردستی خارج کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سجدوں کے اثرات بہت وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے چہرے ان کی باطنی کیفیات کی غمازی کر رہے ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شکوہ'' میں کیا خوب کہا ہے۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہے غمازِ چمن!

تو یہ چہرہ جو ہے یہ انسان کی باطنی شخصیت کا ایک عکس لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ﴾ ان کی شناخت یہ ہے کہ ان کے چہروں میں سجدوں کے آثار ہویدا ہوں گے' نمایاں ہوں گے۔

تورات وانجیل میں صحابہ کرامؓ کی مثال

آگے ارشاد ہوا: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ﴾ ''یہ

ہے ان کی مثال تورات میں' اور ان کی مثال انجیل میں''۔ یہاں پھر ترکیب کا معاملہ ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ کے الفاظ میں ترکیبِ نحوی کا فرق پڑتا ہے کہ آیا ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کو مرکب توصیفی مان کر وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کا معطوف علیہ قرار دیا جائے اور دونوں کو جمع کر کے مبتدأ مانا جائے' یا یہ کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' مبتدأ اور خبر سمیت پورا جملہ اسمیہ ہو اور آگے استیناف مانا جائے کہ ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ'' سے نیا جملہ شروع ہو رہا ہے۔ زیر نظر الفاظ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڔ﴾ کے معاملے میں تلاوت میں ہی ایک فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مصحف میں ''التورٰة'' کے بعد بھی تین نقطے لگے ہوئے ہیں اور ''الانجیل'' کے بعد بھی۔ اسے قرآن مجید کی اصطلاح میں ''معانقہ'' کہتے ہیں اور قرآن مجید میں غالباً ایسے چودہ مقامات ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ قاری چاہے پہلے تین نقطوں پر رک جائے چاہے دوسرے تین نقطوں پر۔ چنانچہ یہاں ایسے بھی پڑھا جا سکتا ہے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ﴾ ''یہ ہے ان کی صفت تورات میں''۔ ﴿وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ......الآیۃ﴾ ''اور انجیل میں ان کی مثال یوں بیان کی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے اپنی کونپل نکالی......'' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ اس کو اکٹھا پڑھا جائے اور ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ﴾ کو استیناف مان کر نیا جملہ شروع کیا جائے۔ یعنی یہ دو جگہ جو تین تین نقطے ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے مابین جو عبارت ہے وہ عبارت ماسبق سے بھی جڑ سکتی ہے اور اس کے بعد سے نیا جملہ شروع ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عبارت مابعد سے جڑے اور اس سے پہلے سابق جملہ ختم ہو جائے۔

قرآن حکیم میں سب سے پہلا معانقہ سورۃ البقرۃ کے بالکل شروع میں ہے۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ڔ فِيْهِ ڔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ اب ''فِيْهِ'' کو ماسبق سے جوڑیں گے تو اس طرح پڑھا جائے گا ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں''۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ ''ہدایت

ہے پرہیزگاروں کے لیے''۔ اور اگر ''فِيْهِ'' کو مابعد سے جوڑا جائے تو یوں پڑھا جا سکتا ہے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ﴾ ''یہ بلاشبہ (اللہ کی) کتاب ہے۔'' ﴿فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ ''اس میں ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے''۔ اسی طرح زیر نظر آیت میں اگر ''التَّوْرٰىةِ'' پر وقف کرتے ہوئے یوں پڑھا جائے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو مثال یہاں بیان ہوئی ہے کہ نورِ بندگی سے اُن کے چہرے دمکتے ہوئے ہوں گے اور سجدوں کے آثار اُن کے چہروں میں نمایاں ہوں گے' یہ بات صحابہ کرام ؓ کی علامات میں سے تورات میں آئی ہوگی۔ اور اگلا جملہ اس طرح ہوگا: ﴿وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ﴾ ''اور ان کی مثال انجیل میں یہ بیان کی گئی تھی گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے اپنی کونپل نکالی' پھر اُس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی' پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی''۔ اور اگر یوں پڑھا جائے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی یہ علامت کہ ان کے چہروں میں سجدوں کے آثار ہویدا ہوں گے' تورات میں بھی مذکور ہے اور انجیل میں بھی مذکور ہے۔ اور آگے جو بات شروع ہو رہی ہے وہ مستقبل کی ایک پیشین گوئی ہے کہ اب یہ کھیتی کیسے پروان چڑھے گی اور اس میں کیسے ترقی ہوگی۔ بہرحال یہ دونوں امکانات بالکل مساوی ہیں اور اس میں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مجھے زیادہ انشراحِ صدر اسی دوسرے امکان پر ہے کہ ''الانجیل'' پر آ کر رکا جائے ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ اس لیے کہ ''اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے مصداق آگے آنے والی پیشین گوئی کا ایک معنوی تعلق سورۃ النور میں بیان کردہ وعدۂ استخلاف سے جڑتا ہے: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ (النور: ۵۵) ''وہ لازماً اُن کو اس طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے''۔ ہمارے اس منتخب نصاب (۲) میں یہ مقام بھی آئے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام ؓ کی یہ علامات تورات اور انجیل میں موجود تھیں۔

مستند تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مجموعی اس جماعت کی علامات مذکور تھیں بلکہ بعض اہم افراد کے حلیے تک بھی اہل کتاب کے ہاں موجود تھے۔ چنانچہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے مذہبی راہنماؤں نے اپنی کتابیں ہاتھوں میں لی ہوئی تھیں اور وہ ان میں مذکور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے آثار کو دیکھ رہے تھے۔اور اسی بنیاد پر انہوں نے بیت المقدس کے دروازے کھول دیے۔ بہرحال حضور ﷺ اور ان کے صحابہ کا ذکر سابقہ کتابوں میں موجود تھا اور اُن کے آثار و علامات پیشگی طور پر وہاں مندرج تھے۔

کاشتکار کا دل لبھانے والی خوش منظر کھیتی

اب اُس وقت جو کھیتی بالفعل اپچ رہی تھی اس کا کیا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے : ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ ''(اس جماعت کی مثال) ایک کھیتی کی مانند ہے جس نے پہلے اپنی سوئی (کونپل) نکالی' پھر اُس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی (موٹی ہوگئی)' پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔'' سب سے پہلے کھیتی کی بڑی نرم و نازک کونپلیں اور پتیاں نکلتی ہیں' پھر وہ ذرا اوپر کو آتی ہیں تو ان میں کچھ قوت پیدا ہوتی ہے' پھر یہ ذرا گدراتی ہیں' موٹی ہوتی ہیں' اس کے بعد اپنی نال پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔تو جس طرح کہ ایک کھیتی کا تدریجی منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے اسی طرح یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کھیتی ہے جن میں سے ایک ایک پودے پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جو محنت کی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی صلاحیتیں' آپؐ کی استعدادِ کار اور آپؐ کی محنت و مشقت ان سب کو ذرا ذہن میں رکھئے' جس کے لیے امتناعِ نظیر کی بحث ہے کہ آپؐ کی کوئی مثال ممکن ہی نہیں' اور دوسری طرف اِس امرِ واقعہ کو سامنے رکھئے کہ آپؐ کی مکی زندگی کی دس برس کی محنت کا حاصل ایک سو افراد سے زیادہ نہیں تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کھیتی پر آپؐ کی کتنی محنت ہوئی ہوگی اور اس کا ایک ایک پودا حضور ﷺ کو کتنا

عزیز' کتنا پیارا اور کتنا محبوب ہوگا اور حضور ﷺ کی نگاہ میں اس کی کتنی قدر و منزلت ہو گی۔اس کے بعد جب یہ کھیتی اپچی ہے تو کس کا دل باغ باغ ہوا ہوگا؟ کس کو اپنی نگاہوں کے سامنے اپنی محنت کے ثمرات دیکھ کر خوشی حاصل ہوئی ہوگی؟ ظاہر ہے اُسی کو جس کے خون پسینے سے یہ کھیتی سیراب ہوئی اور سینچی گئی ہے۔فیضؔ نے کہا تھا ؎

دھرتی کے کونے کھدروں میں پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے' پھر اگلی رُت کی فکر کرو!

تو جس نے اس کھیتی کو اپنے خون پسینے سے سیراب کیا ہے اس کھیتی کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ کیوں نہ ہوا ہوگا! اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا : ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ''کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ ان کے ذریعے سے کافروں کا دل جلائے''۔ظاہر ہے کہ وہ کاشتکار جس نے محنتیں کی تھیں' ہل چلایا تھا' جس نے راتوں کو جاگ کر کھیتی کو پانی دیا تھا' اب کھیتی اپچے گی' بہار پر آئے گی تو اس کا دل تو باغ باغ ہوگا۔ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ عربی میں عجیب کے معنی وہ نہیں جو ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں' یعنی کوئی غیر معمولی (unusual) اور abnormal شے' بلکہ عربی میں عجیب شے وہ ہے جو دل آویز ہو' جو دل کو لبھائے' جس کو دیکھ کر انسان خوش ہو جائے۔

اب یہاں ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ کے الفاظ کے ساتھ ہی اس کا عکس بھی بیان فرما دیا: ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ''تاکہ ان کے ذریعے سے کافروں کا دل جلائے''۔اس لہلہاتی ہوئی کھیتی کے ذریعے سے کفار کے دل جلیں۔سیدھی سی بات ہے کہ جو رکاوٹیں ڈالتے رہے' ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے کہ یہ کھیتی نہ اپچے' جنہوں نے قدم قدم پر مخالفتیں کیں' جنہوں نے ان کا راستہ روکنے کی ہر تدبیر اختیار کر لی' اس کھیتی کو ہری بھری دیکھ کر اُن کا دل تو جلے گا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور ہمارے لیے اپنے دلوں کو جانچنے کے لیے ایک معیار ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی کھیتی پر جس کا دل جلتا ہو وہ حقیقت ایمان سے بالکل بے بہرہ ہے۔اگر محمد ﷺ سے تعلق ہے تو اس کھیتی پر جیسے ان کا دل

باغ باغ ہوا ویسے ہی ہر اُس شخص کا دل باغ باغ ہونا چاہیے جسے کوئی تعلقِ خاطر محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض ہو اور دعویٰ محمد ﷺ سے پیار کا ہو تو یہ جھوٹ ہے' اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں۔ یقیناً یہ چیز ایک لٹمس پیپر ہے جو بتا دیتا ہے کہ یہ محلول acidic ہے یا alkaline ہے۔ حضور ﷺ کا وہ خطبہ دراصل اسی معیار کی وضاحت ہے:

((اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ، اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ، لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِيْ، فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ، وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ))(۱)

''میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو' میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو! میرے بعد کہیں ان کو ہدفِ ملامت نہ بنا دینا (اور اُن کو کہیں اپنی تنقیدوں کا نشانہ نہ بنانا)۔ آگاہ ہو جاؤ' جو بھی اُن سے محبت کرے گا وہ درحقیقت میری محبت کے عکس کے طور پر اُن سے محبت کرے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا تو وہ مجھ سے بغض کی وجہ سے ایسا کرے گا''۔

یعنی جس کو مجھ سے محبت ہوگی اس کو میرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت ہوگی اور جس کو مجھ سے بغض ہے درحقیقت وہی ہے جو اُن سے بغض رکھتا ہے۔ ایسے بدبخت کے دل میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے بغض ہے لیکن وہ مصلحت کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتا اور اپنا غصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نکالتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے' معمولی بات نہیں' اس کو اس آیت کے حوالے سے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور دل میں بٹھا لیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولتے رہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو معصوم نہیں سمجھتے۔ معصومیت خاصۂ نبوت ہے' لہٰذا آپ ان کے کسی فعل سے اختلاف کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن یہ بات کہ دل میں ان کی محبت نہ رہے' ان کی عظمت اور قدر کا احساس نہ رہے' یہ درحقیقت ایمان سے محرومی کی علامت ہے۔ ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ اگر ان کو معصوم سمجھیں گے تو اصل میں ختم نبوت کی مہر کو توڑیں گے۔ چنانچہ ابوبکرؓ معصوم

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب فیمن سبّ اصحاب النبیؐ۔

ہیں نہ عمرؓ معصوم ہیں' تا بہ دیگراں چہ رسد! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود کہا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر کہیں میں ٹیڑھا ہونے لگوں تو تم پر لازم ہے کہ مجھے سیدھا کرو! بس یہیں پر فرق واضح ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی شان یہ نہیں تھی کہ لوگ انہیں سیدھا کریں۔ وہاں معاملہ یک طرفہ تھا' وہ لوگوں کو سیدھا کرنے آئے تھے' لیکن معصومیت آپ ﷺ پر ختم ہوئی' اب وہ شان کسی کی نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین تک کا معاملہ یہی ہے کہ اگر وہ دوسروں کو سیدھا کر سکتے ہیں تو کسی وقت ضرورت پیش آ سکتی ہے کہ لوگ انہیں سیدھا کریں۔ اس اعتبار سے اگر اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھیں گے تو گمراہی ہو جائے گی۔
ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی! لیکن ان کی محبت' عظمت' تعظیم اور قدر و منزلت نگاہوں میں ہونا عین لازمۂ ایمان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت و اجرِ عظیم کا وعدہ

آیت کے آخری حصے میں فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴿۲۹﴾﴾ ''اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے''۔ اسی طرح کا ایک وعدہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' سورۃ النور میں اس سے زیادہ گاڑھی شکل میں آیا ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪﴾ (آیت ۵۵) ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ لازماً ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے''۔

یہاں (سورۃ الفتح میں) اس دنیاوی وعدہ کا ذکر نہیں ہو رہا' بلکہ یہاں اُخروی وعدے کا ذکر ہو رہا ہے جو اصل نصب العین ہے۔ اصل بنیاد یہ ہے کہ دنیا میں صحابہؓ کے ساتھ جو وعدہ تھا وہ قطعی تھا اور وہ پورا ہوا' لیکن دنیا میں کسی اور جماعت کے ساتھ یہ وعدہ حتمی اور یقینی نہیں ہے کہ لازماً غالب کر دیے جائیں گے۔ یہ اللہ کے علم میں ہے کہ

کب کسی کام کے لیے کوئی وقت معین ہے اور اس کے لیے کب اس کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں تفویض الامر الی اللہ کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ اور جب نصب العین درست ہو جائے گا تو آپ سے آپ اس میں غلطی کا احتمال ختم ہو جائے گا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بحث سورۃ الصّف میں بھی آئی ہے۔ وہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ''اور ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے (وہ بھی تمہیں ملے گی۔ یعنی) اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح''۔ اس کو دیکھئے کیسے لطیف انداز میں فرمایا: ''تُحِبُّوْنَهَا'' کہ جو تمہیں پسند ہے' جو تم چاہتے ہو۔ یہ تمہاری ایک فطری خواہش ہے۔ ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ جو محنت میں کر رہا ہوں اس کا نتیجہ میں اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھوں۔ اس درجے میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ بھی ہے' لیکن یہ کوئی ضروری شے نہیں ہے۔ تم سے تو یہ مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دو' اور جھونک دو اور اس طرح اپنے خلوص و اخلاص کا ثبوت فراہم کر دو۔ تم ثابت کر دو کہ تن من دھن اللہ سے زیادہ عزیز نہیں تھے۔

سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ ذہنوں میں تازہ کیجیے جہاں ایک میزان قائم کر دی گئی ہے کہ اگر مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو پھر اللہ کا فیصلہ ظاہر ہونے کا انتظار کرو۔ تمہیں یہ ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ مؤخر الذکر تین محبتوں کا پلڑا مقدم الذکر آٹھ محبتوں کے پلڑے سے بھاری ہے۔ اس کا ثبوت فراہم کرنا تمہاری کامیابی کے لیے شرطِ لازم ہے۔ تم نے یہ ثبوت فراہم کر دیا تو تم کامیاب ٹھہرے۔ لیکن دین کو بالفعل غالب کر دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ کتنے انبیاء آئے' انہوں نے اپنا یہ ثبوت دیا اور سرخرو ہو گئے۔ دین غالب ہو یا نہ ہو' اس کی اُن سے باز پُرس نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت میں کس خوش قسمت کے لیے یہ سہرا رکھا ہوا ہے جس کے سر اُسے باندھنا ہے' یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ﴾

(الحج: ۷۵) ''اللہ چن لیتا ہے ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں اور انسانوں میں سے بھی''۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (الانعام: ۱۲۴) ''اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس سے لے اور کس طرح لے''۔ کس کا کیا مقام ظاہر کرنا ہے یہ اس کا فیصلہ ہے۔ تم نے اگر اس کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دیا تو تم سرخرو ہو گئے۔ تمہارا مطلوب و مقصود اور نصب العین آخرت کی فوز و فلاح اور اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس آیت میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ دوسری بات (یعنی تمکن فی الارض) کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ کام حضور ﷺ کے ہاتھوں ہو کر رہنا تھا' سو ہوا۔ پھر اس کے ساتھ خلافت راشدہ کا تتمہ آنا تھا وہ آیا۔ اب غور کیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ثقیفہ بنی ساعدہ میں انصار پورے دعوے اور دلائل کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے کہ خلافت ہمارا حق ہے' ہماری مدد سے یہ صورت پیدا ہوئی' ورنہ مہاجرین بے چارے تو بے یار و مددگار اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دلیل بڑی قوی تھی۔ آپ سوچئے کہ یہ معاملات کتنے حساس اور کس قدر جذباتی ہوتے ہیں' لیکن حضرت ابوبکر صدیق ؓ ایک حدیث نبویؐ سنا رہے ہیں کہ: ((اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ))(۱) اور بات ختم ہو گئی۔

اس ضمن میں یقیناً مشیّتِ خداوندی کو دخل ہے۔ دین کا بالفعل غلبہ اگر ہوگا تو اللہ کے کرنے سے ہوگا۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠﴾ (آیت ۱۷) کہ اے مسلمانو! یہ جو میدانِ بدر میں تم نے ستر سردارانِ قریش مار لیے تو یہ نہ سمجھنا کہ انہیں تم نے اپنے زورِ بازو سے کھیت کر لیا' بلکہ ان کو تو اللہ نے قتل کیا۔ فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ انسان کاسبِ اعمال تو ہے' خالقِ اعمال نہیں ہے' خالقِ اعمال اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ تو ان دونوں چیزوں کو بیک وقت ذہن میں رکھئے۔ اللہ جب چاہے گا اس کے دین کا غلبہ ہو جائے گا۔ اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو تو انسان عجلت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے' پھر by hook or by crook کا

(۱) مسند احمد

معاملہ ہوتا ہے کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلتا ہو تو انگلیاں ٹیڑھی کر کے نکالو' جو راستہ ہم نے پہلے طے کیا تھا اس راستے پر چلتے ہوئے کام نہیں ہو رہا تو کوئی راہِ یسیر (short cut) تلاش کرو' کہیں سے کوئی چھلانگ لگاؤ۔ درحقیقت یہ تمام چیزیں منطقی طور پر نصب العین کے غلط تعین کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بات چھوٹی ہوتی ہے' لیکن اس کے نتائج بہت دور تک جا کر نکلتے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں جو لفظ ''مِنۡهُمۡ'' آیا ہے اس کے بارے میں بھی ایک دقیق بحث ہے کہ یہ ''مِنۡ بیانیہ'' ہے یا ''مِنۡ تبعیضیہ''! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے لوگ اسے ''مِن'' تبعیضیہ قرار دے کر اس سے دلیل پکڑ لیتے ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں ایک بنیادی بات جان لیجیے کہ اس کا ایک بڑا ''وصف لا ینفک'' یہ ہے کہ اس میں اہل زیغ کے لیے بھی پوری غذا موجود ہے۔ جو کوئی کجی کا طالب ہے اس کے لیے بھی اللہ نے اس میں مواد رکھا ہوا ہے اور جو ہدایت کا طالب ہے اس کے لیے بھی اس میں وافر مواد موجود ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا﴾ ''اللہ گمراہ کرتا ہے اسی قرآن کے ذریعے سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اسی قرآن کے ذریعے سے بہتوں کو''۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسے مقامات موجود ہیں جنہیں اہل تشیع نے غلط معنی پہنائے ہیں۔ اسی طرح کا ایک مقام یہ ہے۔ اہل تشیع اسے ''مِن'' تبعیضیہ قرار دیتے ہیں اور اس سے یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ یہ وعدہ تمام صحابہ سے نہیں تھا' بلکہ بعض صحابہ سے تھا۔ حالانکہ یہ ''مِن'' بیانیہ ہے جو کسی کے وصف کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے' یعنی یہ لوگ جن میں ایمان اور عمل صالح کا وصف ہے ان سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں ''مِن'' صرف اخبار کے لیے ہے کہ ان کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے' ان کے وصف کا بیان ہو رہا ہے۔ اوّل تو اسے مِن تبعیضیہ قرار دینا ہی ترجیح بلا مرجح ہے۔ ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ اور اگر بالفرض اس کا احتمال مان بھی لیا جائے تو منطق کے اعتبار سے جہاں احتمال پیدا ہوتا ہے وہاں دو امکانات پیدا ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ دلیل دونوں طرف سے ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔

ایک درجے میں یہ بات اس حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جو بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھا وہ صحابی نہیں تھا' منافقین بھی تو تھے' جو ظاہری طور پر ساتھ تھے۔ آخر وہ مسجد نبویؐ میں حضور ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب امتحان کا کڑا وقت آتا تھا تو ﴿يَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡكُمۡ لِوَاذًا﴾ کے مصداق وہ کھسک جاتے تھے۔ لیکن بہرحال نمازوں میں تو موجود رہتے تھے' اس لیے کہ اس میں تو کوئی جان و مال کی مصیبت نہیں آتی تھی۔ البتہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کسل مندی کے ساتھ۔ طبیعت میں آمادگی نہیں ہوتی تھی' انشراح اور ابتہاج کی کیفیت سے محروم تھے کہ دل کی کلی کھلی ہوئی ہو اور اللہ سے لو لگی ہوئی ہو' جس کو حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((جُعِلَ قُرَّةُ عَيۡنِىۡ فِى الصَّلٰوةِ))(۱) ''میری تو آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔ جہاں کہیں آپؐ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا' کسی چیز پر غور و فکر کرنے کی حاجت ہوتی تھی تو آپؐ فوراً نماز کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ نماز تو کلیدِ مسائل ہے۔ نماز مؤمنوں کے لیے معراج کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن منافقین کی نماز کی کیفیت قرآن حکیم میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ ......﴾ (النساء:۱۴۲) ''اور جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے (کسل مندی کے ساتھ)' محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر''۔ لیکن بہرحال ظاہری طور پر تو وہ اس جماعت میں موجود تھے۔ بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا یہ حال تھا کہ جب بھی حضور ﷺ کوئی خطبہ ارشاد فرماتے تو اس سے پہلے اپنی حیثیت کے اظہار کے لیے کھڑا ہو کر اعلان کیا کرتا تھا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کی بات توجہ سے سنو اور مانو! منافقین کے ظاہر و باطن کا یہی تضاد تھا جسے سورۃ المنافقون میں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَـكٰذِبُوۡنَ ۚ﴾

''(اے نبیؐ!) جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں! اللہ جانتا ہے کہ آپؐ اس کے

(۱) سنن النسائی' کتاب عشرۃ النساء' باب حبّ النساء۔

رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً یہ منافقین جھوٹے ہیں''۔

تو اس اعتبار سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری معیت تو منافقین کو بھی حاصل تھی، لیکن دل کی سچائی، راست بازی اور خلوص و اخلاص کے ساتھ حضور ﷺ کی معیت صرف صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو حاصل تھی۔ گویا آنحضور ﷺ کے ساتھ جو جماعت تھی اس میں چند کالی بھیڑیں بھی تھیں۔ اب اس میں معاملہ نسبت تناسب کا ہو جائے گا۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس میں کالی بھیڑوں کی اکثریت تھی تو وہ بتائے کہ پھر عالمِ واقعہ میں یہ تحریک کامیاب کیسے ہوئی؟ یہ ناممکن ہے، محالِ عقلی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت میں مؤمنین صادقین کی عظیم اکثریت تھی، البتہ کچھ کالی بھیڑیں بھی تھیں، تب ہی تو یہ جدوجہد کامیاب ہوئی ہے، ورنہ کفر کی ساری شیطانی قوتیں اس کی ناکامی پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

بہرحال اس مقام پر ایک حرف ''مِن'' کی بنیاد پر یہ کہہ دینا کہ اس جماعت میں بس چند ہی صاحب ایمان اور مخلص تھے، باقی سب کے سب منافقین تھے (معاذ اللہ)، یہ میرے نزدیک بالبداہت غلط ہے، اور سوائے ان لوگوں کے جو مسلوب التوفیق ہو چکے اور کسی وجہ سے اللہ کی درگاہ سے راندۂ درگاہ ہو چکے، کوئی شخص نہ دل سے اس بات کا قائل ہو سکتا ہے اور نہ زبان سے اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اپنے رسول ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی محبت سے معمور فرمائے اور ہماری ہدایت میں اضافہ فرمائے۔ آمین!

---

(۲)

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ ۙ اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۴﴾﴾ (المائدۃ)

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں اُن لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے کمر کس لیں اور غلبۂ دین کے لیے میدان میں اتریں۔ وہی مضمون نہایت جامعیت کے ساتھ اور اِک ذرا مختلف اسلوب میں سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں آ رہا ہے۔ بلکہ یہاں ایک اضافی حسن سامنے آئے گا۔ میں نے وہاں اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف کے تین اَبعاد (3-dimensions) مکمل کرنے کے لیے سورۃ الصّف سے مدد لی تھی کہ ان تین اَبعاد میں سے ایک سورۃ الصّف کی اس پکار میں سامنے آتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ﴾ یعنی اللہ کی راہ میں مال کا خرچ کرنا اور جان کا کھپانا (انفاقِ مال اور بذلِ نفس) ان کے اوصافِ ثلاثہ میں سے پہلا وصف ہے۔ دوسرا اُن کا یہ وصف ہے کہ کفار کے مقابلے میں بہت سخت ہیں جبکہ آپس میں بہت رحیم ہیں۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾۔ ان کا تیسرا خصوصی وصف تعلق مع اللہ ہے۔ ﴿تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانًا ۫﴾ گویا کہ وہ آیت مبارکہ جو سورۃ الصّف میں آئی ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ تو ان اَبعادِ ثلاثہ میں سے ایک dimension تو اس کے ساتھ متصل ہو کر آ گئی اور بقیہ دو ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ

رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ کے ساتھ متصل ہو کر آ گئیں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں آپ دیکھیں گے کہ یہ تینوں یکجا ہیں۔ گویا کہ مضمون وہی ہے لیکن یہاں مزید جامعیت ہے اور اس میں ایک اضافی حسن موجود ہے۔

مسلمانوں سے قرآن حکیم کا اندازِ خطاب

ارشاد ہوا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے ایمان والو!'' یا بالفاظِ دیگر ''اے ایمان کے دعوے دارو!'' میرے دروس میں بارہا یہ بات آ چکی ہے کہ قرآن مجید میں ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کا صیغۂ خطاب مسلمانوں کے لیے ہے۔ اب مسلمانوں میں مؤمنین صادقین بھی شامل ہیں اور منافقین بھی۔ مسلمانوں میں عزیمت اور ہمت والے بھی شامل ہیں اور رخصتوں پر چلنے والے بھی۔ مسلمانوں میں ضعفاء بھی ہیں اور قوی بھی۔ میرا ذہن حضور ﷺ کی اس حدیث کی طرف منتقل ہوا ہے: ((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ))[1] ''وہ مؤمن جو قوی ہو' ضعیف مؤمن سے بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے''۔ اب یہ قوت اور ضعف بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ظاہری ہوتا ہے اور ایک باطنی۔ ظاہر بات ہے کہ انسان کے جسم و جان میں ظاہری توانائیاں بھی درکار ہیں' تب ہی وہ محنت کر سکے گا' بھاگ دوڑ کر سکے گا۔ مقابلہ پیش آئے گا تو اُس میں بھی قوت و توانائی کی ضرورت ہو گی۔ لیکن ایک انسان کی باطنی قوت یعنی قوتِ ارادی ہوتی ہے جس کو ہم ہمت و عزیمت کہتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا تن و توش تو بہت ہے' گوشت اور چربی کا منوں وزن موجود ہے' لیکن ہمت نام کو موجود نہیں ہے' اور بسا اوقات آپ کو نظر آئے گا کہ جسم بہت ہی لاغر اور بہت ہی نحیف و ناتواں ہے' لیکن اندر جو ہمت و عزیمت ہے وہ کوہِ ہمالہ کے مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہا قرآن مجید میں حضور ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ اے نبیؐ! آپؐ ان کے تن و توش سے متأثر نہ ہوں۔ ﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ

(۱) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوۃ وترك العجز والاستعانة باللہ۔

تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ضعیف و ناتواں' رقیق القلب انسان تھے' لیکن ان میں ہمت و عزیمت جس درجے کی تھی وہ خاص طور پر حضور ﷺ کے انتقال کے بعد ظاہر ہوئی کہ جس قسم کے حالات یک دم پیدا ہوئے اور جس طرح سے ہر طرف سے ایک طوفان اٹھا اس طوفان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس طرح کی عزیمت کا ثبوت دیا اس میں یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بھی مصلحت کا مشورہ دیا تھا کہ کم سے کم مانعین زکوٰۃ کے ساتھ ایک نیا محاذ نہ کھولیے۔ تو اصل میں ہر اعتبار سے قوی اور ضعیف مسلمانوں میں تو گڈ مڈ ہیں' لہٰذا جب قرآن مجید میں ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے تو وہاں یہ معین کرنا پڑتا ہے کہ روئے سخن اصلاً کن کی طرف ہے۔ کہیں وہ مؤمنین صادقین کی طرف ہوتا ہے اور کہیں اصلاً اُس وقت مخاطب منافق ہوتے ہیں' لیکن ان سے بھی قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ نَافَقُوْا'' بلکہ ان سے بھی خطاب ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کہہ کر ہی کیا جاتا ہے' کیونکہ درحقیقت قانوناً وہ بھی مسلمان ہیں اور ایمان اور اسلام کے دعوے دار ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں میں ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کا ترجمہ ''اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو!'' کیا کرتا ہوں' جس کو ترجمہ نہیں ترجمانی کہنا چاہیے۔

ارتداد کا مفہوم اور اس کی اقسام

فرمایا: ﴿مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ ''جو کوئی لوٹ گیا تم میں سے اپنے دین سے''۔ ارتداد کے لفظ کو سمجھ لیجیے۔ رَدَّ' يَرُدُّ کے معنی ہیں لوٹا دینا۔ اسی سے لفظ مردود ہے' یعنی لوٹایا ہوا' جس کو اللہ تعالیٰ کی جناب سے دھکے دے دیے گئے' راندۂ درگاہِ حق۔ اس سے بابِ افتعال میں ''ارتداد'' بنا۔ ارتداد کے معنی ہوں گے خود لوٹ جانا' خود پھر جانا' پسپائی اختیار کرنا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ابھی میں نے قوت و ضعف کا ذکر کیا کہ ایک ظاہری ہے ایک باطنی ہے۔ اسی طرح ایمان سے پسپائی بھی ایک ظاہری ہے ایک باطنی۔ ظاہری پسپائی یا علی الاعلان پسپائی کو ہم عرفِ عام میں یا اصطلاح میں ارتداد

کہتے ہیں۔ ایک شخص کھلم کھلا اسلام سے انحراف کا اعلان کر کے کوئی اور مذہب اختیار کر لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گیا۔ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے جس مسلمان شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں وہ وہاں جا کر عیسائی ہو گیا تھا۔ یہ بالکل ابتدائے اسلام میں ارتداد کا واقعہ ہے۔ پھر جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری دَور ہے اس میں ارتداد شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ نبوت کے دعوے دار صرف حضور ﷺ کے انتقال کے بعد کھڑے نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ ؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں یہ فتنہ سر اٹھا چکا تھا۔ کچھ طالع آزما قسم کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ نبوت کی بنیاد پر محمد ؐ کی دکان تو خوب چمک گئی (معاذ اللہ) اور انہوں ؐ نے کیا کچھ حاصل کر لیا' تو ''آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!'' کے مصداق اگر ہم بھی نبوت کا دعویٰ کریں تو شاید ہمارا دھندا بھی چمک جائے۔ جن کور باطن لوگوں نے اسے حضور ﷺ کا دھندا سمجھا تھا انہوں نے اپنا دھندا جمانے کی کوشش کی۔ اور یہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہوا۔

تو ایک ارتداد ہے اسلام سے علی الاعلان' کھلم کھلا انحراف' کسی اور نبوت کا اقرار یا کسی اور مذہب کو قبول کر لینا۔ اسلام میں اس قسم کے مرتد کی سزا قتل ہے۔ البتہ ایک باطنی ارتداد ہے کہ آدمی اندر ہی اندر مرتد ہو گیا ہو۔ گویا انڈے کے اندر جو کچھ تھا چوزہ تو بن چکا ہے مگر ابھی خول ٹوٹا نہیں ہے۔ قانون کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ جب تک وہ خول نہیں ٹوٹتا اس وقت تک وہ مسلمان شمار ہو گا۔ اندر سے انسان کافر ہو چکا ہو اور قانونی اعتبار سے ظاہراً مسلمان ہو تو یہ باطنی ارتداد ہے جس کو ہم نفاق کہتے ہیں۔ منافق حقیقت میں کافر تو ہو چکا لیکن قانوناً وہ مسلمان رہتا ہے۔ سورۃ المنافقون میں' جو ہمارے منتخب نصاب (ا) میں شامل ہے' الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا......﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ ایمان لائے تھے' پھر انہوں نے کفر کیا......'' لیکن یہ کفر کون سا تھا؟ یہ اعلانیہ کفر نہیں تھا' بلکہ اندر ہی اندر کا کفر تھا۔

سورۃ المائدۃ کی زیر نظر آیت کے سمجھنے میں یہی لفظ ''ارتداد'' رکاوٹ بن گیا ہے' کیونکہ اس کا جو بھی عام مفہوم ہے' یعنی قانونی اور ظاہری ارتداد' اکثر لوگوں نے اسی پر

اس کو محمول کر لیا ہے' حالانکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہے' بلکہ باطنی پسپائی یعنی نفاق مراد ہے جس میں انسان اندر ہی اندر لوٹ رہا ہوتا ہے۔ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ نفاق کی دو قسمیں ہیں' ایک شعوری اور ایک غیر شعوری۔ یعنی آدمی اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے جبکہ اسے خود پتا نہیں ہوتا کہ میں کھوکھلا ہو چکا ہوں اور ایک یہ کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوں' میں نے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا صرف لبادہ اوڑھ رکھا ہے' حقیقت میں اندر سے میں بدل چکا ہوں۔

نفاق کے مراحل و مدارج

غیر شعوری پسپائی یا نفاق کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کی ہمت جواب دینے لگتی ہے کہ اسلام کے تقاضے تو بڑے کٹھن ہیں' یہ تو قدم قدم پر کہتا ہے کہ لاؤ جان حاضر کرو' آؤ نکلو اللہ کی راہ میں نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر۔ یہ معاملہ تو بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اب یہاں سے وہ پسپائی شروع ہو گئی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ معاملہ تو وہ ہے کہ یا تو آپ آگے بڑھیے' ورنہ آپ پیچھے ہٹنا شروع ہو جائیں گے' اس لیے کہ ع ''سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!'' ایک آدمی پیش قدمی کر رہا ہے' آگے بڑھ رہا ہے۔ ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' لیکن کسی وجہ سے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا کہ نہیں بھائی' آگے خطرہ ہے' آگے مشکلات ہیں۔ تو اب یہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو جانا اس کو کھڑا نہیں رہنے دے گا' بلکہ اب ریورس گیئر لگے گا اور وہ لامحالہ پیچھے کی طرف پسپائی شروع کر دے گا' البتہ ابتدائی مرحلہ میں اس کا اعتراف ہو گا کہ میری کمزوری ہے' میں کمزور آدمی ہوں' مجھ سے خطا ہو گئی' میری معذرت قبول کی جائے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں ایسے لوگ حضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف کرتے اور درخواست کرتے کہ حضور ؐ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے' آپ ؐ خود بھی مجھے معاف فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی میرے لیے استغفار کریں۔ اس کو نفاق نہیں کہیں گے' یہ صرف ضعفِ ایمان ہے۔ لیکن اس سے اگلے مرحلے میں اب آدمی جھوٹے بہانے بنانا

شروع کرتا ہے' اپنے طرزِ عمل کی عقلی توجیہہ پیش کرتا ہے اور اس کی justifications دیتا ہے کہ نہیں جی' یہ بات نہیں تھی' مجبوری تھی' میں تم سے کوئی کم نہیں ہوں' یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے جذبے میں کمی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا' بلکہ میری مجبوری تھی' حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ اب جب یہ جھوٹ شروع ہوا تو یوں سمجھ لیجیے کہ ایسے شخص نے ضعفِ ایمان سے آگے بڑھ کر نفاق کی سرحد میں قدم رکھ دیا۔ یہ گویا نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔

نفاق کی دوسری سٹیج تب آتی ہے کہ جب انسان محسوس کرتا ہے کہ جھوٹ بول بول کر اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ میرا اعتبار اٹھ گیا ہے' تو اب وہ اپنے جھوٹ کو جھوٹی قسم سے زیادہ مؤکد کرتا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے''۔ اب ان کا طرزِ تکلم یہ ہوتا ہے کہ خدا کی قسم! یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں صحیح ہے' مجھے واقعتاً مجبوری لاحق تھی۔

نفاق کی تیسری سٹیج وہ آتی ہے کہ جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا راز اب طشت از بام ہو چکا ہے' اب میری قسموں کا بھی اعتبار اٹھ گیا ہے' تو اب طبیعت میں ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور جو لوگ اللہ کے دین کے راستے میں اپنے مال و جان قربان کرتے ہوئے سیدھے آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں ان سے ایک بغض وعناد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہمارے لیے مصیبت ڈالی ہوئی ہے' یہ آگے بڑھتے ہیں تو ہمارا پیچھے رہنا نمایاں ہو جاتا ہے' اگر یہ بھی آگے نہ بڑھیں' سب بیٹھے رہیں تو سب برابر رہیں' ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے' یہ fanatics ہیں' جنونی ہیں' پاگل ہیں' سُفَهَاء ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''اور جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں: کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟'' یہ تو بے وقوف لوگ ہیں' انہیں اپنے خیر اور شر کا پتا نہیں' نفع و نقصان کی فکر نہیں' ہم تو ایسے پاگل اور بے وقوف نہیں ہیں۔ یہ تیسری اور آخری سٹیج ہے' یہ تباہی اور بربادی کی وہ سرحد ہے کہ جس سے اب واپسی کا

کوئی امکان نہیں ہے۔

دین کے تقاضوں سے گریز کا انجام

اصل میں یہی پسپائی ہے جو یہاں (سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں) زیرِ بحث ہے۔ خبردار (warn) کیا جا رہا ہے کہ دیکھو' کہیں اندر ہی اندر ضعفِ ایمان میں مبتلا ہو کر نفاق کے راستے پر نہ پڑ جانا۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص پہلی سٹیج پر ہے تو متنبہ ہو جائے اور واپس لوٹ آئے اس راستے کی طرف کہ ہر چہ بادا باد' اگر دوسری سٹیج پر ہے تب بھی واپسی کا امکان ہے' لیکن اگر تیسری سٹیج پر پہنچ گئے تو اب وہ ''point of no return'' ہے' پھر وہاں سے لوٹنے کا امکان نہیں رہے گا۔ اس لیے آگاہ کیا جا رہا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ......﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! جو کوئی بھی لوٹ گیا تم میں سے اپنے دین سے......'' یعنی اپنے دین کے تقاضوں کو ادا کرنے سے گھبرا گیا۔ ذرا اپنے باطن میں نظر ڈالو' اپنے گریبانوں میں جھانکو! اگر یہ محسوس کرو کہ پسپائی کے عمل کا آغاز ہو گیا ہے تو فوراً ہوش میں آ جاؤ۔ یہاں کلام میں حذف کا اسلوب ہے کہ جو بھی تم میں سے پیچھے پھر جائے گا وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اللہ کا کچھ بگاڑ لے گا۔ یہ مفہوم یہاں پر محذوف یا مقدر (understood) ہے۔ تمہارے پھر جانے سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا' اس لیے کہ اللہ تو کسی اور کو اٹھا لائے گا' وہ کسی اور کو یہ سعادت عطا فرما دے گا۔ وہ تو ایک سعادت تھی جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی تھی۔

منّت منِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

''تم اپنا احسان نہ دھرو کہ تم بادشاہ کی خدمت کر رہے ہو' بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمایا''۔

یہ تو ایک سعادت تھی کہ اللہ نے تمہیں چن لیا' تمہیں پسند فرما لیا' هُوَ اجْتَبٰىكُمْ۔ لیکن اب اگر تم اس سے دستبردار ہو رہے ہو' پسپائی اختیار کر رہے ہو' کم ہمتی کا اظہار کر رہے ہو تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا' اللہ تمہاری جگہ کسی اور کو اٹھا دے گا' وہ پوری کی

پوری قوم کو ختم کر کے کسی نئی قوم کو اپنے دین کا جھنڈا تھما سکتا ہے۔ وہ تو پوری نوعِ انسانی کو ختم کر کے ایک بالکل نئی نسل پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کو ہٹا کر ان سے بہتر افراد لا سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں سارا نقصان تمہارا اپنا ہے' اللہ کا نہ کوئی گھاٹا ہے اور نہ نقصان ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے مطلوبہ اوصاف

فرمایا: ﴿فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ﴾ ''تو عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا''۔ اب اس قوم کے کیا اوصاف ہوں گے؟ وہ آپ کو یہاں تین dimensions نظر آ جائیں گی۔ گویا کہ بالواسطہ تلقین ہو رہی ہے کہ اگر اس راستے پر چلنا ہے تو تمہیں یہ تین اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے ہوں گے۔ یہ اصل میں مؤمنین صادقین کے تین اوصاف کا بیان ہے:

﴿یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ ۙ اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ ؕ﴾ ''(۱) جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ (۲) جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔ (۳) جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے''۔

یہاں ذرا ترتیب اور اسلوب بدلتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ سورۃ الصّف کے حوالے سے پہلے جہاد کا ذکر آیا تھا' لیکن یہاں جہاد آخر میں ہے۔ پھر سورۃ الفتح میں پہلے یہ وصف بیان ہوا: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾۔ یہاں اس کا ذکر بھی بعد میں ہے: ﴿اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ﴾۔ وہاں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ﴾ پہلے ہے ﴿رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾ بعد میں ہے' جبکہ یہاں ﴿اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ پہلے ہے اور ﴿اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ بعد میں ہے۔

پھر وہاں ﴿تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا﴾ کے الفاظ میں تعلق مع اللہ کا وصف آخر میں بیان کیا گیا' یہاں آغاز اس وصف سے کیا جا رہا ہے' لیکن اس کے لیے الفاظ مختلف ہیں: ﴿یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ﴾ ''جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا''۔ یہ ہے اللہ اور بندے کے مابین باہمی محبت کا ایک رشتہ۔ عجیب بات ہے کہ وہاں اس تعلق

مع اللہ کی صرف ایک جہت بیان ہوئی کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ ﴿تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانًا ۫﴾ یہاں اس تصویر کا دوسرا رُخ نمایاں کیا گیا اور اس کا ذکر پہلے لایا گیا۔ اس لیے کہ اللہ اور بندے کے مابین جو بھی نسبت و تعلق ہے وہ دوطرفہ ہے۔ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ بھی بندے سے محبت کرتا ہے۔ بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ بھی بندے کو یاد کرتا ہے۔ ﴿فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ﴾ ''تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ اور حدیث قدسی میں (جو متفق علیہ ہے) اس کی نہایت پیاری شرح آئی ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور میرا بندہ اگر کسی محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں (یعنی اللہ تعالیٰ ملأ اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کی محفل میں اس بندے کا ذکر فرماتا ہے)۔ اور اگر میرا بندہ بالشت بھر مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں ہاتھ بھر اس سے قریب ہوتا ہوں۔ اور اگر میرا بندہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ تو یہ تعلق مع اللہ کا معاملہ یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دوطرفہ ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اسی طرح کا معاملہ ولایتِ باہمی کا ہے کہ جو اہل ایمان اللہ کے ولی ہوتے ہیں اللہ ان کا ولی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ اہل ایمان کا حامی و مددگار ہے' وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال کر لاتا ہے''۔ اور: ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ''آگاہ رہو! یقیناً جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔ تو یہ موالاتِ باہمی ہے کہ تم میرے دوست بنو تو میں تمہارا دوست ہوں۔ اس اعتبار سے نوٹ کیجیے یہ بڑا پیارا مقام ہے: ﴿یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ﴾ ''اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے''۔

اس جگہ ایک بڑی لطیف بات آئی ہے جو درحقیقت صوفیاء کا موضوع ہے کہ ان مطلوبہ اوصاف میں سب سے پہلے اللہ کی محبت کا ذکر ہوا ہے۔ اصل میں یہ اللہ کا سلیکشن

ہے۔ یہ جان لیجیے کہ پہلے اللہ اپنے کسی بندے کو چنتا ہے اور اس کا چناؤ (selection) ہی اس بندے کے لیے کل خیر کی توثیق کا اصل سبب بنتا ہے۔ اہل جنت کی زبانوں پر جو ترانۂ حمد ہوگا اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ﴾ ''ہم ہرگز ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا''۔ گویا اس نے ہمیں چنا ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ارشاد ہوا: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اب اس میں جو سرور اور کیف ہے یہ سرور دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو آسان کر دے گا۔ یہ کیف وہ ہے کہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی ظاہری نعمت میں وہ کیف اور سرور نہیں ہوگا کہ اللہ نے مجھے پسند فرمایا' اللہ کی نظر عنایت مجھ پر ہے' میں اللہ کی نگاہِ التفات میں ہوں (جیسے نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ ''تم ہماری نگاہوں میں ہو!) مجھے خیر کی توفیق ملی ہے تو زہے نصیب کہ ع قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند! اب اس کیف کو اپنے اوپر طاری کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ چیز انسان کے لیے استقامت کی کتنی بڑی بنیاد بنے گی۔ وہ جو اقبال کہتا ہے کہ ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!'' اسی طرح بندہ اپنی اس حیثیت کا شعور وادراک کرے کہ میرے ربّ کا بلاوا میرے نام آیا ہے' مجھ تک یہ بات پہنچی ہے تو خود تو نہیں پہنچی' کسی کے پہنچائے پہنچی ہے' میرے دل میں نیکی کا یہ ارادہ پیدا ہوا تو از خود نہیں ہوا' اُسی کے پیدا کیے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ درحقیقت محسوس کرنے کی شے ہے' اس کو الفاظ میں بیان کرنا بھی فی الواقع ممکن نہیں ہے۔ ﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ﴾ ''اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے''۔

اقامت دین کی جدوجہد میں اصل نصب العین اور اصل جذبۂ محرکہ یہی ہونا چاہیے۔ یہی ہوگا تو جدوجہد میں دوام ہوگا' ثبات ہوگا' استقامت ہوگی۔ اور اگر یہ نہیں ہے' بلکہ کوئی دنیاوی تبدیلی لے آنا' کوئی انقلاب برپا کر دینا' کوئی نظام درست کر دینا پیش نظر ہے' اور اسی کو کہیں نصب العین کا درجہ دے دیا تو مار کھا جائیں گے۔ پھر وہ استقامت حاصل نہیں ہو سکتی۔ استقامت کی اصل بنیاد یہی ''محبت خداوندی'' ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ''اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت شدید ہیں''۔ یہ جذبۂ محبت موجود ہے تو گویا کہ رُخ صحیح ہوگیا اور انسان کا اصل جذبۂ محرکہ اب خالص ہوگیا۔ ورنہ ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' عبادت کے ضمن میں بھی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ''اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ : غَايَةَ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ'' یعنی ''عبادت کی دو بنیادیں ہیں: اللہ تعالیٰ سے انتہا درجے کی محبت اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی اور پستی اختیار کرنا''۔

اب دوسرا وصف آیا: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''مؤمنوں پر بہت نرم' کافروں پر بہت سخت''۔ یہی وصف سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بایں الفاظ بیان ہو چکا ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ اس سے آپ اس کی اہمیت کا اندازہ کیجیے۔ یہ بارہا کا بیان کردہ اصول ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو مرتبہ ملتے ہیں اور ان میں اکثر و بیشتر ترتیب عکسی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الحج کے آخری رکوع میں شہادت علی الناس کے ضمن میں حضور ﷺ کا ذکر پہلے اور اُمت کا بعد میں ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں اُمت کا ذکر پہلے اور حضور ﷺ کا ذکر بعد میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (آیت ۱۴۳) یہ بات آپ کو قرآن حکیم میں اکثر و بیشتر ملے گی۔ مزید یہ دیکھئے کہ سورۃ الفتح میں ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' پہلے اور ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' بعد میں ہے' لیکن یہاں ''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' پہلے اور ''اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ'' بعد میں ہے۔ ''اَذِلَّةٍ'' جمع ہے ذلیل کی اور ''اَعِزَّةٍ'' جمع ہے عزیز کی۔ ذلیل اور عزیز ایک دوسرے کے اضداد (antonyms) ہیں۔ لیکن ذلیل کا لفظ ہمارے ہاں جس معنی میں مستعمل ہے عربی میں اس کا اصلی مفہوم وہ نہیں ہے' بلکہ ذلیل کے معنی کمزور کے ہیں۔ گویا وہی بات جو میں نے گزشتہ درس میں علامہ اقبال کے شعر کے حوالے سے کہی تھی کہ ع

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

دوستوں کے لیے نہایت نرم خو۔ دوست جو فرمائش کر رہے ہیں ٹھیک ہے' قبول ہے۔ انہوں نے کوئی بات چاہی تو حاضر ہیں' کرنے کے لیے تیار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے بہت ہی نرم اور ڈھل جانے والے ہیں' موم کی طرح پگھل جانے والے ہیں۔ لیکن جب کفار سے مقابلہ ہوگا تو آہنی چٹان ثابت ہوں گے۔ وہاں محسوس ہوگا کہ یہ تو بڑے سخت ہیں' کوئی لالچ (temptation) ان کو ہلا نہیں سکتی' کوئی ایذا رسانی (persecution) انہیں ہراساں نہیں کر سکتی' کوئی ''نصیحت'' ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔ اس سے مراد اس طرح کی نصیحت ہے کہ خواہ مخواہ تم اپنا کیریئر کیوں برباد کر رہے ہو' اپنی زندگی کی فکر کرو' یہ تم کس راستے پر چل نکلے ہو۔ اس طرح کی بڑی بزرگانہ اور بڑی خیر خواہانہ انداز کی نصیحت بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ دھمکی بھی اثر نہیں کر رہی۔

اسی وصف کو حضرت مسیح ؑ نے اپنے حواریین کو ہدایات دیتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں یوں ادا کیا ہے کہ ''سانپ کی مانند ہوشیار لیکن فاختہ کی مانند بے ضرر بنو''۔ یعنی متضاد اوصاف کو بیک وقت جمع کرنا۔ سانپ بہت چوکس' چوکنا اور ہوشیار ہوتا ہے' لیکن وہ دوسرے کو ضرر بھی پہنچاتا ہے' اور فاختہ بے چاری بے ضرر ہے' لیکن ساتھ ہی بہت کمزور بھی ہے' اسے جو چاہے مار لے۔ تو یہ نہ ہو' فاختہ بھی نہ بنو اور سانپ بھی نہ بنو' لیکن سانپ کا ایک وصف تمہیں اپنے اندر لانا ہوگا' یعنی ہوشیار' چوکس' چوکنے رہنا ہوگا۔ کوئی تمہاری غفلت سے فائدہ نہ اٹھا جائے' کوئی تمہیں بھولا سمجھ کر تمہارے اس بھول پن کو exploit نہ کر جائے۔ لیکن تم سے کسی کو ضرر بھی نہ پہنچے۔ اس اعتبار سے تمہیں فاختہ کا وصف اپنانا ہوگا۔ اب یہ اپنی اضداد کے اعتبار سے بہت ہی بلیغ پیرایہ ہے۔ یہاں پر میں نے اس کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ تو ایک طرف نرمی ہے' جیسا کہ ہر وقت' ہر سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار' لیکن کس کے لیے؟ اہل ایمان کے لیے' اپنے

ساتھیوں کے حق میں' اہل ایمان کے حق میں بہت نرم' لیکن مدّمقابل یہ محسوس کرے کہ ان کے اندر تو انگلی دھنسانے کا بھی امکان نہیں ہے' کسی بھی درجے میں ان کو متاثر کر لینے کا کوئی امکان نہیں ہے' یہ تو چٹان کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔

تیسرا وصف وہ ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف کے حوالے سے صفحاتِ گزشتہ میں کیا گیا تھا اور ہمارے اس منتخب نصاب (۱) میں وہ کماحقہٗ بیان ہو جاتا ہے' یعنی جہاد' اور جہاد میں جان و مال دونوں کا کھپانا۔ فرمایا: ﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ اب دیکھئے' قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے' میں نے بھی کسی درجے میں اس اسلوب کو قرآن سے مستعار لیا ہے۔ چنانچہ میری تحریروں میں آپ کو یہ اسلوب ملے گا کہ اگر کچھ باتیں جوڑوں کی صورت میں آ رہی ہیں تو پھر جوڑوں ہی کی شکل میں بات آگے بڑھتی ہے۔ اس آیت میں ''یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ'' بھی ایک جوڑا ہے اور ''اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' بھی جوڑے ہی کی شکل ہے۔ لہٰذا اب جہاد کے ساتھ بھی ایک جوڑا لے آیا گیا: ﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ﴾ ''وہ (ایسے لوگ ہوں گے کہ) اللہ کے راستے میں (اپنے جان و مال کے ساتھ) جہاد کریں گے اور (اللہ کے معاملے میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے''۔

اب یہ ملامت بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ملامت وہ ہوتی ہے جو ڈانٹ ڈپٹ' شرم دلانے' غلطی پر متنبہ کرنے اور احمق قرار دینے پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی یہ انداز کہ غلط جا رہے ہو' یہ صحیح راستہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے' تمہاری مت ماری گئی ہے' جبکہ ایک ملامت ناصحانہ ہوتی ہے کہ دیکھو کچھ فکر کرو' بال بچوں کا خیال کرو' کچھ اپنے مستقبل' اپنے کیریئر کا دھیان کرو' تمہارے والدین نے تمہیں کن ارمانوں کے ساتھ پالا پوسا' تم ان کے دل توڑ رہے ہو' آخر انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر تم کو پڑھایا' اپنے اوپر سختیاں جھیلیں اور تمہاری ضرورتیں پوری کیں' اب تم ان کے ارمانوں کا خون

تو نہ کرو۔ یہ ہے ایک ناصحانہ انداز۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۲ میں اسی ناصحانہ انداز کی طرف اشارہ ہے : ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ﴾ ''اور یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے''۔ تو یہ دو طرح کی ملامت ہے جس سے اس راہ پر چلنے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ بلکہ یہ ناصحانہ' مشفقانہ اور خیر خواہانہ ملامت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ بسا اوقات انسان ڈانٹ ڈپٹ کے مقابلے میں تو اور سخت ہوتا چلا جاتا ہے' لیکن میٹھی چھری کے انداز میں جو کاٹ ہے اس سے بچنا زیادہ مشکل ہے۔ فیض کی شاعری چونکہ انقلابی رنگ لیے ہوئے ہے لہٰذا یہ چیز آپ کو وہاں بھی ملے گی۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

تو غیروں کی طرف سے ناوکِ دشنام تو آئیں گے ہی' گالیاں آئیں گی' الزامات آئیں گے' مگر اپنوں کی طرف سے بھی ہر طرح کی ملامت برداشت کرنا پڑے گی۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ حضرت مصعب بن عمیر ؓ کو ان کے کسی دوست نے حالتِ درویشی میں دیکھا ہوگا تو اُن سے کہا ہوگا کہ تم نے اپنے اوپر کیا ظلم کیا ہے' تمہارا دو دو سو درہم کا جوڑا سل کر آتا تھا' تمہارا پورا لباس معطر ہوتا تھا' تم خوش لباسی اور خوش ذوقی کی ایک علامت بن گئے تھے' جدھر سے تم گزرتے تھے وہ گلیاں معطر ہو جاتی تھیں' لوگوں کی نگاہیں اٹھتی تھیں۔ اور اب تم اس پھٹے پرانے کمبل کے اندر ملبوس ہو جس میں پیوند لگے ہوئے ہیں! حضرت مصعب بن عمیر ؓ کا انتقال اس حالت میں ہوا تھا کہ ان کے جسم پر چادریں بھی دو نہیں تھیں' صرف ایک چادر تھی۔ اس تہہ بند کے ساتھ وہ اللہ کا بندہ لڑ رہا تھا' اور وہ تہہ بند بھی اتنا تھا کہ جب شہادت ہوگئی تو پورے جسم کو ڈھانپ نہیں سکا'

سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ حضور ﷺ کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔ تو وہ کہاں سے کہاں پہنچے! از کجا تا بہ کجا! اور یہ سب کچھ ایک دن میں تو نہیں ہو گیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کم و بیش دس گیارہ برس لگے۔ مکہ میں قبولِ اسلام کے بعد جب انہیں مادرزاد برہنہ کر کے گھر سے نکالا گیا تو اُس وقت ان کے دوستوں کا جو حلقہ ہوگا' انہوں نے کس انداز میں ملامت کی ہوگی۔ چچا نے یہ کہتے ہوئے گھر سے نکال دیا کہ تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے تو اس کی جائیداد اور اس کی چھوڑی ہوئی دولت پر بھی تمہارا کوئی حق نہیں۔ گھر سے نکلنے لگے تو چچا نے کہا کہ یہ لباس بھی اسی باپ کی کمائی کا ہے جو تم نے پہنا ہوا ہے' تم نے تو آج تک پھوٹی کوڑی نہیں کمائی' یہ تو باپ کی چھوڑی ہوئی دولت ہے جس پر تم آج تک گلچھرے اڑاتے رہے ہو۔ اس نے بدن کے کپڑے بھی اتروا کر مادرزاد برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا۔

رہی ناصحانہ اور خیر خواہانہ اندازِ ملامت تو یہ زیادہ خطرناک ہے۔ امام احمد بن حنبل ؒ پر ایک دورِ ابتلاء تو وہ تھا کہ ان کو ماریں پڑ رہی تھیں' ایسی مار کہ اگر ہاتھی کو ماری جائے تو وہ بلبلا اٹھے' مگر اس پر کبھی کوئی آنسو آپؒ کی آنکھ میں نہیں آیا۔ جب دربارِ خلافت کی صورتِ حال بدلی' وہ فتنے والا دَور ختم ہو گیا' تختِ خلافت پر متمکن ہونے والے نئے خلیفہ نے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا تو اس کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ اے اللہ! میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔ یہ آزمائش زیادہ بھاری ہے ان کوڑوں سے جو میری پیٹھ پر پڑ رہے تھے۔ تو یہ ہے وہ وصف مطلوب ﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ کہ وہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔

یہ ان لوگوں کے مطلوبہ اوصاف کی تین dimensions ہیں' جو دراصل ہمارے لیے تین کسوٹیاں ہیں۔ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے مطلوبہ اوصاف کے حوالے سے یہ وہ آئیڈیل ہے جو ہمیں پیش نظر رکھنا ہے۔ اگر ہم اس معیار پر اپنے آپ کو پورا نہیں پا رہے ہیں تو اپنی کوتاہی کا احساس رہے' اس کا اعتراف ہو اور اس کا اقرار

رہے‘ لیکن آئیڈیل کو مسخ نہ کیا جائے۔ اگر ہم اس آئیڈیل کو بدل دیں گے تو پھر اصلاح کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ تو ان مقامات کو اس اعتبار سے مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ اس راہ کے مسافروں کے لیے زادِ راہ ہے‘ یہ اس جدوجہد کے لیے کمر ہمت کسنے والوں کے لیے لازمی اوصاف ہیں۔

محبت الٰہی۔ اللہ کا خصوصی فضل

آگے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ”یہ اللہ کا فضل ہے‘ وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے“۔ لفظ ”فضل“ کے مفہوم اور قرآن مجید میں اس کے استعمالات پر ہم گزشتہ نشست میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ”فضل“ کا استعمال ایک نئی شان سے ہوا ہے۔ اس کا تعلق ”يُحِبُّهُمْ“ سے جڑتا ہے‘ یعنی اللہ کا یہ فضل ہوا تو انسان اس راستے کی طرف آیا۔ پھر یہ کہ ان اوصاف میں جتنی جتنی بھی ارزانی ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے ہی سے ہوئی۔ یہ اللہ کا فضل ہے‘ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اُسی نے چنا اگر کسی کو چنا‘ اُسی نے ذوق عطا فرمایا اگر عطا فرمایا‘ اُسی نے شوق عطا فرمایا اگر شوق ملا‘ اُسی نے جذبہ عطا کیا اگر کسی کو جذبہ ملا۔ کوئی اور ذریعہ (source) تو ہے ہی نہیں۔ تو یہ چیزیں اللہ کے فضل میں سے ہیں۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے‘ اس کی دین ہے‘ اس کی عطا ہے۔ پھر اس کو نوٹ کیجیے کہ یہ اگر احساس رہے گا تو انسان میں کبھی تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس میں ایک سرور ہے‘ اس میں کیف ہے کہ میرے ربّ نے مجھے چنا ہے‘ میرے ربّ نے مجھے پسند فرمایا ہے۔ قرعۂ فال میرے نام نکلا ہے۔ تو اس میں عنایت خداوندی کا اپنی ذات پر جو ایک خاص احساس ہوتا ہے یہ انسان کے لیے قوت کا سب سے بڑا منبع اور سرچشمہ ہے۔ پھر یہی وہ چیز ہے کہ جو تکبر کا راستہ مسدود کرتی ہے۔ اگر اس کے برعکس صورت ہو کہ میں نے یہ کیا‘ میرے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی‘ تو جان لیجیے کہ یہی ”مَیں“ ہے جو اصل میں کِبر اور تکبر کی شکل اختیار کرتی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان کے وار سب پر ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ جو

لوگ اس وادی میں آ گئے ہوں اور وہ کچھ منزلیں طے بھی کر بیٹھے ہوں‘ کچھ امتحانات پاس بھی کر چکے ہوں‘ کچھ آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ نکل بھی آئے ہوں‘ اب ان پر شیطان کا کوئی اور وار کارگر نہیں ہوگا‘ ان کے لیے شیطان کے پاس بہت بڑا ہتھیار تکبر کا ہے۔ اور وہ کس قدر مہلک ہتھیار ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ)) (۱) ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہے“۔ حقیقت کے اعتبار سے تکبر شرک کی بدترین صورت بنتی ہے۔ یہ شرکِ معنوی ہے‘ شرکِ خفی ہے۔ شرکِ خفی اور شرکِ جلی پر میں بہت بحثیں کر چکا ہوں کہ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ شرکِ جلی وہ ہے جو نظر آتا ہے‘ جس پر کسی مفتی کا فتویٰ لگ جائے گا اور شرکِ خفی وہ ہے جو نظر نہیں آتا‘ وہ مفتی کے فتوے کی زد میں نہیں آئے گا‘ لیکن شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ شرکِ جلی بڑا شرک ہے اور شرکِ خفی چھوٹا شرک ہے۔ بڑے اور چھوٹے شرک کی نسبت اگر آپ نے جلی اور خفی کے حوالے سے کی ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ تو یہ تکبر درحقیقت بہت بڑا شرک ہے‘ اس لیے کہ اس کے لیے حدیث قدسی میں الفاظ یہ آئے ہیں: ((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ))(۲) ”تکبر تو میری چادر ہے“۔ گویا جو کوئی تکبر کرتا ہے وہ میرے کاندھے سے میری چادر گھسیٹ رہا ہے۔ اور عرب میں یہ کسی کی سب سے بڑی توہین تھی۔ عربوں کے لباس میں ان کی شخصیت اور وجاہت کا انڈکس ان کی چادر ہوتی تھی۔ وہ چادر جو خواتین اوڑھتی تھیں جلباب کہلاتی تھی‘ جس کا ذکر سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ وہ اپنے پورے جسم کو اس چادر کے اندر لپیٹ کر نکلتی تھیں۔ اسلام نے اس میں صرف یہ اضافہ کیا کہ اس چادر کا ایک حصّہ چہرے پر لٹکا لیا جائے‘ ورنہ پہلے سے وہ چادر اُن کے لباس کا جزوِ لازم تھی۔ اسی طرح

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ‘ باب ما جاء فی الکبر۔

(۲) سنن ابی داوٗد‘ کتاب اللباس‘ باب ما جاء فی الکبر۔ وسنن ابن ماجه‘ کتاب الزهد‘ باب البراءة من الکبر والتواضع۔

مَردوں کے لباس میں بھی چادر کو خصوصی اہمیت حاصل تھی‘ جیسے آج کل پٹھانوں کے لباس میں چادر جزوِ لازم ہے‘ جو ان کے کندھے پر ہوتی ہے‘ اور وہ بڑی کثیر المقاصد (multipurpose) چادر ہوتی ہے۔ بوقتِ ضرورت وہ مصلّٰی بنتی ہے‘ وہی سونے کے کام آتی ہے۔ وہ رفعِ حاجت کے لیے بیٹھتے ہیں تو اپنی اس چادر کو اپنے گرد بالکل ایک خیمے کی طرح تان لیتے ہیں۔ تو یہ بڑی ''ملٹی پرپز'' چادر ہے۔(۱) عرب میں بھی چادر لباس کا جزوِ لازم تھا اور ہر شخص اپنے جاہ و مرتبہ اور مالی حیثیت کے لحاظ سے چادر اپنے کندھے پر رکھتا۔ گویا اس چادر سے انسان کا رتبہ معین ہوتا تھا۔ اب کسی کی چادر اس کے کندھے سے گھسیٹ لینے کا مطلب اسے بے عزت کر دینا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کبر میری چادر ہے''۔ یہ جامہ صرف مجھ کو راست آتا ہے۔ اگر کوئی متکبر ہے تو گویا اس نے میرے کاندھے سے میری چادر گھسیٹی ہے‘ اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔

یہ تکبر اس راہ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہ پندار کہ میں نے اس راہ میں یہ کچھ کھپا دیا‘ میں نے تو بہت دولت صرف کر دی‘ اپنی جوانی کھپا دی‘ اپنی توانائیاں لگا دیں‘ یہ چیز تکبر کی بدترین بنیاد بن جائے گی۔ اس کے برعکس یہ خیال ہو کہ یہ سب کچھ اس کی دین ہے‘ اس نے عطا کیا ہے‘ اس نے توفیق دی ہے‘ اس نے تیسیر فرمائی ہے‘ اس نے ایسے مواقع پیدا فرما دیے‘ وہ مواقع اگر نہ ملتے تو نہ معلوم ہم کہاں بھٹک رہے ہوتے! کس نالی میں گرے ہوتے! آخر شراب پی کر نالیوں میں گرے ہوئے لوگ بھی تو ملتے ہیں‘ وہ بھی انسان ہیں‘ پتا نہیں کس وقت اس کا پاؤں پھسل گیا اور ایک مرتبہ کی لغزش اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ ہماری نہ معلوم کتنی لغزشیں ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہے‘ کتنی خطائیں ہیں جن سے درگزر فرمایا ہے۔ اب یہ احساس اگر ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے‘ اس میں میرا کوئی ذاتی استحقاق نہیں تھا‘ کوئی میرا دعویٰ (claim)

(۱) افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں افغان مجاہدین اپنی چادر کے ذریعے روسی ٹینکوں کا شکار بھی کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی چادر کو گیلا کر کے چلتے ہوئے ٹینک پر ایک خاص انداز سے پھینکتے تو یہ ٹینک کے chain میں پھنس جاتی اور ٹینک رک جاتا اور مجاہدین اس پر قبضہ کر لیتے۔ (اضافہ از مرتب)

نہیں تھا‘ جو کچھ ملا ہے صرف اس کی عطا‘ اس کا فضل اور اس کی دین ہے‘ تو انسان تکبر سے بچ جائے گا۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے‘ وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔

دو صفاتِ الٰہیہ کے حوالے سے حسد کا سدّ باب

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ ''اور اللہ بہت وسعت والا‘ جاننے والا ہے''۔ اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی یہ جو دو صفات آئی ہیں اس مضمون کے ساتھ ان کی نسبت اور تعلق تلاش کیجیے! آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں حسد کی جڑ کٹتی ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے تو جلتے کیوں ہو؟ اللہ کے فضل کا خزانہ محدود تو نہیں ہے‘ تم اس سے مانگو‘ وہ تمہیں دے گا۔ اس راستے میں آ کر بربادی کا جو اصل سبب بنتا ہے وہ اوّلاً تکبر اور ثانیاً حسد ہے۔ حدیث نبویؐ کے مطابق حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا دیتی ہے۔ حسد اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے یہ شے کیوں دے دی؟ حسد مال و دولت پر بھی ہوتا ہے اور اس بات پر بھی کہ فلاں کو یہ رتبہ کیوں مل گیا۔ لیکن جب یہ خیال ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے جو اس پر ہوا ہے‘ اللہ نے اسے چن لیا ہے‘ یہ اس کی دین ہے‘ تو پھر حسد پیدا نہیں ہوگا۔ جب ہمیں اللہ سے محبت ہے تو راضی برضائے ربّ رہنا ہوگا۔ یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر بھی آخر کار کھل گئی تھی‘ اگرچہ بہت دیر میں کھلی تھی۔ شروع میں حسد تھا کہ یوسف اور اس کا بھائی بنیامین ہمارے والد صاحب کو بہت زیادہ محبوب ہیں‘ حالانکہ ہم عُصبہ ہیں‘ ہم دس جوان ہیں‘ ہم دست و بازو ہیں‘ کوئی مقابلہ پیش آئے گا تو لاٹھیاں لے کر مقابلے میں ہم آئیں گے‘ مگر یہ چھوٹے چھوٹے دو بچے جو ہیں ان پر زیادہ عنایت ہے‘ زیادہ شفقت ہے۔ لیکن جب وہ مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آخری مرتبہ خستہ حالی کی کیفیت میں پہنچے اور جب وہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ یوسف ہیں تو وہ پکار اٹھے: ﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ ''اللہ کی قسم (آج ہم تسلیم کر رہے ہیں کہ) اللہ نے آپ کو ہم پر ترجیح دی ہے''۔ ہماری نسبت آپ کو پسند فرما لیا ہے۔

اس حقیقت کا اگر پہلے روز سے ادراک ہو جائے کہ یہ اللہ کا انتخاب (choice)

ہے‘ اللہ کی پسند ہے‘ اللہ نے جس کو جو چاہا دے دیا‘ تو پھر حسد نہیں ہوگا۔ یہ اس کا اختیار خصوصی ہے‘ جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اور یہ بھی سوچیں کہ آخر اس کا خزانہ خالی تو نہیں ہوگیا! تم بھی اس سے مانگو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں نے آپ کو سنائے تھے کہ دستک دو‘ کھولا جائے گا‘ مانگو‘ دیا جائے گا......تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے مچھلی مانگے اور وہ اسے سانپ پکڑا دے! تم اپنی اولاد کے ساتھ اگر یہ نہیں کرتے تو کیا وہ تمہارا آسمانی باپ اگر تم اس سے مانگو گے تو کیا تمہیں نہیں دے گا؟ مانگ لو اس سے‘ اس کا خزانہ تو اتھاہ ہے۔ اس سے تم مانگو‘ وہ تمہیں دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو ایک پہلو سے نواز دے‘ کسی دوسرے کو کسی دوسرے پہلو سے نواز دے۔ وہاں تو قسم قسم کی نعمتیں ہیں‘ انواع واقسام کے رنگا رنگ ہیرے اور موتی ہیں‘ وہ واسع ہے‘ بڑی وسعت والا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

’’علیم‘‘ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ جس کو جو کچھ دیتا ہے اپنے علم کی بنیاد پر دیتا ہے کہ کون کس شے کا اہل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں بھی آیا ہے کہ اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے مت ڈالو۔ کون کس شے کا اہل ہے‘ دیکھ کر دو۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ جس کو جو کچھ دیتا ہے الل ٹپ نہیں دیتا۔ بسا اوقات کسی کو دولت سے محروم کرنا اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے کہ یہ ضعیف ہے‘ اپنی خواہشات پر قابو نہیں رکھ سکتا‘ دولت کی فراوانی ہوگی تو عیاشیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اگر اس وجہ سے اللہ نے ہاتھ روکا ہوا ہے تو اللہ اس کے لیے خیر کر رہا ہے‘ شر تو نہیں کر رہا ہے۔ اس سے اس دولت کا روک لینا اور رزق میں تنگی کر دینا اس کے لیے خیر ہے‘ شر نہیں ہے۔ تو وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے علم کامل کی بنیاد پر کرتا ہے کہ کسے کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا‘ کون کس چیز کا اہل ہے اور کس چیز کا اہل نہیں ہے۔ تو وہ واسع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔ جو مانگنا ہے اس سے مانگو۔ البتہ اس پر راضی بھی رہو کہ جو اُس نے ہمیں دیا ہے یقیناً یہی ہمارے لیے خیر ہے۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم OO

درس ۳

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے

مطلوبہ اوصاف

(درس ۲ کا تتمہ)

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امَّا بَعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ (الشوریٰ) ...... صدق اللّٰہ العظیم

قبل ازیں ہم دو نشستوں میں ’’اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے لیے زوردار دعوت‘‘ کے عنوان سے سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ اور اسی کے تتمہ کے طور پر آیات ۴۷‘ ۴۸ کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ

المائدۃ کی آیت ۵۴ کی روشنی میں ’’اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف‘‘ کا مطالعہ کیا۔ اسی مناسبت سے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف سورۃ الشوریٰ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کو اقامتِ دین کی فرضیت کا شعور حاصل ہو جائے اور وہ اس کے لیے کمرِ ہمت کس لیں‘ اس کے لیے ارادہ کر لیں‘ انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ اس جدوجہد کے لیے کچھ مطلوبہ اوصاف ہیں۔ تو گویا کہ وہی مضمون جو اِس سے پہلے سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں آ چکا ہے‘ اب یہاں سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۴۳ میں آ رہا ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے‘ لیکن اس نشست میں اس پر اِختصار سے گفتگو کی جائے گی۔ ان آیات کا تفصیلی درس مَیں کراچی میں شامِ الہدیٰ کی دو نشستوں میں دے چکا ہوں اور اس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں۔ جو حضرات تفصیل اور وضاحت کی ضرورت محسوس کریں وہ ان کیسٹس سے استفادہ کریں۔

اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾

’’جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی (چندروزہ) زندگی کا سروسامان ہے‘ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔‘‘

ترجیحِ آخرت

پہلی آیت میں دو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور یہ ایمان کا لبّ لباب اور حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ تشبیہہ اور تمثیل کئی مرتبہ بیان ہو چکی ہے کہ دین کا جو عملی پہلو ہے اس کے لیے ایمان کو جڑ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ عملی پہلو چاہے انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی ذات سے متعلق ہو‘ چاہے شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جدوجہد ہو‘ ان سب کے لیے ظاہر بات ہے کہ اصل شے وہ جڑ ہے جس سے کہ غذا ملتی ہے‘ جس

سے توانائی حاصل ہوتی ہے‘ اور وہ ایمان ہے۔ لہٰذا یہاں ان اوصاف کے ضمن میں سب سے پہلے ایمان کا لب لباب بیان کر دیا گیا۔ اس ضمن میں پہلی شے یہ فرمائی گئی کہ ﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ﴾ ’’جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے‘‘۔ جو کچھ بھی تم دیے گئے ہو‘ کوئی بڑی سے بڑی شے یا چھوٹی سے چھوٹی شے‘ وہ اس دنیا کی چندروزہ زندگی کا برتنے کا سامان ہے۔ ’’شَیْءٍ‘‘ یہاں نکرہ ہے اور نکرہ عربی زبان میں تفخیم کے لیے بھی آتا ہے‘ تعظیم کے لیے بھی اور تحقیر کے لیے بھی۔ یعنی کسی چیز کی عظمت کا بیان کرنا ہو‘ اس کی بڑائی کا بیان مقصود ہو یا اس کا چھوٹا پن ظاہر کرنا ہو تو اسے نکرہ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو جمع کیا ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی شے جو دنیا میں مل جائے‘ فرعون کی حکومت‘ نمرود کی حکومت یا قارون کا خزانہ‘ اور کوئی چھوٹی سے چھوٹی شے جو یہاں کسی کو ملتی ہے‘ اس کے بارے میں یہ واضح فرما دیا کہ اوّل تو وہ ’’اُوْتِیْتُمْ‘‘ کے حکم میں ہے‘ وہ تمہاری اپنی کمائی ہوئی نہیں ہوتی‘ دی گئی ہوتی ہے۔ سورۃ الحدید میں الفاظ آئے ہیں کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ﴾ ’’اور خرچ کرو ہر اُس چیز میں سے جس کا اس نے تمہیں اختیار بخشا ہے‘‘۔ یہاں بھی صرف اسلوب کے بدلنے سے ایک اہم رہنمائی ہو گئی کہ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہارا اپنا کسب ہے‘ تمہاری اپنی کمائی ہے‘ تمہاری اپنی محنت سے حاصل کردہ شے ہے‘ تمہاری اپنی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے‘ تمہاری ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سمجھو گے تو تمہارا قدم قارونیت کی طرف اٹھ جائے گا‘ اس لیے کہ اُس نے یہ کہا تھا کہ یہ دولت و ثروت میرے علم کا حاصل ہے ﴿اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾

دوسری بات یہ واضح کر دی گئی کہ یہ ’’مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا‘‘ ہے‘ یہ بس اس چندروزہ دنیا کی زندگی کا برتنے کا سامان ہے‘ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ نے تمہیں یہاں امتحان کی خاطر کچھ عرصے کے لیے ٹھہرائے رکھنا ہے‘ جو تیس چالیس سال بھی ہو سکتا ہے‘ پچاس ساٹھ سال بھی اور دس بیس سال بھی۔ یہ تمہارا امتحانی عرصہ ہے۔ تو اگر کمرۂ امتحان میں تمہیں ایک کرسی اور میز دے دی گئی‘ کوئی قلم دے دیا گیا اور وہاں تمہارے

لیے پانی کا کوئی اہتمام کر دیا گیا کہ کوئی ملازم کھڑا ہے' تو کیا ان چیزوں کے بارے میں تمہارا یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تمہاری ملکیت ہیں؟ ان سے تمہیں کوئی قلبی لگاؤ ہوتا ہے؟ بلکہ ساری توجہ کا ارتکاز تو امتحان پر ہوتا ہے۔ تو بس یوں سمجھو کہ یہ امتحانی وقفہ گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ سامان دے دیا ہے۔ اگر اس سے زیادہ اس کے لیے دل میں کوئی وقعت پیدا ہوگئی اور اس سے زیادہ کوئی تعلق خاطر قائم ہو گیا تو پھر اور جو چاہو کرو' اُس (اقامت دین کی) وادی میں قدم نہ رکھنا ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں! نقطۂ نظر کا اگر یہ فرق واقع نہیں ہوا ہے تو اس راستے پر نہیں چل پاؤ گے۔ سوچ سمجھ کر اس وادی میں قدم رکھو ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

دلوں کو ٹٹولو کہ اس راہ کے مسافر کا وصفِ لازم یہ ہے کہ بڑی سے بڑی شے اور چھوٹی سے چھوٹی شے جو کچھ ملی ہے' یہ صرف اس دنیا کی عارضی زندگی کے برتنے کا ایک سامان ہے۔ اس سے زیادہ اس کی وقعت' اس سے زیادہ اُس کی قدر و قیمت' اس سے زیادہ اس سے کوئی تعلقِ خاطر اور اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ کوئی قلبی لگاؤ اگر ہے تو گویا کہ آدمی پہلے ہی امتحان میں ناکام ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے' نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے!

پھر تو انسان اس شعر کا مصداق بنا رہے گا کہ چلنا چاہتا ہے' چل نہیں پاتا۔ دل میں آگے بڑھنے کی آرزو ہے' خواہش ہے' لیکن پاؤں میں کوئی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس راستے پر چلنا ہے تو اس مخمصے سے آزاد ہو کر آؤ۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝٣٦﴾ ''اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی' اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں۔'' ایک لفظ میں اس وصف کو

''ترجیح آخرت'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے کہ مطلوب آخرت رہے' دنیا نہ رہے۔ قدر و قیمت آخرت کی نعمتوں کی ہو' دنیا کے ساز و سامان کی نہ ہو۔ یہ ہے اس راستے کی شرطِ اوّل۔

توکّل علی اللہ

ایمان کا دوسرا نتیجہ وثمرہ اور لب لباب ''توکل علی اللہ'' قرار دیا گیا کہ ﴿وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ ''اور وہ اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں''۔ چنانچہ توکل صرف اللہ پر ہو' توکل ساز و سامان اور اسباب و وسائل و ذرائع پر نہ ہو' توکل اپنے زورِ بازو پر نہ ہو' توکل اپنی ذہانت و فطانت پر نہ ہو۔ یعنی پہلی شرط تو یہ کہ دنیا کی عظمت سے دل کو خالی کر کے آؤ۔ اور دوسرے یہ کہ اس راہ میں جو کچھ تمہیں کرنا ہے اس کے لیے بھی بھروسہ اگر اپنے زورِ بازو پر اور اپنی ذہانت و فطانت پر ہے تو پھر بھی ناکام ہو جاؤ گے۔ توکل کلیتًا اللہ کی تائید و نصرت پر' اللہ کی توفیق پر اور اللہ کی مدد پر ہو۔ ہمارا کام محنت کرنا' مشقت جھیلنا' ایثار کرنا' قربانیاں دینا ہے۔ اگر ہم یہ کر گزریں تو ہم تو سرخرو ہو جائیں گے۔ ہوگا وہی جو وہ چاہے گا' اور اُس وقت ہوگا جب اس کو منظور ہوگا۔ یہ فیصلہ ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہوگا۔ ہم تو چاہیں گے کہ فوراً لپک کر منزل پر جا پہنچیں ع منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے! ہر شخص یہی چاہے گا۔ کون چاہے گا کہ میں چلتا چلا جاؤں' چلتا چلا جاؤں اور منزل پھر بھی نگاہ کے سامنے نہ آئے۔ لیکن اس کے لیے بھی تیار رہو کہ اگر اللہ کو ابھی یہ مطلوب نہیں ہے تو پھر ہمیں بھی وہی چیز پسند ہے جو اسے پسند ہے۔ یہ راضی برضائے ربّ کا مقام ہے۔

یوں سمجھ لیجیے کہ اس ایک آیت کے اندر سورۃ التغابن کے مضامین کا خلاصہ موجود ہے۔ دل اس پر جما ہوا ہو کہ ہار اور جیت کے فیصلے کا دن تو وہ ہے ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ جو اُس دن ہارا' وہ ہارا اور جو جیتا' وہ جیتا۔ یہاں کسی کو کیا ملا؟ فرض کیجیے کہ کل صبح کسی کو پھانسی ہونی ہے اور آج آپ اسے مخملیں گدّے پر سلا دیں تو اس کے لیے وہ مخملیں گدّا چہ معنی دارد؟ اسے پتا ہے کہ صبح اسے پھانسی ہونی ہے۔ اس اعتبار سے

یہاں کے ساز و سامان اور یہاں کے مال و متاع کی کوئی وقعت دل میں نہ رہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ انہیں استعمال نہ کرو۔ یہ بالکل دوسری بات ہے۔ اللہ نے دنیا میں جو کچھ دیا ہے استعمال کے لیے ہی دیا ہے' لہٰذا اللہ کی دی ہوئی چیزوں کو دل کھول کر برتو۔ اگر اللہ دولت دیتا ہے تو اسے استعمال کرو' لیکن دولت کو اپنے دل میں مت داخل ہونے دو۔ اس دولت کو بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ' اسے اِنفاق فی سبیل اللہ اور ادائے حقوق میں صرف کر دو۔ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے کہ کس نے حرام کر دیا ہے اللہ کی اُس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اس کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں ممنوع کر دیں؟'' چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰـكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ))(۱)

''دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال و دولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اُس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔

یعنی اپنی ذہانت' اپنی فطانت' اپنے وسائل اور اپنے ذرائع پر اعتماد نہ رہے' بلکہ اعتماد اور توکل اللہ پر ہو۔ اور سورۃ التغابن کی وہ آیت بھی ذہن میں رکھئے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۳﴾ ''اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' اور اللہ پر ہی اہل ایمان کو توکل کرنا چاہیے''۔ اہل ایمان کا توکل ذاتِ باری تعالیٰ پر مرتکز ہو جانا چاہیے۔

تو اس ایک آیت میں دو اوصاف آ گئے: (۱) ترجیح آخرت (۲) توکل علی اللہ۔ اصل میں یہ ایمان کے دو نتائج یا دو ثمرات ہیں' اور یہ اس راستے کی اوّلین شرائط (pre-requisites) ہیں۔ انسان کی شخصیت میں اور اس کی سوچ اور نقطۂ نظر میں

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزهد عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔

ایمان کے نتیجے میں جو تبدیلی اور انقلاب پیدا ہونا چاہیے یہاں ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ انسان کو اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ اس کے دامن میں ان دونوں چیزوں کی پونجی موجود ہے یا نہیں۔

اگلی آیت میں پھر دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝۳۷﴾

''اور وہ لوگ کہ جو پرہیز کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں''۔

کبائر اور فواحش سے اجتناب

''جنب'' پہلو کو کہتے ہیں اور اجتناب کا مفہوم ہے پہلو بچائے رکھنا' پہلو تہی کرنا' کسی چیز سے بچ کر چلنا۔ ''اجتناب'' ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اجتناب کرتے ہیں' جو بچتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بچائے رکھتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے۔ یہ جو لفظ ''کبائر'' یہاں آیا ہے یہ مضمون قرآن مجید میں دو اور مقامات پر' سورۃ النجم اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے۔ اس سے اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس وصف (کبائر سے اجتناب) کی اہمیت یہ ہے کہ انسان پر جیسے کچھ بہت سے دوسرے جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا بھی جب آدمی پر ایک غلبہ ہوتا ہے تو اس کی باریک بینیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں' اس کی حس زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک برائی سے آپ نے اپنے آپ کو بچایا تو اب اس سے چھوٹی برائی نظر آئے گی۔ اس کو میں نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ یہ بالکل ایسے ہے جیسے پیاز کا ایک چھلکا اتاریئے تو پھر آگے دوسرا چھلکا ہے۔ اس دوسرے چھلکے پر جو داغ ہے وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا جب تک آپ پہلا چھلکا نہیں اتاریں گے۔ اس سے پہلے آپ کو اس کا احساس ہی نہیں ہوگا کہ میرے اندر یہ خرابی بھی ہے۔ جب پہلا چھلکا اترے گا' پہلی خرابی سے آپ اپنے

آپ کو بچا لیں گے‘ اپنا دامن پاک کر لیں گے تو دوسرا چھلکا نظر آئے گا۔ دوسرا چھلکا اتاریں گے تو آگے ایک تیسرا چھلکا ہے۔ پھر اس کا کوئی داغ ہے جو نظر آئے گا۔ جب تک دوسرا چھلکا نہیں ہٹے گا‘ وہ نظر نہیں آئے گا۔ تو یہ ایک فطری تدریج ہے‘ لیکن اس میں بھی انسان سے ایک غلو ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اصلاحِ ذات میں اگر غلو ہو جائے گا تو وہ اقامتِ دین کی راہ کی رکاوٹ بن جائے گا۔ اگر آپ کی ساری توجہ اپنی انفرادی اصلاح پر مرتکز ہو کر رہ جائے اور آپ اپنے نفس ہی کو مانجھنے اور رگڑنے میں لگے رہیں تو پھر معاشرے کی اصلاح اور اللہ کے دین کے غلبہ کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ ہمارے ہاں رہبانیت کی طرز پر خانقاہیت کا جو ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے اس میں ساری توجہ انفرادی اصلاح پر ہے کہ اب اسی میں لگے رہو۔ بعض صوفیاء کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال تک یہ ریاضت کرتے رہے۔ خدا کے بندو! چالیس برس کی ریاضت کے بعد کون سا وقت آدمی کے پاس رہ گیا کہ وہ اس ماحول کی اصلاح کے لیے بھی نکلے‘ اور اس کے لیے بھی اپنی توانائیاں کھپائے‘ اس ماحول کے اندر کوئی تبدیلی لانے کے لیے باطل کو للکارے اور نیکی کی قوتوں کو منظّم کر کے باطل کے ساتھ ٹکرا دے؟

انفرادی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح‘ یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلنے چاہئیں اور ان میں عدم توازن نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی نہ ہو کہ آدمی اپنے آپ کو بھولا رہے اور دوسروں کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ یہ ایک انتہا ہے‘ جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (البقرۃ) ”کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو‘ درآں حالیکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“ اور دوسری انتہا یہ ہے کہ اپنی انفرادی اصلاح میں غلو سے کام لیا جائے اور اجتماعی اصلاح سے اغماض برتا جائے۔ اب آپ غور کیجیے‘ اسی شہر لاہور میں ایک صاحب موجود ہیں‘ انتہائی نیک آدمی ہیں‘ وہ گوشت اس لیے نہیں کھاتے کہ کچھ پتا نہیں

کہ صحیح ذبح ہوا یا نہیں ہوا۔ پھل اس لیے نہیں کھاتے کہ آج کل باغات کا جو ٹھیکہ ہوتا ہے وہ صحیح طریقے پر نہیں ہوتا۔ اس طرح انہوں نے نامعلوم کیا کیا چیزیں اپنی خوراک میں سے خارج کی ہوئی ہیں۔ تو انفرادی زہد کا تو یہ عالَم ہے‘ لیکن اس ماحول میں رہ رہے ہیں جس میں باطل کا غلبہ ہے اور اس کے ازالے کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد کی ان کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ عدم توازن کہ ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ فلاں صاحب اتنے زاہد‘ اتنے عابد اور اتنے متقی ہیں کہ ان کا گھوڑا بھی مشکوک گھاس نہیں کھاتا۔ ٹھیک ہے! اللہ تعالیٰ وہ مقام اگر کسی کو دے دے تو کیا کہنے ہیں۔ لیکن یہ کہ باطل کا غلبہ ہو‘ غیر اسلامی حکومت ہو‘ اور اس کی وہ تھانے داری فرما رہے ہوں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ یہ ہے عدم توازن‘ کہ ذاتی زہد اور ذاتی تقویٰ کا غلو تو اس حد کو پہنچا ہوا ہے‘ لیکن باطل سے نبرد آزمائی اور حق کے غلبے کے لیے جدوجہد سرے سے خارج از بحث ہے۔ یہاں اس عدمِ توازن کو روکنا مقصود ہے جس کا ذکر ایک حدیث نبویؐ میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا۔ قَالَ: فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔ قَالَ: فَقَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ‘ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِىَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱)

”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت الٹ دو“۔ آپؐ فرماتے ہیں: ”حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: ”اے اللہ! اس بستی میں تو تیرا وہ بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔“ آپؐ نے فرمایا کہ ”اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”الٹ دو اِس کو پہلے اُس پر‘ پھر دوسروں پر‘ اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی تھوڑی دیر کے لیے بھی میری غیرت اور حمیت میں متغیر نہیں ہوا“۔

(۱) رواہ الامام البیہقی بحوالہ خطبات الاحکام‘ تالیف مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

ذرا اس شخص کی ذاتی نیکی کا اندازہ لگائیے کہ اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر اس انتہا کو پہنچ گیا کہ حضرت جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دے رہے ہیں کہ اس نے کبھی ایک لمحہ بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا' لیکن اس کی بے غیرتی اور بے حمیتی بھی ملاحظہ کیجیے کہ اسے اس سے کوئی غرض ہی نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کفر کس طرح دندنا رہا ہے' شیطنت کس طرح ننگا ناچ ناچ رہی ہے' بے حیائی کا سیلاب کس طور سے آ رہا ہے' اللہ کی شریعت کا استہزاء کس طرح ہو رہا ہے!

تو یہ جو عدمِ توازن ہے اس کو قرآنِ حکیم کے ان الفاظ کی روشنی میں دیکھئے: ﴿كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ یعنی بڑے بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچا لیجیے' ان سے اپنا دامن پاک کر لیجیے اور بے حیائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔ اس کے بعد میدانِ عمل میں قدم رکھئے' اس جدوجہد میں پڑیئے' تو مزید اصلاح ہو گی۔ لیکن اگر ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ اپنی اصلاح کے عمل کو کامل کر کے ہم اس جدوجہد میں قدم رکھیں گے تو وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ آدمی کامل تو کبھی ہو گا ہی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں کامل ہو گیا؟ جو یہ دعویٰ کرے وہ احمق ہے۔ اصلاح تو زندگی بھر کے لیے ایک مسلسل عمل ہے۔

حالتِ غصہ میں عفو و درگزر

اس سلسلے کا چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾﴾ ''اور جب انہیں غصہ آ جائے تو معاف کر دیتے ہیں''۔ اس آیت میں بیان کردہ یہ دوسرا وصف ہوا کہ انسان غصے میں آ کر کوئی قدم نہ اٹھائے' جھنجھلاہٹ میں آ کر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے۔ آپ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے کہ یہاں غصے کی نفی نہیں ہے۔ سرے سے غصہ نہ آنا تو غیرت وحمیت کے فقدان کی علامت ہے۔ جس شخص کو غصہ آتا ہی نہیں وہ یا تو وہی شخص ہو گا جس میں غیرت وحمیت نہیں' یا پھر پرلے درجے کا کوئی منافق ہو گا۔ جو لوگ بہت زیادہ ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں وہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسان کے اندر غیرت وحمیت کا مادہ رکھا ہے جس کا اظہار غم وغصہ

کی صورت میں ہوتا ہے' لہٰذا غصہ آنا چاہیے' البتہ ٹھیک جگہ پر آنا چاہیے' غلط جگہ پر نہیں آنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اگر شہوت کا جذبہ رکھا ہے تو وہ کوئی بری شے نہیں ہے' ہاں اس کو صحیح رُخ پر استعمال ہونا چاہیے' غلط راستہ پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اسی طرح غصہ جو ہے اس کی نفی نہیں ہے' لیکن یہ کہ غصے میں کوئی اقدام کیا جائے گا تو غلط ہو جائے گا۔ انسان جو بھی اقدام کرے وہ غصہ رفع ہونے کے بعد کرے' اور اگر غصے کی حالت میں ہو تو معاف کرے۔

سورۂ آل عمران میں اہل تقویٰ کی صفات کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ (آیت ۱۳۴) ''غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے''۔ یہ چیز خاص طور پر کسی اجتماعی جدوجہد میں بہت ضروری ہے۔ اگر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگے' غصے میں آدمی کچھ کہہ دے' غصے میں کوئی قدم اٹھا لے تو یہ بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کو خلیل جبران کا فقرہ سنایا تھا کہ ''عقل سے رہنمائی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو''۔ منزل کا تعین کہ جانا کہاں ہے' عقل سے ہو گا' ایسا فیصلہ جذبات میں کیا گیا تو غلط ہو جائے گا' البتہ جب طے کر لیا کہ ادھر جانا ہے تو اب عقل کو ایک طرف رکھ دو' چلنے میں یہ رکاوٹ بنے گی' قدم قدم پر مصلحتیں سجھائے گی' قدم قدم پر خطروں سے باخبر کرے گی تو چل نہیں پاؤ گے۔ جب آپ نے منزل کا تعین کر لیا تو عقل کا کام مکمل ہو گیا' اب اسے ایک طرف رکھو اور جذبے کے تحت حرکت کرو۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

اسی طرح غصے میں فیصلہ مت کرو' غصے میں اقدام مت کرو۔ غصہ آئے تو اسے پینے کی کوشش کرو اور ایسے میں مغفرت اور عفو کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرو۔

آگے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰـهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾

''اور جنہوں نے اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہی اور نماز قائم کی' اور وہ اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں' اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہےاس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اللہ کی پکار پر لبیک کہنا

یہاں استجابت کا لفظ آیا ہے جو ہم گزشتہ درس میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ﴾ اور یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ وہ پکار کون سی ہے۔اس سے مراد ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط﴾ ''دین کو قائم کرو اور دین کے باب میں (اور اقامت دین کی جدوجہد میں) متفرق نہ ہو جاؤ''۔ یہاں دو آیتوں میں چار اوصاف اس سے پہلے بیان کر کے پانچواں وصف یہ فرمایا کہ ''وہ اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں''۔ان اوصاف کے درمیان صحیح ربط یہ قائم ہوا کہ یہ چار بنیادی شرائط ہیں' جو شخص یہ چار کام کر لے وہ اس وادی میں قدم رکھے۔اگر مال و دولتِ دنیا کی وقعت اور محبت ابھی دل میں ہے اور آپ اقامتِ دین کے اس راستے میں پڑ گئے تو خود آپ کی اپنی شخصیت اور کام دونوں کو نقصان پہنچے گا۔اس لیے کہ یہی شے درحقیقت منافقت کے لیے تمہید بنتی ہے۔ اگر اللہ پر توکل نہیں ہے تو بھی وہ کام کسی غلط رُخ پر پڑ جائے گا۔

اسی طرح اگر اپنے آپ کو ابھی بڑی بڑی خرابیوں سے بھی نجات نہیں دلائی ہے اور ضبطِ نفس ابھی اتنا نہیں ہوا کہ غصے کو قابو میں رکھ سکو تو بھی آپ غلط شروعات کر رہے ہیں۔اس لیے کہ وہ حدیث آپ کو معلوم ہے جس میں حضورﷺ نے منافق کے چار اوصاف بیان کیے کہ جس میں یہ چاروں موجود ہیں وہ پکا اور کٹر منافق ہے' اور جس میں ان میں سے ایک وصف موجود ہے اس میں اسی نسبت سے نفاق موجود ہے۔اس حدیث میں چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ((وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))(۱) کہ جب وہ کسی سے جھگڑتا ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے' پھٹ پڑتا ہے' گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔اسے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامة المنافق۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان خصال المنافق۔

اپنے اوپر کنٹرول ہی نہیں رہتا' غصے میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو مُنہ میں آیا بک دیا اور جو اینٹ روڑا ہاتھ میں آیا' دے مارا۔تو یہ درحقیقت نفاق کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ غصے کی حالت میں ضبطِ نفس کی تلقین فرمائی گئی۔یہ چار اوصاف بیان فرما دیے گئے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں آنے سے پہلے آدمی یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے۔یہ گویا pre-requisites کے درجے میں ہیں۔اسی لیے یہاں پر اب پانچواں وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ ''وہ لوگ کہ جو اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہیں''۔جو اپنے ربّ کی دعوت قبول کریں۔

ہم استقامت اور اقامت کے فرق پر بحث کر چکے ہیں۔اقامت کا ایک شاذ مفہوم وہ ہے کہ جو استقامت کا اصل مفہوم ہے لہٰذا کہیں کہیں استقامت کی جگہ لفظ اقامت بھی استعمال ہو جاتا ہے' لیکن اقامت کا اپنی جگہ پر اصل مفہوم کسی شے کو قائم کرنا ہے۔اسی طرح کے یہ دو الفاظ اجابت اور استجابت ہیں۔اجابت بھی کسی کی دعا یا کسی کی پکار کو قبول کرنے اور کسی کی ندا پر لبیک کہنے کے معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے' لیکن اس کے لیے اصل لفظ استجابت ہے۔لفظ ''اجابت'' کے مختلف صیغے قرآن مجید میں آٹھ جگہ استعمال ہوئے ہیں' جبکہ لفظ ''استجابت'' کے صیغے قرآن حکیم میں اٹھائیس مقامات پر آئے ہیں۔اور اس سورۂ مبارکہ میں تو تین مرتبہ استجابت کا لفظ آیا ہے۔ سب سے پہلے آیت ۱۶ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾﴾

اس کے بعد آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''اِسْتَجَابُوْا'' آیا۔اور پھر سورۃ کے آخری حصے میں آیت ۴۷ میں ''اِسْتَجِيْبُوْا'' کا لفظ آیا۔ بہرحال' اب یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو لبیک کہیں اپنے ربّ کی پکار پر''۔

اقامتِ صلوٰۃ

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص﴾ ''اور نماز قائم کریں۔'' وہ اپنی اس جدوجہد کے لیے

جو اجتماعی ہیئت قائم کریں اس کا اہم ترین وصف اقامتِ صلوٰۃ ہوگا۔ اقامتِ صلوٰۃ کو اس اجتماعیت میں مرکزہ (nucleus) کی حیثیت حاصل ہوگی' جس طرح کہ چکی کے درمیان وہ کلی ہوتی ہے جس پر وہ گھومتی ہے۔

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں : ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ ''تم انہیں دیکھو گے تو رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔ اپنے انفرادی معاملے کے اعتبار سے وہ نماز نفل ہے' تہجد ہے' قیام اللیل ہے' یعنی انفرادی اعمال میں تو تقرب بالنوافل کی اہمیت زیادہ ہے۔ لیکن اجتماعیت کے اعتبار سے اصل اہمیت تقرب بالفرائض کی ہے' چنانچہ یہاں اصل شے فرض نماز ہے۔ لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ ''وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پورا پروگرام' ان کے معمولات' ان کے چوبیس گھنٹے کے مشاغل اس نظامِ صلوٰۃ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں' ان کی پوری زندگی میں نماز کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

شورائیت کا نظام

﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ ''اور ان کا معاملہ باہم مشورے کے ساتھ چلتا ہے''۔ اب چونکہ اجتماعی معاملات کا ذکر آ گیا تو مشورے کی اہمیت بھی واضح کر دی گئی۔ لیکن یہاں یہ بات سمجھ لیجیے کہ شورائیت اور جمہوریت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ایک تو ان میں بنیادی طور پر فرق ہے کہ جمہوریت اصل میں حاکمیت کے تصور کے ساتھ ہوتی ہے' جبکہ شورائیت میں وہ حاکمیت کا تصور بالکل نہیں۔ عوامی جمہوریت کا موجودہ تصور عوامی حاکمیت کا ہے' یعنی حاکمیت میں تمام عوام شریک ہیں' جبکہ شورائیت جو ہے وہ باہم مشاورت ہے۔ اس شورائیت کے بھی دو مختلف shades ہیں جن کا تعلق مختلف حالات سے ہے۔ ایک حکومت کی سطح پر شورائیت ہے اور ایک کسی جماعت یا تحریک کی سطح پر شورائیت ہے' اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کی ایک علاقائی عملداری (territorial jurisdiction) ہوتی ہے' یعنی

ایک علاقہ ہے جس پر حکومت قائم ہے اور اس میں جو کوئی بھی ہے وہ اس حکومت میں شامل ہے' شریک ہے اور ان کی حیثیت مساوی ہے' جبکہ جماعت میں کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا' اس میں جو داخل ہوتا ہے اپنی مرضی سے اور جو اس سے نکلتا ہے اپنی مرضی سے۔ دوسرے یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے جو جماعت قائم ہوتی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ ایک داعی ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ'' کی پکار لگاتا ہے اور کچھ لوگ اس پکار پر لبیک کہہ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ایک فرقِ مراتب بھی ہے' جو ریاست میں نہیں ہوتا' وہاں سب شہری برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان دو فرقوں کی وجہ سے جماعت اور تحریک کی سطح پر شورائیت اور حکومت کی سطح پر شورائیت کے تقاضے مختلف ہیں۔

اگرچہ خلافت راشدہ کے بارے میں جو بھی میرا مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میں پورے انشراحِ صدر سے کہہ رہا ہوں کہ خلفائے راشدین کے ہاتھ میں ویٹو تھا' خلافتِ راشدہ میں آپ کو کہیں ووٹوں کی گنتی کا ذکر نہیں ملے گا' لیکن اب اگر کوئی اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے تو اس کا جو بھی دستور بنے گا اس میں سربراہِ ریاست کے ہاتھ میں ویٹو کا ہونا ضروری نہیں ہے' بلکہ انتخاب کے ذریعے سے جو بھی ایک ادارہ وہاں وجود میں آ جائے اس میں ووٹوں کی گنتی سے فیصلے ہوں' اور کسی کے ہاتھ میں اختیارِ خصوصی نہ دیا جائے تو ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن جماعت اس نہج سے نہیں چل سکتی۔ وہاں حکومت کے پاس ڈنڈا بھی ہوتا ہے' یہاں جماعت کے اندر کوئی ڈنڈا نہیں ہوتا۔ وہاں ان کے پاس نظم کو قائم رکھنے کے لیے کئی طرح کے معاون ادارے ہوتے ہیں' یہاں کوئی اور چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک اتفاق رائے ہے' لوگوں کی آزادانہ مرضی ہے' ساتھ دینا چاہیں تو دیں' نہ دینا چاہیں نہ دیں' کوئی جبر نہیں۔ لہٰذا جماعت کے معاملے کو حکومت وریاست پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ یہ ایکسرسائز وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھنا ہی نہیں' آگے بڑھنا ہی نہیں' کام کرنا ہی نہیں۔ وہ تھیوری اور نظریے کے اعتبار سے جو چاہیں بحث کر لیں۔

جماعتی سطح پر شورائیت کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں مشورے کی روح جاری

وساری رہے‘ یہ احساس نہ ہو کہ یہاں پر کوئی تحکمانہ انداز (authoritarianism) ہے‘ بلکہ مشورہ ضرور کیا جائے‘ لیکن پھر مشورے کے بعد فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہ ہو بلکہ جو صاحبِ امر ہے‘ جس پر اعتماد کر کے آپ نے اس کی رفاقت قبول کی ہے‘ اب فیصلہ آپ اُس پر چھوڑ دیں۔ یہ بات میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ سے اخذ کرتا ہوں‘ جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾ یعنی آپؐ ان سے معاملے میں مشورہ ضرور کیا کیجیے‘ پھر جو فیصلہ آپؐ کر لیں اس پر ڈٹ جایئے اور اللہ پر توکل کیجیے۔ دیکھ لیجیے یہاں ''عَزَمْتَ'' ہے ''عَزَمْتُمْ'' نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ فیصلہ counting of votes سے ہوگا‘ تعداد کی بنیاد پر ہوگا‘ بلکہ مشورہ امیر کی ضرورت ہے‘ لہٰذا وہ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کرے گا‘ لیکن حتمی فیصلے کا اختیار امیر کو ہوگا۔ پس ایک اسلامی جماعت اور تحریک کا نظم یہی ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انفاق فی سبیل اللہ

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں''۔ کھپاتے ہیں‘ لگاتے ہیں‘ صرف کرتے ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ لے آیئے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ''فَمَآ اُوْتِيْتُمْ'' اور جو سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ''اور اس میں سے خرچ کرو جس چیز میں بھی اس نے تمہیں خلافت عطا فرمائی''۔ تمہاری ذہانت بھی اللہ کا ایک عطیہ ہے جو اُس نے تمہیں دیا‘ تمہاری قوتِ کار اور تمہاری توانائیاں بھی اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ جو مال و اسباب تمہارے پاس ہے یہ اسی کا دیا ہوا ہے‘ اس کا عطیہ ہے‘ اولاد ہے تو اسی کی دی ہوئی ہے‘ اس کا عطیہ ہے۔ ان سب کو لگاؤ اور کھپاؤ اللہ کی راہ میں۔ اس کے بغیر تو ظاہر بات ہے قدم آگے کیسے بڑھے گا! یہ ساری چیزیں تو محفوظ رہیں‘ انہیں انسان بچا بچا کے رکھے اور خواہش کرتا رہے کہ کوئی دین کا کام بھی ہو جائے‘ تو کیسے ہو جائے گا!

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

بدلہ اور قصاص یا عفو و درگزر؟

مطلوبہ اوصاف کے ضمن میں متذکرہ بالا تین آیات بہت اہم اور بہت بنیادی ہیں‘ اور ان میں سے ایک ایک میں کئی کئی چیزیں آ گئی ہیں۔ اب اس کے بعد جو آیات آ رہی ہیں‘ ان میں ایک مضمون بدلہ اور قصاص کا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾

''اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو بدلہ لیتے ہیں''۔

یہ اس درس کی چوتھی آیت ہے‘ اور اس مضمون پر ایک بحث اگلی چار آیات پر محیط ہے۔ یہاں بظاہر ایک بڑا ہی مختلف انداز ہے اس سے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ دین کی دعوت کے ضمن میں ہونا چاہیے اور جس کی تلقین واقعتاً قرآن مجید میں بھی دعوتِ دین کے ضمن میں کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ دعوت کے میدان میں اور دعوت کی سطح پر‘ دعوت کے مرحلے پر یہی مطلوب ہوگا کہ لوگ گالیاں دیں تو تم دعائیں دو‘ لوگ پتھر ماریں تو تم پھول پیش کرو۔ وہاں بدلہ لینا دعوت کے راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ قرآن مجید کا حسنِ ربط‘ حسنِ ترتیب اور حسنِ اعجاز ہے کہ اس میں ہر سطح اور ہر مرحلے کے لیے ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ پچھلی سورت حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون چونکہ دعوت ہے لہٰذا وہاں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کا جواب اس نیکی سے دو جو بہترین ہو‘ پھر تم دیکھو گے کہ جس شخص کی تمہارے ساتھ عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا''۔ گویا دشمن کے بُرے رویے کے جواب میں حسن سلوک سے کام لینا‘ ان کی گالیوں کے جواب میں ان کو دعائیں دینا‘ ان کے تشدد اور ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خدمتیں کرنا‘ یہ دعوت کی تاثیر کے لیے لازم ہے۔ لیکن کیا اہل ایمان کا یہی دائمی وصف ہوگا؟

اوّل تو یہ جان لیجیے کہ اقامت دین سے جو شے مطلوب ہے وہ اقامتِ عدل و قسط ہے۔ میں اپنے مختلف خطابات میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اکثر و بیشتر قانون کا

تقاضا اخلاق و روحانیت کے تقاضے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی تھپڑ دے مارے تو اب آپ کے لیے دو راستے ہوں گے۔ ایک یہ کہ جواباً آپ بھی تھپڑ رسید کریں‘ ایک یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اگر انتقام لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود آپ معاف کرتے ہیں تو یہ آپ کی انفرادی تربیت اور روحانی ترفع کی طرف پیش قدمی کے لیے تو مفید ہے‘ لیکن اس سے اجتماعی سطح پر یہ نقصان ظاہر ہوگا کہ شریروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ جس نے ایک تھپڑ آج آپ کو مارا ہے‘ کل کسی اور کو مارے گا‘ اس لیے کہ اسے جوابی تھپڑ رسید نہیں ہوا‘ چنانچہ اس کی شرارت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ لہٰذا اجتماعی سطح پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) ’’اور اے ہوش مندو! بدلہ لینے میں تمہارے لیے زندگی ہے!‘‘ جس نے کسی کو تھپڑ رسید کیا ہے اس کو جوابی تھپڑ رسید کرو‘ ورنہ اس کی حوصلہ افزائی ہوگی‘ شرارت بڑھے گی اور زندگی کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی اسلامی تعزیرات کا فلسفہ ہے۔ شدید ترین تعزیرات اور شدید ترین سزاؤں کا مقصد یہی ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے ایسے حضرات کو بھی رجم کروایا کہ جن کے بارے میں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے مدینے کی پوری آبادی پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے باوجود انہیں رجم کروایا‘ اس لیے کہ اس کے ذریعے سے زنا کا سدّ باب ہوگا۔ اگر سزا نافذ نہیں کرتے‘ معاف کر دیتے ہیں تو زنا کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھے گا۔ یہ دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اسی طرح جو کچھ آپ نے حلال ذریعے سے کمایا‘ قانونی سطح پر اس میں سے صرف زکوٰۃ اور عشر لینے کے بعد جو کچھ آپ کا ہے وہ آپ کو دیا جائے گا‘ آپ کا حق تسلیم کیا جائے گا‘ لیکن اخلاقی سطح پر تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ بھی زائد از ضرورت ہے‘ اللہ کی راہ میں دے دو! تو یہ دو چیزوں میں بظاہر فرق ہے۔ بعض لوگ اس کو exploit کرتے ہیں کہ یہ تضادات ہیں۔ یا پھر ایک پہلو کو وہ کسی وجہ سے چھپاتے ہیں اور دوسرے کو نمایاں کرتے ہیں تو یہی درحقیقت گمراہی کی جڑ بن جاتی ہے۔ دونوں چیزوں کو بیک وقت نگاہ میں رکھئے۔ دعوت کے مرحلے پر

عفو و درگزر اور اقامت کے مرحلے پر بدلہ اور انتقام۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ’’اور برائی کا بدلہ تو برائی ہے ویسی ہی‘‘۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اب وہ بھکشوؤں کا سا انداز نہیں رہا‘ اب وہ خانقاہیت والا نظام یہاں نہیں رہا۔ یہ تو بڑا جارحانہ اور militant انداز ہے۔ ان دونوں کا مقام اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے‘ اس کا نام عدل اور انصاف ہے۔ کسی چیز کو اپنے مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیں گے تو یہ ظلم ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ’’وضع الشّیء فی غیر محلّہ‘‘ یعنی کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے۔ یہاں ’’مِثْلُهَا‘‘ کے لفظ سے یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنی ہی زیادتی ہو‘ اس سے زائد نہیں۔ یہ نہ ہو کہ انتقام کے جوش میں آ کر ایک تھپڑ کے بدلے میں دس تھپڑ مارے جائیں۔ یہ جائز نہیں‘ بلکہ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ’’اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے‘‘۔

البتہ اس کے ساتھ ہی فرما دیا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ ’’تو جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے‘‘۔ یہاں ایک بڑا لطیف اشارہ کر دیا گیا کہ معافی اس صورت میں دی جائے اگر یہ نظر آ رہا ہو کہ اس سے اصلاح ہو جائے گی۔ ایسی معافی نہ ہو جو شریروں کی ہمت افزائی کا ذریعہ بن جائے۔ جہاں آپ یہ محسوس کریں کہ زیادتی کرنے والے پر واقعی ندامت طاری ہو چکی ہے اور اسے اپنے کیے پر بڑا پچھتاوا ہے‘ میں اگر اسے معاف کر دوں گا تو اس میں اصلاح کی کیفیت پیدا ہوگی‘ اور آپ اسے معاف کر دیں تو اس طرح آپ اپنے لیے بہت بڑا اجر کما سکتے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا‘‘۔ اگر عفو سے ظلم کی جڑ کٹ جاتی ہو‘ اصلاح ہو جاتی ہو تو عفو بہتر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ ظالموں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی ہو اور نیک لوگ کونوں کھدروں میں‘ خانقاہوں میں بیٹھے رہیں اور شریروں کے لیے دنیا چھوڑ دیں۔ انہیں شریروں کی سرکوبی

کے لیے میدان میں آنا ہوگا۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۴۱﴾ ''اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان پر کوئی ملامت نہیں''۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دونوں چیزیں بیک وقت اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میرے معاف کر دینے سے اصلاح ہو جائے گی' بہتری کی توقع ہے تو معاف کر دے۔ اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے معاف کرنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے میں تو بدلہ لوں گا تو آپ اس کو ملامت کرنے کے درپے نہ ہو جائیں کہ دیکھو اچھا کام چھوڑ کر برا کام کر رہا ہے۔ یہاں واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی بدلہ لے' انتقام لے اس کے بعد کہ اُس پر ظلم ہوا ہے تو ایسے لوگوں کے اوپر کوئی ملامت کا راستہ نہیں ہے' آپ انہیں discourage نہیں کر سکتے' آپ انہیں ملامت نہیں کر سکتے۔ وہ ان کا حق ہے' وہ بدلہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرما دیا: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ﴾ (آیت ۱۴۸) ''اللہ تعالیٰ کو کسی بری بات کا بلند آواز سے کہنا پسند نہیں ہے' سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو''۔ مظلوم اگر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے درد سے کراہتے ہوئے چیخ و پکار کرتا ہے اور اس کی زبان سے اگر کوئی برا کلمہ نکل جاتا ہے تو اسے معاف کیا جائے گا' اس سے درگزر کیا جائے گا۔ عام حالات میں بری بات کا زبان سے نکالنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔

﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ﴾ ''یقیناً ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں''۔ لہٰذا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جو جماعت وجود میں آئے وہ منظّم ہو کر ان لوگوں کے مقابل خم ٹھونک کر میدان میں آئے جو ظلم کر رہے ہیں' جو لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں' جنہوں نے لوگوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ظلم معاشرتی بھی ہوتا ہے' معاشی بھی ہوتا ہے اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔ جو

لوگ دوسروں کو اپنا محکوم بنا لیں' وہ ظالم ہیں۔ جو معاشی طور پر دوسروں کو مفلوج کریں' وہ ظالم ہیں۔ جو دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں' وہ ظالم ہیں۔ جنہوں نے کچھ لوگوں کو گھٹیا قرار دے دیا ہے' وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہیں۔ اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے اور ایک آدم وحوا کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں میں سے بعض کو بڑھیا اور اعلیٰ قرار دے دینا اور بعض کو گھٹیا اور ادنیٰ سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ ظلم خواہ معاشرتی سطح پر ہو یا معاشی سطح پر یا سیاسی سطح پر' جو بھی ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے وہ ظالم ہے' اور سب سے بڑا ظلم اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے' وہ اس کا جائز حاکم ہے' جو اس حاکمِ حقیقی کے خلاف بغاوت کر رہا ہے اور ناحق سرکشی کر رہا ہے اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا؟ چاہے اس نے کچھ خیراتی ادارے بھی قائم کر دیے ہوں' فاؤنڈیشنز بنا دی ہوں' چاہے وہ ویلفیئر سٹیٹ بنائے بیٹھا ہو' لیکن اللہ کا حق غصب کیے ہوئے ہے اور اللہ کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلوا رہا ہے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴۲﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ ان ظالموں کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے اور دنیا میں بھی تم اپنے غصے اور ملامت کا ہدف اِن لوگوں کو بناؤ' نہ کہ اُن لوگوں کو جو مظلوم ہیں۔

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کر!

یہ شعر دراصل فارسی کے اس شعر کا اردو ترجمہ ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید!

ماہر القادری مرحوم کہتے ہیں کہ کوئی دعا ایسی بھی ہوتی ہے جس کی قبولیت کے لیے رحمتِ خداوندی پہلے سے بے تاب ہوتی ہے۔ دعا کریں تو سہی! ع ''ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!'' ایک دعا وہ بھی ہے جس کے لیے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کے پچھلے پہر سمائے دنیا پر نزول فرما کر ارشاد فرماتا ہے: ((هَلْ مِنْ

سَائِلٍ فَاُعْطِيَهٗ؟ هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ؟))(۱) ''ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں؟'' تو ماہر صاحب نے بھی اسی انداز میں ایک شعر کہا ہے

یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈ رہی ہیں ابھی سے تأثیریں!

بہرحال یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ ظلم‘ یہ عدوان‘ یہ تعدّی‘ یہ استحصال جس شکل میں بھی ہے ان لوگوں کے لیے ایک چیلنج ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں‘ جو اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت کے علمبردار ہیں‘ جو اس کے نظامِ عدل وقسط کے نام لیوا ہیں۔ ان کے خلوص واخلاص اور ان کی محبت خداوندی کا ثبوت یہ ہے کہ ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون (ہیں اس کے وفادار بندے جو قوت کو ہاتھ میں لے کر‘ لوہے کو ہاتھ میں لے کر) اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘ غیب میں رہتے ہوئے''۔ اس کی مدد کیا ہے؟ اس کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کا قیام‘ اس کے دین کا غلبہ! رسولوں کی مدد کیا ہے؟ کہ یہ اصلاً فرضِ منصبی رسول کا ہے‘ جو کوئی اس میں ہاتھ بٹاتا ہے وہ ان کا اعوان وانصار بنتا ہے۔

آخری آیت ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دیا کرے‘ تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔ اس راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر عفو ودرگزر کی ضرورت پیش آئے گی اور سب سے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے ضمن میں پیش آئے گی۔ ساتھی بھی تو ایک دوسرے پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھ اپنوں نے کیا نہیں کیا

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت!

یہ تو آج ہم کہتے ہیں کہ فلاں منافق تھا‘ فلاں منافق تھا‘ اس وقت تو وہ بظاہر حضور ﷺ

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها‘ باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل والاجابۃ۔ ومسند احمد۔ (الفاظ مسند احمد کے ہیں)

کے ساتھی تھے‘ لیکن کیا کر رہے تھے؟ کیا کچھ کیا ہے عبداللہ بن ابی نے! نہ معلوم کس کس نے کس کس طور سے ایذا پہنچائی ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شکوہ نقل ہوا ہے: ﴿يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ﴾ (الصّف:۵) ''اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا پہنچا رہے ہو در آں حالیکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں''۔ آپ اندازہ کیجیے کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے ہوں گے تو کتنا دکھا ہوا دل ہوگا۔ یہ فرعون اور آلِ فرعون کے مظالم کا شکوہ نہیں ہے‘ بلکہ اپنوں کے ہاتھوں جو چرکے اٹھائے ہیں ان کا ذکر ہے۔ تو بہرحال اس کا ایک محل تو یہ ہوگا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ ہو ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم! لیکن ظالموں‘ کافروں اور زمین میں جو اللہ کے باغی ہیں ﴿الَّذِيْنَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ اور اپنی حکمرانی کے دعوے دار ہیں ان سے انتقام اور بدلہ لیا جائے۔

آخر میں صرف ایک بات مزید نوٹ کر لیجیے کہ انقلابی تحریک کا ایک دَور وہ ہوتا ہے جس میں حکم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنے ہاتھ روکے رکھو ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ یہ حکم مستقل نہیں ہوتا‘ بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اپنے غیظ وغضب کو اپنے اندر پالتے رہو‘ اپنے آپ کو منظم کرو اور ایک طاقت بن جاؤ! علامہ اقبال کا یہ شعر اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ایک وقت آئے گا جب تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں گے‘ پھر یہ لاوا پورے زور شور کے ساتھ نکلے گا۔ اور وہ اُس وقت نکلا جب قرآن میں یہ حکم نازل ہوا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾﴾ (الحج) ''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو (جنگ کی) جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے‘ کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے''۔

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاكم بالآیات والذكر الحكیم oo

درس ٤

’حزب اللّٰہ‘ کی تشکیل میں فیصلہ کُن عامل
بمقابلہ ’حزب الشیطان‘

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمۡ رٰکِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ (المائدۃ)

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَلَا مِنۡہُمۡ ۙ وَیَحۡلِفُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبِ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَلَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۱۶﴾ لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾ یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیَحۡلِفُوۡنَ لَہٗ کَمَا یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ وَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۸﴾ اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ الشَّیۡطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۱﴾

لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَہُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَہُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ وَیُدۡخِلُہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ (المُجادلۃ)

﴿لَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۸﴾ اِنَّمَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ قٰتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَاَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَظٰہَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡہُمۡ ۚ وَمَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (المُمتحنۃ) صدق اللّٰہ العظیم

قبل ازیں ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت اور پھر سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ (جو مذکورہ بالا دو آیات سے متصلاً قبل ہے) میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ جو اجتماعیت اقامتِ دین‘ غلبۂ دین‘ اعلائے کلمۃ اللہ‘ تکبیر ربّ‘ حکومتِ الٰہیہ کے قیام یا اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے عظیم مقصد کے لیے قائم ہوٗ اسے کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیے۔ اوّل تو ہم نے سورۃ الصّف کی آخری آیت سے یہ سمجھا کہ اس جماعت کی ہیئتِ تشکیلی اس طور سے وجود میں آتی ہے کہ کوئی ایک داعی ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ کی پکار لگائے اور کچھ باہمت لوگ ﴿نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ﴾ کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کا ساتھ دینے پر کمرِ ہمت کس لیں۔ یہی بات ہمیں سورۃ الفتح کی آخری آیت میں ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ﴾ کے الفاظ میں ملی۔ اس مقصد کے لیے اب آئندہ جو اجتماعیت بھی قائم ہوگی‘ ظاہر بات ہے کہ اس میں ایک چیز نہیں ہوگی‘ یعنی جو بھی کوئی شخص کھڑا ہوگا وہ نبی اور رسول نہیں ہوگا‘ باقی اس اجتماعیت کا پورا خاکہ مکمل تفاصیل کے ساتھ ہمیں سیرتِ

نبویؐ ہی سے لینا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر اگرچہ بعض اعتبارات سے نامناسب ہے لیکن اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے اس بات کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے کہ ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو!

تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں جماعتی زندگی کا پورا نقشہ وہیں سے لینا ہے' وہی ہمارے لیے اُسوۂ کاملہ ہے' البتہ اس میں سے جو حصہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ساقط ہو چکا ہے اس کو اپنے ذہن سے بھی دُور رکھنا ہے' کہیں اس مغالطے میں مبتلا نہیں ہو جانا۔ اس کے لیے شعوری طور پر اپنی حفاظت کا اہتمام کرنا ہے کہ کہیں غلو نہ ہو جائے' کہیں حدّ اعتدال سے تجاوز نہ ہو جائے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے کے لیے جو لوگ ایک جمعیت کی شکل اختیار کر لیں ہم نے ان کے اوصاف کی تین جہات (dimensions) معین کی تھیں۔ اوّلاً تعلق مع اللہ' ثانیاً آپس کا رشتۂ اخوت و رفاقت' اور ثالثاً جو مقابلے پر ہوں' یعنی کفار' ان کے ساتھ اس کے برعکس ایک کیفیت۔ اور یہ تیسری چیز اصل میں جہاد فی سبیل اللہ ہے' یعنی جان اور مال کا کھپانا۔ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے اس کے مقتضیات' اس کے تقاضے' اس کے مراحل اور اس کے لوازم چونکہ ہمارے منتخب نصاب (۱) میں بالتفصیل بیان ہو جاتے ہیں لہٰذا اس نصاب میں ہم نے ان کو شامل نہیں کیا۔ اسی طرح تعلق مع اللہ کا بیان بھی ایمان کے مباحث میں تفصیلاً زیر بحث آ جاتا ہے۔ البتہ اب ہمیں جن چیزوں پر گفتگو کرنی ہے ان میں ایک تو وہ باہمی رشتۂ اخوت و رفاقت ہے جو اس اجتماعیت کے اندر مطلوب ہے' اور پھر یہ کہ اس کے برعکس جو لوگ مدّمقابل ہوں' جو اِس جدوجہد میں مزاحم ہو رہے ہوں' ان کے ساتھ طرزِ عمل کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ پیشِ نظر اجتماعیت کی صورت میں جو نظم قائم ہو رہا ہے اس میں داعی اور وہ لوگ جو اُس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان و انصار بن کر حاضر ہو رہے ہوں' ان کے مابین ایک نئی نسبت امیر اور مأمور کی قائم ہو رہی ہے اور یہ نسبت اب سارے ڈسپلن

کی اساس ہے۔ چنانچہ اب ہمیں زیادہ تر انہی دو گوشوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں explore کرنا ہے۔

سورۃ الحدید سے لے کر سورۃ التحریم تک جو مدنی سورتیں ہیں ان میں سے متعدد سورتیں پوری کی پوری ہمارے اصل منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ سورۃ الحدید اُس کا نقطۂ عروج اور کلائمکس ہے۔ اس پر وہ نصاب ختم ہوتا ہے' بلکہ پورا چھٹا حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اس منتخب نصاب کے چوتھے حصے میں سورۃ الصّف' سورۃ الجمعۃ اور سورۃ المنافقون شامل ہیں۔ اس سے بھی پیچھے جائیے تو اس کے تیسرے حصے میں سورۃ التحریم ہے۔ مزید پیچھے جائیے تو اس کے دوسرے حصے میں جہاں ایمان کے مباحث آتے ہیں' سورۃ التغابن موجود ہے۔ تو یوں سمجھئے کہ ان دس سورتوں میں سے چھ سورتیں تو پہلے ہی ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ اب یہاں آپ نوٹ کیجیے گا کہ یہ جو دو حصے مَیں آپ کے سامنے لا رہا ہوں ان میں سے اکثر و بیشتر انہی دس سورتوں میں سے منتخب مقامات ہیں۔ اقامت دین اور نظامِ عدل و قسط کے قیام کی جدوجہد ﴿لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ﴾ کا تعین سورۃ الحدید میں ہو جاتا ہے' اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ کی جدوجہد سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون ہے۔ اس کے لیے جو اجتماعیت قائم ہو گی اس کے استحکام کے لیے ہدایات بھی آپ کو انہی سورتوں (مثلاً سورۃ المجادلۃ' سورۃ الممتحنۃ) میں ملیں گی۔ لہٰذا یہ بات پھر ذہن نشین کر لیجیے کہ مکی اور مدنی سورتوں کا یہ گروپ' جس میں سات سورتیں مکی ہیں (سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ) اور دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم)' ان میں مکی اور مدنی کی نسبت بڑی عجیب ہے۔ سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات میں ارشاد ہوا: ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴿۲﴾ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴿۳﴾﴾ تو جہاں تک انذار کا تعلق ہے ﴿قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴿۲﴾﴾ وہ اس گروپ کی سات مکی سورتوں کا مرکزی مضمون ہے' جبکہ تکبیرِ ربّ ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴿۳﴾﴾ اس گروپ کی دس مدنی سورتوں کا main theme ہے۔ چنانچہ ان سورتوں میں ہمیں ان تمام سوالات کے جوابات ملتے ہیں کہ تکبیرِ ربّ کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کے لیے دو اصطلاحات کیا

ہیں؟ پھر یہ کہ اس کے لیے بنیادی منہاج کیا ہے؟ اس کے لیے جو جماعت قائم کرنی ہے اس جماعت کی تربیت کس طور سے ہوگی؟ اس کے لیے جو دعوت دینی ہے اس دعوت کے لیے منبع وسرچشمہ اور مرکز ومحور کون سا ہوگا؟ اس جدوجہد سے پہلو تہی کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس جدوجہد کے لیے جو اجتماعیت قائم ہوگی اس کی اساسات کیا ہیں؟ اور اس کے استحکام کے لیے کون کون سی چیزیں ہیں کہ جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟ یہ ایک اہم حقیقت ہے جس کو اگر آپ ذہن نشین کر لیں گے تو امید ہے کہ ان سورتوں کے مابین ربط وتعلق اور منطقی ترتیب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ آپ کو ایک باطنی بصیرت عطا فرمائے گا۔

اب ہم سورۃ المائدۃ کی آیات ۵۵ اور ۵۶ پر غور کرتے ہیں:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾

”تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اس کے رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں‘ زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے تو (وہ جان لے کہ) اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے“۔

گویا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہونے والی تنظیم میں شامل ہونے والے ساتھیوں میں جو باہمی رشتۂ محبت واخوت مطلوب ہے اس کی اصل جڑ ایک نسبتِ ولایت یعنی ایک دوستی کا سلسلہ ہے۔ سلسلہ زنجیر کو کہتے ہیں اور زنجیر کڑیوں (links) سے مل کر بنتی ہے۔ تو اس زنجیر کی تین کڑیاں ہیں۔ اس کی اصل اساس اور اصل الاصول اللہ سے رشتۂ ولایت ہے۔ اللہ اہل ایمان کا ولی ہے اور اہل ایمان اللہ کے اولیاء۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ: ۲۵۷) اور: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ (یونس) اس لفظ ”ولایت“ کا مفہوم کیا

ہے؟ اردو میں ہم محبت‘ حمایت‘ پشت پناہی‘ مددگاری جیسے بہت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں‘ ان سب کا خلاصہ عربی زبان میں نسبتِ ولایت ہے۔ ”اللہ ولی ہے اہل ایمان کا“ سے مراد یہ ہے کہ اللہ اہل ایمان کا دوست ہے‘ کارساز ہے‘ پشت پناہ ہے‘ حامی ہے‘ ناصر ہے‘ مددگار ہے‘ محافظ ہے۔ یہ گویا کہ ایمان کا لبّ لباب اور ایمان کا حاصل ہے کہ اللہ اور بندے کے مابین یہ رشتۂ ولایت قائم ہو جائے‘ لیکن یاد رہے کہ یہ رشتہ ”ولایتِ باہمی“ کا ہوگا۔

سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مضمون کی تمہید پڑ چکی ہے۔ اس آیت میں تین جہات (dimensions) ذکر ہوئی تھیں: (۱) ”يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ“ (۲) ”اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ“ (۳) ”يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ“۔ اب اس آیت میں پہلی دو نسبتوں کا خلاصہ نکالا جا رہا ہے کہ اس تنظیم میں شریک لوگوں میں جو رشتۂ اخوت ومحبت مطلوب ہے اس کی اصل جڑ بھی وہی ہے کہ پہلا رشتۂ محبت اللہ کے ساتھ مضبوط ہو تو یہ زنجیر آگے چلے گی۔ اگر اساس ہی ابھی نہیں پڑی تو زنجیر آگے کیسے چلے گی؟ اصل شے تو یہ ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ یعنی وہ لوگ کہ جو حقیقتاً مؤمن ہیں وہ اللہ کے ساتھ محبت میں شدید ترین ہوتے ہیں۔ اللہ کی محبت اگر تمام محبتوں پر غالب نہیں تو ظاہر ہے کہ اب یہ سلسلہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ مطلوب تو یہ ہے کہ معیارِ محبت ونفرت اور دوستی وعداوت اللہ کی ذات پر آ کر ٹھہر جائے۔ جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ))[۱]

”جس نے محض اللہ کے لیے کسی سے دوستی کی‘ اللہ ہی کی خاطر کسی سے بغض رکھا‘ اللہ ہی کے لیے کسی کو کچھ دیا اور اللہ ہی کے لیے کسی سے کچھ روک رکھا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا“۔

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب السنۃ‘ باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

اگر یہ بات نہیں ہوئی تو ظاہر بات ہے کہ آگے بھی دوستیوں کے معیار مختلف ہوں گے‘ دوستیاں منتشر ہوں گی‘ محبتیں مختلف سمتوں میں بکھر جائیں گی‘ کسی سے کسی اعتبار سے محبت ہوگی‘ کسی سے کسی اور اعتبار سے محبت ہوگی۔ اس محبت کو منظم کرنے کے لیے‘ یکسو کرنے کے لیے اور اس قلبی تعلق کو ایک زنجیر کی شکل دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ ﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ﴾ یعنی پہلے تو تمہارا دل اس پر ٹھک جانا چاہیے کہ تمہارا دوست‘ تمہارا ساتھی‘ تمہارا ہمدرد‘ تمہارا خیر خواہ‘ تمہارا بہی خواہ‘ تمہارا پشت پناہ‘ تمہارا حامی‘ تمہارا مددگار اللہ ہے۔ اور دوسرے نمبر پر ﴿وَرَسُوْلُہٗ﴾ ’’اور اس کا رسول‘‘۔ اب یہاں سے دوسرا لنک قائم ہو رہا ہے۔ تو جس طرح اطاعت میں اللہ کے ساتھ رسول نتھی (bracketted) ہو جاتے ہیں اور اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت ایک وحدت ہے اسی طرح کا معاملہ اللہ کی محبت اور رسول کی محبت کا ہے۔ رسول کی محبت اصل میں اللہ کی محبت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ سے جوڑنے والے کون؟ رسول! اللہ سے متعارف کرانے والے کون؟ رسول! اللہ کی راہ میں چلنے کے لیے اُسوۂ کاملہ فراہم کرنے والے کون؟ اللہ کے رسول! ہمیں اگر نماز کی توفیق ہو رہی ہے تو ہر شخص کی اس نماز کے اندر کس کی محنتیں اور مشقتیں شامل ہیں؟ اللہ کے رسول کی! ان کی توانائیاں‘ ان کی قوتیں‘ ان کی صلاحیتیں ہیں کہ جن کا یہ ظہور ہو رہا ہے‘ کہ ان کے طفیل ہم نمازیں پڑھ رہے ہیں‘ روزے رکھ رہے ہیں۔ یہ سارا دین آپ ﷺ ہی کے ذریعے تو ہم تک پہنچا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کی محبت کے ساتھ رسول ﷺ کی محبت بھی ناگزیر ہے۔ اور جب تک باقی تمام چیزوں اور شخصیتوں کی محبت پر رسول ﷺ کی محبت غالب نہیں ہوگی‘ ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔ از روئے حدیث نبویؐ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۱)

’’تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد‘ اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں‘‘۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب حبّ الرسول من الایمان۔

اب اگر یہ لنک قائم ہو گیا ہے تو اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’اور اہل ایمان بھی (تمہارے رفیق ہیں)‘‘۔ اب تیسرے درجے میں یہ محبت غالب ترین ہونی چاہیے۔ جیومیٹری میں اگر آپ ایک نقطے سے کوئی خط کھینچیں تو کسی بھی سمت میں کھینچ سکتے ہیں‘ لیکن اگر دو نقطے معین ہو جائیں تو اب ظاہر بات ہے کہ ان کو ملاتا ہوا سیدھا خط صرف ایک ہی سمت میں کھینچا جا سکتا ہے‘ اس کی کوئی اور سمت ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر یہ رشتۂ ولایت و محبت اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ قائم ہو جائے تو پھر محبت کے کہیں بھٹکنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اب یہ تیر کی طرح اس رُخ پر سیدھی جائے گی ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اب یہ محبت ہوگی ان کے لیے جو ایمان لائے‘ چاہے ان سے کوئی خونی رشتہ نہ ہو‘ چاہے ان سے قبیلے کا‘ لسان کا‘ نسل کا‘ وطن کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ رشتۂ ایمان موجود ہے تو محبت ہے‘ اور اگر یہ رشتۂ ایمان موجود نہیں ہے تو چاہے حقیقی بھائی ہو‘ چاہے باپ اور بیٹے کی نسبت ہو‘ چاہے بیوی اور شوہر کا تعلق ہو‘ سب پس منظر میں جا کر دھندلا جائے گا۔ قانونی معاملات کی نوعیت کچھ اور ہے‘ وہ میں بعد میں عرض کر دوں گا‘ یہاں اصل میں دلی لگاؤ‘ تعلق خاطر اور محبت قلبی کی بات ہو رہی ہے: ﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’تمہارا دوست تو بس اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور جو ایمان والے ہیں‘‘۔

اب آگے ’’اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ کی وضاحت کر دی گئی کہ کون اہل ایمان! اہل ایمان میں تو منافق بھی تھے۔ کیا ان سے محبت ہوگی؟ ظاہر بات ہے کہ قانونی طور پر تو وہ مسلمان تھے اور ان کے اس لیگل سٹیٹس کا یہ تقاضا تھا کہ عبداللہ ابن اُبی بھی مرا تو اس کی نماز جنازہ پڑھا دی گئی‘ اس لیے کہ بحیثیت مسلم یہ بات اس کے حقوق میں شامل تھی۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ......))(۱) ’’ایک

(۱) یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے اور حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ)) قِیْلَ: مَا ھُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((اِذَا لَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ‘ وَاِذَا دَعَاکَ فَاَجِبْہُ‘ وَاِذَا اسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَہٗ‘ وَاِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰہَ فَشَمِّتْہُ‘ وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْہُ‘ وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْہُ))

(باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں......'' یہ حقوق اس وقت تک ساقط نہیں ہوں گے جب تک کہ اسے مسلمان مانا جائے۔ یعنی جب تک وہ قانونی ایمان کے درجے میں ہے اس کے یہ حقوق برقرار رہیں گے۔ اسی طرح اس سے آگے بڑھ کر کوئی شخص صرف مسلمان ہی نہیں' آپ کا بھائی بھی ہے' یا آپ کے والد ہیں' یا آپ کے عزیز ہیں' تو ان کے جو بھی قانونی حقوق ہیں وہ برقرار رہیں گے' وہ آپ کو دینے ہوں گے۔ البتہ یہ کہ اگر وہ مرضِ نفاق کا شکار ہیں تو ان کے ساتھ رشتۂ محبتِ قلبی برقرار نہیں رہے گا۔ اگر وہ برقرار رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ پہلے دو نقطے (اللہ کی محبت اور رسولؐ کی محبت) ہی صحیح طور پر وجود میں نہیں آئے۔ وہ اگر مستحکم ہو گئے ہوں تو ممکن نہیں ہے کہ یہ محبتِ قلبی کوئی اور سمت اختیار کرے۔

وہ اہل ایمان کون ہیں؟ فرمایا:﴿ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴾ ''جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جھکے ہوئے ہوتے ہیں''۔ اس آیت میں اہل ایمان کی تین صفات بیان ہوئی ہیں۔ جہاں تک اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا تعلق ہے یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم میں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات اور سورۃ المعارج کی درمیانی آیات کے ذیل میں تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے۔ اب اس مقام پر اصل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ﴿وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کس سے متعلق ہے؟ بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ ان اہل ایمان کی جو پوری ایک باطنی کیفیت ہے' یعنی فروتنی' عجز' جھکے ہوئے رہنا' اس کے اظہار کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں عباد الرحمٰن کی

(گزشتہ سے پیوستہ) ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں''۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا: ''(۱) جب تم اس سے ملو تو اسے سلام کرو' (۲) جب وہ تمہیں (کھانے وغیرہ کی) دعوت دے تو اسے قبول کرو' (۳) جب وہ تم سے خیر خواہی چاہے تو اس کی خیر خواہی کرو' (۴) جب اسے چھینک آئے اور وہ ''الحمد للہ'' کہے تو تم ''یرحمک اللہ'' کہو' (۵) جب وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کرو' (۶) اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (اور اس کی نماز جنازہ پڑھو)''

خصوصیات کے ضمن میں الفاظ آئے ہیں: ﴿الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ''جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں''۔ ان کی نشست و برخاست سے' ان کی چال ڈھال سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ سمجھتے ہیں' آقا نہیں سمجھتے۔ ان کے اندر فروتنی ہو' تواضع ہو۔ ﴿وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جس کی طرف ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ یا ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے' کہ اہل ایمان کے سامنے جھکے رہنے والے' ان کے لیے متواضع' ان کے لیے اپنے کندھوں کو اس طرح جھکا دینے والے جیسے کہ مرغی اپنے بچوں پر اپنے پروں کو جھکاتی اور پھیلاتی ہے' یا جس کا نقشہ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ جیسے کہ ایک شخص کو اپنے والدین کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا کر رہنا چاہیے۔

اس ضمن میں میری ایک ذاتی رائے ہے' جو میرے علم کی حد تک تاحال کسی اور نے ظاہر نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کہ ظاہر کی ہو لیکن میرے علم میں نہ ہو۔ قرآن حکیم پر غور و فکر کرتے ہوئے بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی ایک بات کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا اور میں سمجھتا رہا کہ شاید کسی اور نے یہ بات نہیں کہی ہے اور اس کی وجہ سے اس رائے پر میرا دل پوری طرح سے ٹھک نہیں سکا کہ یہ بات شاید کسی اور نے نہیں کہی ہے' ہو سکتا ہے کہ غلط ہو' لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رائے سلف میں موجود ہے تو اس پر اطمینان ہوا۔ مثال کے طور پر صوم کے بارے میں مَیں نے بہت پہلے ایک رائے ظاہر کی تھی' بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہی مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی رائے ہے اور یہ رائے سلف میں موجود ہے۔ سورۃ الحج کی آیات ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا......﴾ کے بارے میں میرا ایک وجدانی خیال تھا کہ یہ اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئی ہیں۔ بعد میں مجھے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول مل گیا کہ ان کی رائے بھی یہی ہے۔ تو میں یہی بات عرض کر رہا ہوں کہ ﴿وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کے بارے میں میری جو رائے ہے میرے علم کی حد تک یہ بات کسی اور نے نہیں کہی ہے' لیکن اللہ کرے کہ سلف میں کسی اور نے کہی ہو'

اور مجھے اس پر اور زیادہ اعتماد ہو جائے۔ وہ رائے یہ ہے کہ ﴿وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کا تعلق اصل میں ﴿وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ کے ساتھ ہے۔ کوئی شخص کسی کو کچھ دے رہا ہوتا ہے تو اس میں ایک فطری بات ہے کہ دینے والا اپنے آپ کو اس لینے والے سے بالاتر سمجھ بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس فطری بات کا اظہار ایک حدیث میں بھی ہوا کہ ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))(۱) حضور ﷺ نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے''۔ یہاں اصل میں حضور ﷺ نے انفاق کی ترغیب دلانے کے لیے فرمایا ہے کہ ''دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے''۔ اور اس میں ایک طرح کی تعلیم بھی ہے کہ لینے سے حتی الامکان بچنا چاہیے' انسان اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرے اور کوشش کرے کہ محنت سے کمائے اور اپنی ضروریات خود پوری کرے۔ تو جب دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے تو اب اس کا ایک عکس دینے والے پر پڑ سکتا ہے اور وہ یہ خیال کر سکتا ہے کہ میں برتر ہوں اور یہ کم تر ہے۔ چنانچہ ایتائے زکوٰۃ کا معاملہ اس انداز سے ہو کہ آدمی عاجزی سے' جھک کر دے رہا ہو' بجائے اس کے کہ اکڑ کر دے رہا ہو۔

یہ معاملہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس تحریک میں' اس جماعت میں' اس جدوجہد میں جو ہمارے ساتھ شریک ہیں' ان میں سے وہ لوگ جو حاجت مند ہوں' اور خاص طور پر وہ لوگ جو اس لیے حاجت مند ہو گئے کہ انہوں نے اپنی توانائیاں اللہ کے دین کے لیے وقف کر دی ہیں' اب ظاہر بات ہے کہ ان کی کوئی خدمت' ان سے کوئی تعاون' ان کی کوئی مدد اگر کی جائے گی تو جھک کر ہی کی جائے گی۔ وہ فقیر تو نہیں ہیں' مانگنے والے تو نہیں ہیں' وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں' وہ اپنی ساری ضروریات خود پوری کر سکتے ہیں' لیکن وہ اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں۔ اس کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۳ اچھی طرح سمجھ لیں۔ سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۶ اور ۳۷ انفاق فی سبیل اللہ ہی کے موضوع پر ہیں۔ رکوع ۳۷ میں یہ آیت آئی ہے کہ

(۱) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب لا صدقة الا عن ظهر غنى۔ وصحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب بيان ان اليد العليا خير من اليد السفلى ......

اس انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے اعلیٰ مصرف کیا ہے اور اس کے اوّلین مستحق کون ہیں؟ یہ بات مَیں بعض دروس میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ اسلام میں سوال کی مذمت ہے اور اسلام گداگری کو ایک ادارہ (institution) کی حیثیت سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں خیرات بانٹنے کا جو طریقہ رائج ہو گیا ہے' یہ درحقیقت اس institution کو تقویت دینے اور اس کو مستحکم کرنے کا موجب ہے۔ لہٰذا جان لینا چاہیے کہ اس قسم کی گداگری اور خیرات بانٹنے کی یہ کیفیت ہرگز اسلام کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۳ میں بیان کیا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑھ کر مستحق کون ہے اور اس انفاق فی سبیل اللہ کا اصل ہدف کیا ہوگا۔

فرمایا: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اُن احتیاج والوں کے لیے جو گھر گئے ہوں اللہ کے راستے میں''۔ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جو لوگ اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں وہ انفاق کے اوّلین مستحق ہیں۔ اس کے ذیل میں وہ لوگ بھی آئیں گے جو صرف دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ وہ جو تین تین سو اصحابِ صفہ حضور ﷺ کی صحبت میں رہتے تھے' ظاہر بات ہے کہ وہ بھی محنت کر سکتے تھے' معاشی جدوجہد کر سکتے تھے' لیکن انہوں نے اپنے آپ کو روک لیا تھا' تھام لیا تھا' وابستہ کر لیا تھا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور انہی کے ذریعے سے مشکوٰۃِ نبوت کی روشنی پورے عالم میں پھیلی۔ انہی میں سے ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو حدیث نبویؐ کے پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے۔ اگرچہ وہ ۷ھ میں ایمان لانے والوں میں سے ہیں' لیکن ان کی روایت کردہ احادیث کی تعداد صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑھ کر ہے' اس لیے کہ وہ تو اپنے آپ کو باندھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے ذریعے سے علمِ حدیث پھیلا۔

فی سبیل اللہ کے ضمن میں ہمارے سامنے جہاد فی سبیل اللہ کا پورا جامع نقشہ ہونا چاہیے۔ اس کے مختلف گوشے' مختلف شعبے اور اس کے لیے ہمہ وقت' ہمہ تن لوگوں کی ضرورت پیش نظر رہنی چاہیے۔

﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ﴾ ''وہ زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے''۔ وہ اس سبیل اللہ کی جدوجہد میں اس طرح محصور ہو کر رہ گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ یہاں زمین میں چلنا پھرنا سے مراد اپنی معاشی جدوجہد کے لیے چلنا پھرنا ہے' بھاگ دوڑ ہے۔ یہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے ضربًا فی الارض کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی معاش کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کر سکتے۔

﴿یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ﴾ ''ناواقف انہیں غنی سمجھتا ہے ان کی خودداری کی وجہ سے''۔ وہ اپنی عفت اور عزت کی حفاظت کرتے ہیں' وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنی عزتِ نفس ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے سامنے پیش نہیں کرتے' بلکہ وہ خودداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ سائل نہیں ہیں' مانگتے نہیں ہیں' لہٰذا ناواقف شخص یہ سمجھے گا کہ یہ غنی ہیں' ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ان کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔

﴿تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ﴾ ''ہاں ان کو تم پہچان سکتے ہو اُن کے چہروں سے''۔ تم ان کی اندرونی حالت کا اندازہ ان کے چہروں سے کر سکتے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کسی کو فاقہ آیا ہوا ہے تو اس کے چہرے پر نمایاں ہوگا۔ اگر کوئی کسی معاشی پریشانی اور الجھن میں ہے تو وہ اس کے تمام اطوار سے ظاہر ہو گی' لہٰذا انہیں ڈھونڈو' انہیں تلاش کرو! وہی دراصل اس انفاق کے صحیح ہدف ہیں۔

﴿لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط﴾ ''وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے''۔ لپٹ کر سوال کرنا گداگری کا انداز ہے جو اصل میں ایک پیشہ ہے' ایک مزدوری ہے۔ گداگر تو اپنی اس محنت کی اجرت آپ سے لیتے ہیں کہ جو انہوں نے آپ کا گھیراؤ کر کے اور آپ سے لپٹ کر آپ سے کچھ نکلوانے کے لیے کی ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴾ ''اور جو کچھ مال تم خرچ کرو گے تو وہ یقیناً اللہ کو معلوم ہے''۔ اب دیکھئے' ایسے لوگوں کو جو کچھ آپ دیں گے تو اس وقت

ایک تو وہ کیفیت ہونی چاہیے جو ابھی ہم نے پڑھی کہ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ۔ ان کو کسی احساسِ برتری کے تحت نہیں دیا جائے گا' بلکہ اس احساس کے تحت دیا جائے گا کہ برتر وہ ہیں' ہم تو دنیا کے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں' ہم اس کام میں ہمہ وقت' ہمہ تن نہیں آ سکے' یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے ہمت کی ہے اور یہ چھلانگ لگائی ہے' تو برتر وہ ہیں نہ کہ ہم۔ اور اگر وہ قبول کر لیں تو ان کا احسان ہے' نہ کہ ہمارا احسان ان پر کہ ہم انہیں کچھ دے رہے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ یہ انفاق خالصتاً اخفاء کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ یہاں اس کا اشارہ کر دیا گیا: ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴾ یعنی جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے' جو خیر' جو بھلائی' جو مال تم اللہ کی راہ میں ان خوددار ضرورت مندوں کو دو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے' اللہ اس کو جانتا ہے۔ تمہیں اس کے لیے کہیں اور اعلان کرنے کی اور اس کا کہیں چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سورۃ المائدۃ کی اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ ''اور جو کوئی دوست رکھے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو تو (اسے معلوم ہو کہ یہ ہے اللہ کی جماعت اور) اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے''۔ اب یہ مضمون گویا کہ تاکیدی شکل میں آ رہا ہے' اصل بات تو پوری ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ جس کسی کا محبت کا یہ تعلق اور رشتۂ ولایت اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور اہل ایمان سے قائم ہو جائے۔ اب یہاں عبارت میں ایک حذف ہے کہ ''اب یہ لوگ بنیں گے حزب اللہ''۔ ان سے درحقیقت اللہ کی پارٹی وجود میں آئے گی۔ یہ اس اجتماعیت کی وہ روح ہے جو اگر اس میں جاری وساری ہے تو یہ لوگ حزب اللہ کہلانے کے اہل ہوں گے۔ اگر حذف کھول دیا جائے تو ترکیب یوں ہو گی: ''اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ'' (تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ کی پارٹی بنیں گے اور جان لو کہ اللہ کی پارٹی بہرحال غالب آ کر رہے گی۔) غلبہ پھر انہی کے لیے ہوگا۔ لیکن اس کے لیے پیشگی اہلیت (prequalification) سے آگاہ کر دیا گیا کہ کون لوگ حزب اللہ یا اللہ کی جماعت بننے کے اہل ہیں۔

اصل مضمون تو سورۃ المائدۃ کی آیات ۵۵'۵۶ میں پورا ہو گیا' اب اس کی شرح سورۃ المجادلۃ کی آیات ۱۴ تا ۲۲ میں ملاحظہ کر لیجیے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان آیات میں ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا'' کے اصول کے تحت حزب اللہ کے مقابلے میں حزب الشیطان کا concept بھی لایا جا رہا ہے' کہ ظاہر بات ہے کہ یہاں صرف حزب اللہ ہی نہیں ہے' حزب الشیطان بھی ہے' اور ان کے مابین ہمیشہ سے معرکہ آرائی جاری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

یہ کشمکش دو پارٹیوں کے مابین ہے' ایک حزب اللہ ہے تو مقابلے میں حزب الشیطان بھی ہے۔ اب اس حزب الشیطان کا ایک حصہ تو وہ ہے جو بالکل ظاہر و باہر ہے' سامنے ہے' مدّ مقابل ہے' سامنے سے وار کر رہا ہے۔ لیکن ایک عنصر خود مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے جو حزب الشیطان کا ایجنٹ بنتا ہے۔ یہ مارِ آستین ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جس نے اس مدّ مقابل حزب الشیطان کے ساتھ (جو قانونی سطح پر بھی کھلم کھلا کافر ہیں) کوئی رشتۂ اخوت ابھی جوڑ رکھا ہے اور کوئی محبت کا تسمہ ابھی لگایا ہوا ہے' حالانکہ ان کے ساتھ محبت کے کوئی تسمے اگر ابھی لگے ہوئے ہیں' کوئی رشتۂ اخوت باقی رہا ہے تو یہی اس حزب اللہ کے لیے بالقوۃ کمزوری کا مقام (potential source of weakness) ہے۔ یہ گویا کہ اس فصیل کا رخنہ ہے جس میں غنیم کسی بھی وقت داخل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان آیات میں پہلے تو ان منافقین کا کردار بیان ہوا ہے۔ منافقین کے بارے میں ہمارے ہاں ایک غلط فہمی عام ہے کہ یہ کردار صرف رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھا اور اس کا آج کے دور سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کے دوران جب کسی مقام پر منافقین کا تذکرہ آتا ہے تو بالعموم دل پر ایک حجاب سا آ جاتا ہے کہ یہ تو منافقوں کی بات ہوئی' لیکن جان لیجیے کہ منافق جو تھے ان کے ماتھے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا کہ یہ منافق ہیں' قانوناً وہ مسلمان تھے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھئے کہ یہ کیفیت ہمارے اندر نہیں ہو

سکتی۔ حقیقتِ نفاق پر اپنے مفصل دروس کے دوران میں سب سے زیادہ اسی نکتے کو emphasise کرتا ہوں۔ تو اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ انہیں کوئی علیحدہ کیٹیگری نہ سمجھئے' بلکہ یہ مسلمانوں ہی میں گڈمڈ ہوتے ہیں' انہی کی صفوں میں موجود رہتے ہوئے یہ غنیم کے ایجنٹ بن جاتے ہیں' اس لیے کہ کوئی سابقہ دوستی تھی' کوئی سابقہ رشتہ داری تھی' کوئی آپس کا کبھی کوئی معاملہ رہا تھا' آپس میں حلیف تھے' ایک دوسرے کے حمایتی تھے' لہٰذا کوئی نہ کوئی رشتۂ محبت واخوت باقی رہا اور شعوری طور ان بندھنوں کو نہیں کاٹا۔ نتیجتاً اس حزب اللہ کے لیے بالقوۃ ایک خطرہ وجود میں آ گیا کہ کہیں اندر ہی اندر اس راستے سے غنیم در نہ آئے۔

اب ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو یہ رشتۂ ولایت واخوت ومحبت قائم کیے ہوئے ہیں ایک ایسی قوم سے'' ﴿غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''جو اللہ کی مغضوب ہے''۔ جن پر اللہ کا غضب بالکل ظاہر و باہر ہے' جو اِس لائن کے اُس پار کھڑے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کی صفوں میں رہتے ہوئے بھی ان کے تعلقات کفار کے ساتھ ہیں' اعداء اللہ کے ساتھ ہیں' حزب اللہ کے کھلم کھلا مخالفین اور معاندین کے ساتھ ہیں۔ ﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ﴾ ''یہ لوگ نہ تم میں سے ہیں نہ اُن میں سے''۔ یہ وہ منافقین ہیں کہ شامل تمہاری صفوں میں ہیں اور رشتۂ محبت اُن سے ہے' تو یہ نہ تمہارے ہیں نہ اُن کے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) کہ وہ بیچ میں کچھ لٹک کر رہ گئے ہیں' مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں' نہ یہ ان کی طرف ہیں نہ اُن کی طرف ہیں۔ ﴿وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور وہ قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ پر جانتے بوجھتے''۔ جہاں تک مرضِ نفاق کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ غیر شعوری نفاق ہو' لیکن جب آدمی جھوٹی قسم کھا رہا ہوتا ہے تو وہ غیر شعوری نہیں ہوتی' وہ تو اس کو معلوم ہے کہ میں جھوٹ پر قسم کھا رہا ہوں۔

﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''یہ وہ

لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے شدید عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ بے شک بہت ہی برا طرزِ عمل ہے جو انہوں نے اختیار کیا ہے''۔

آگے تقریباً وہی الفاظ آ رہے ہیں جو سورۃ المنافقون میں موجود ہیں۔ فرمایا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے'' ﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تو یہ خود بھی رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں اللہ کی راہ سے''۔ صَدَّ ، يَصُدُّ فعل لازم بھی ہے اور فعل متعدی بھی۔ اس کا معنی خود رکنا بھی ہے اور دوسروں کو روکنا بھی۔ ﴿فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٦﴾﴾ ''تو ان کے لیے بہت ہی رسوا کن عذاب ہے''۔

﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ﴾ ''ہرگز بچا نہ سکیں گے ان کو نہ ان کے مال نہ ان کی اولادیں اللہ کے عذاب سے کچھ بھی''۔ ﴿اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾﴾ ''یہ دوزخ والے ہیں اور اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے''۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا'' ﴿فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ ''تو یہ اس کے سامنے بھی ویسی ہی (جھوٹی) قسمیں کھائیں گے جیسی تمہارے سامنے کھاتے ہیں''۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا میں جھوٹی قسمیں کھانے کی جو عادت پختہ ہو چکی ہے اور جو اُن کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے، وہاں پر بھی اس کا ظہور ہوگا۔ ﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ﴾ ''اور وہ سمجھیں گے کہ ان کا بھی کوئی موقف ہے''۔ وہ بھی کہیں پر کھڑے ہیں، ان کے پاؤں تلے بھی کوئی زمین ہے۔ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ حقیقت میں وہی جھوٹے ہیں''۔

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ﴾ ''شیطان نے درحقیقت ان کو گھیر لیا ہے''۔ وہ ان پر قابو پا چکا ہے، ان پر مسلط ہو گیا ہے، ان پر چھا گیا ہے۔ ﴿فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور ان کو غافل کر دیا ہے اللہ کی یاد سے''۔ ﴿اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ﴾ ''یہ ہیں

شیطان کی پارٹی کے لوگ''۔ ﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٩﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ بالآخر شیطان کی پارٹی ہی کو خسارے میں رہنا ہے''۔ بربادی اسی کی ہے، تباہی اسی کی ہے، ہلاکت اسی کی ہے — اب یہ حزب الشیطان یعنی شیطان کی پارٹی کے لوگ کون ہیں؟ ایک حزب الشیطان تو وہ ہے جو کھلم کھلا سامنے آ رہا ہے، مقابلہ کر رہا ہے، سامنے سے چیلنج کر رہا ہے۔ وہ ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور ابولہب جیسے کفار و مشرکین ہیں۔ جبکہ ایک گروہ وہ ہے جو بظاہر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہے اور اندر سے مارِ آستین بن کر کفار کے ساتھ رشتۂ اخوت استوار کیے ہوئے ہے اور ابھی تک اس نے یکسو ہو کر اُن سے دلی تعلق اور دلی محبت کے رشتوں کو کاٹا نہیں ہے۔ تو واضح کر دیا گیا کہ یہ بھی درحقیقت حزب الشیطان کا جزو ہیں اگرچہ بظاہر تمہاری صفوں میں داخل ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴿٢٠﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ کہ جو دشمنی رکھتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے، وہی ہیں کہ جو نہایت ذلیل ہو کر رہیں گے''۔ یہ سب سے زیادہ پست ہو کر رہیں گے، یہی ہیں جو سب سے زیادہ خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ﴾ ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے''۔ اللہ نے تو یہ طے کیا ہوا ہے، یہ اس کا فیصلہ ہے۔ البتہ فیصلے کا ظہور کب ہوگا، یہ بات دوسری ہے۔ اس میں ابھی کتنی دیر لگے گی اور اس دوران اہل ایمان کتنی آزمائشوں سے دوچار ہو جائیں گے، یہ مسئلہ علیحدہ ہے۔ بالآخر اللہ اور اس کا رسولؐ غالب آ کر رہیں گے۔ یہ رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی مستقل سنت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے رسولوں سے یہ پختہ وعدہ ہے اور ان کے ضمن میں اللہ کا یہ پختہ فیصلہ ہے کہ رسول کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ ہاں جو نبی ہو وہ مغلوب ہو سکتا ہے، رسول کے مغلوب ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ قرآن کا ایک اہم نکتہ ہے، مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢١﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا

ہے‘ زبردست ہے‘‘۔ جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ’’تم ہرگز نہیں پاؤ گے ان لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر‘‘ ﴿یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے‘‘۔ یُوَآدُّوْنَ ’’و‘د‘د‘‘ مادہ سے باب مفاعلہ ہے‘ یعنی باہم محبت کرنا۔ اسی سے ہم رشتۂ مودّت کہتے ہیں۔ محبت‘ مودّت‘ رأفت اور رفاقت یہ الفاظ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ بلکہ سورۃ الحدید کے درس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رأفت اور رحمت ایک قبیل کی شے ہیں اور مودّت و محبت ایک قبیل کی شے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان مناسبت ہے۔ فرمایا کہ تم نہ پاؤ گے کہ وہ لوگ جو واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان کا قلبی رشتۂ محبت ان لوگوں سے ہو جو اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اس کی شرح سورۃ الممتحنہ کی ان دو آیات میں سامنے آئے گی جن کا ہم آخر میں مطالعہ کریں گے۔ جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسول سے عناد رکھتے ہیں‘ دشمنی رکھتے ہیں‘ بغض رکھتے ہیں‘ عداوت رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخر پر حقیقی ایمان رکھنے والے ایسے لوگوں سے رشتۂ محبت و مودّت استوار نہیں کرتے۔ یہاں رسول پر ایمان کا ذکر نہیں کیا گیا‘ اس لیے کہ محبت یا نفرت کا جو ظاہری طور پر ہدف بن رہا ہے وہ تو رسول کی ذات ہے۔ لہٰذا یہاں اللہ پر ایمان اور یومِ آخر پر ایمان کو نمایاں کیا گیا۔

﴿وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ ط﴾ ’’خواہ وہ ان کے باپ ہوں‘ یا ان کے بیٹے ہوں‘ یا ان کے بھائی ہوں‘ یا ان کے عزیز اور رشتہ دار ہوں‘‘۔ یہاں بھی بالکل وہی مضمون آ گیا جو سورۂ توبہ میں آیا‘ صرف مثبت اور منفی اسلوب کا فرق رہ گیا۔ وہاں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ ...... الآیة﴾ علائقِ دُنیوی کی جو فہرست وہاں بیان کی گئی وہی فہرست یہاں ہے‘ سوائے اس کے کہ ازواج کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا‘ باقی چاروں لفظ

وہی ہیں۔ باپ‘ بیٹے‘ بھائی‘ رشتہ دار۔ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والے خواہ کتنے ہی قریبی عزیز ہوں اُن کے ساتھ محبت کا رشتہ اب باقی نہیں رہ سکتا‘ اگر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ دل میں جاگزیں ہو چکا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ﴾ ’’یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو جما دیا ہے‘‘۔ لفظی ترجمہ ہوگا: ’’لکھ دیا ہے‘‘۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں لکھی ہوئی ہے‘ گویا یہ میرے دل پر نقش ہے۔ تو آیت کے اس ٹکڑے کا بہترین ترجمہ یہ ہوگا: ’’اللہ نے ان کے دلوں پر ایمان کو نقش کر دیا ہے‘‘۔ ﴿وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط﴾ ’’اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ‘‘۔ روح کا لفظ کثیر المعانی ہے اور اس وقت اس پر مفصل گفتگو ممکن نہیں ہے۔ ویسے ہمارے دروس میں اس پر گفتگو ہوتی رہتی ہے کہ فرشتہ بھی روح‘ روحِ انسانی بھی روح‘ وحی بھی روح۔ پھر لفظ رِیح (ہوا) بھی اسی مادے سے ہے‘ اس لیے کہ ’’الف‘ واؤ اور یا‘‘ تو حروف علت ہیں‘ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی مادے سے رَوح اور راحت ہے‘ یعنی انسان کو انشراح‘ مسرت اور انبساط کا ایک احساس ہو۔ تو یہ وہ فیضانِ روحانی ہے جو انہیں حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنے والے انہیں دیکھتے ہیں کہ بظاہر مشکلات میں ہیں‘ مصائب میں ہیں‘ لوگوں کے نرغے میں آ گئے ہیں‘ لوگوں کی دشمنی اور عداوتوں کا مرکز بن گئے ہیں‘ لیکن خود اُن کو ایک باطنی راحت میسر ہوتی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ جب جیل میں تھے تو کہا کرتے تھے ’’اِنَّ جَنَّتِیْ مَعِیَ‘‘ یعنی میری جنت میرے ساتھ ہے۔ تم مجھ سے اسے چھین نہیں سکتے۔ انسان کے دل میں اگر امن ہے‘ سکون ہے‘ چین ہے‘ راحت ہے‘ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے انبساط ہے تو اگر اس کے جسم پر کوڑے بھی پڑ رہے ہوں تو اس کا وہ باطنی سکون درہم برہم نہیں ہوگا۔ یہ ہے وہ فیضانِ روحانی۔ ﴿وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط﴾ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے ذریعے سے ان کی تثبیتِ قلبی فرماتا ہے۔ یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ حٰمٓ السجدۃ کے حوالے سے موجود ہے۔

﴿وَيُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ ”اور داخل کرے گا انہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی“۔ ﴿خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا﴾ ”رہیں گے اس میں ہمیشہ“۔

﴿رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ﴾ ”اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے“۔ جس طرح ﴿يُحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗ﴾ کا معاملہ ہے کہ رشتۂ موالات اور محبت دوطرفہ ہے۔ گویا ع ”دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!“ اسی طرح باہمی رضا کا معاملہ بھی دوطرفہ ہے۔ ﴿رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ﴾ ”اللہ ان سے راضی ہو گیا“ ﴿وَرَضُوۡا عَنۡهُ﴾ ”اور وہ اس سے راضی ہو گئے“۔ یہ جو اللہ سے راضی ہونے کا معاملہ ہے‘ یہ آخرت میں جا کر تو بتمام وکمال ہوگا ہی‘ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی جو لوگ اس مقامِ رضا پر فائز ہو جاتے ہیں‘ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اللہ سے راضی رہتے ہیں اور جس حال میں بھی وہ رکھے وہ راضی برضائے ربّ رہتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ اللّٰهِ﴾ ”یہ ہے اللہ کی پارٹی“۔ یہ ہے اللہ کی جماعت۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کے بارے میں اقبال نے بہت پیارا شعر کہا ہے کہ ؎

اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس سے متصلاً قبل یہ شعر ہے ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

دنیا میں مادیت اور روحانیت کے درمیان معرکہ آرائی ہے‘ روح اور جسم کا معرکۂ کارزار گرم ہے‘ خدا کے مقابلے میں کائنات اور حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔ تہذیب وتمدن اور ثقافت کے نام پر بے حیائی‘ شیطنت اور درندگی کا ننگا ناچ ہے جو دنیا میں ناچا جا رہا ہے۔ اس معرکۂ کارزار میں اللہ کی پارٹی کے لوگ وہ ہیں جن کی پیشگی اہلیت (prequalification) اوپر بیان

کر دی گئی ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ ”آگاہ ہو جاؤ کہ بالآخر اللہ کی جماعت کے لوگ ہی فلاح سے ہمکنار ہوں گے“۔ یہی جماعت بالآخر کامیاب ہوگی۔ فلاح کا مفہوم ہمارے منتخب نصاب کے تیسرے حصے کے پہلے سبق میں تفصیل سے بیان ہو چکا: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ......الخ﴾ ”یقیناً فلاح پا گئے وہ اہل ایمان ......“۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

آخر میں سورۃ الممتحنہ کی دو آیات کا ترجمہ کر لیجیے جو اس درس میں مزید شامل کی گئی ہیں‘ اس لیے کہ ان میں ایک فطری تدریج کی طرف اشارہ ہے جس کو کہ شریعت پیشِ نظر رکھتی ہے۔ قرآن کتابِ ہدایت ہے‘ کتابِ فطرت ہے‘ لہٰذا اس میں فطری چیزوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاتا۔ ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سب کافر برابر نہیں‘ سب مسلمان برابر نہیں۔ مسلمانوں میں منافق بھی ہیں کہ جو کافروں کے ایجنٹ ہیں‘ ففتھ کالمسٹ ہیں‘ جو حزب الشیطان ہی کا ایک حصہ ہیں کہ جو اہل ایمان کی صفوں میں ہے۔ کفار میں بھی کچھ تو ایسے ہیں جو اللہ‘ اس کے رسول اور اہل ایمان سے انتہائی بغض اور دشمنی رکھتے ہیں‘ اس جدوجہد میں مزاحم ہو رہے ہیں‘ آڑے آ رہے ہیں‘ مخالفت کر رہے ہیں‘ جبکہ ایک وہ ہیں کہ جو کچھ نیوٹرل ہیں‘ وہ بھی نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں۔ وہ اہل ایمان کے مدّمقابل نہیں آئے‘ ان سے لڑ نہیں رہے‘ ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہے‘ بلکہ شاید وہ wait and see کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں کہ ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو‘ ابھی دیکھو کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ تو جو اس طرح تمہارے مدّمقابل نہ ہو گئے ہوں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ کچھ نیکی‘ بھلائی اور عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے۔

اب ہم سورۃ الممتحنہ کی ان دو آیات کا ترجمہ کرتے ہیں: ﴿لَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ﴾ ”اللہ تعالیٰ نہیں روکتا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے نہ تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور

نہ تمہیں انہوں نے تمہارے گھروں سے نکالا'' ﴿اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ؕ﴾ ''اس سے کہ تم ان کے ساتھ کوئی حسن سلوک اور انصاف کا معاملہ کرو''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔ ﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں منع فرماتا ہے'' ﴿عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ ''ان لوگوں سے کہ جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے'' ﴿وَظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ﴾ ''اور انہوں نے گٹھ جوڑ کیا ہے تمہارے نکالنے پر'' ﴿اَنْ تَوَلَّوْهُمْ﴾ ''کہ تم ان سے دوستی کرو''۔ اب یہاں لفظ ولایت آیا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس بات سے روک دیا ہے کہ تم ان سے رشتۂ محبت اور رشتۂ ولایت استوار کرو۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹﴾ ''اور جو لوگ ان سے رشتۂ ولایت استوار کریں گے (ان سے دوستی کا تعلق رکھیں گے) تو بلاشک وشبہ وہی لوگ ظالم ہوں گے''۔ اور یہ ظالم کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں بڑا سخت ہے اور بالعموم مشرک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳﴾ (لقمٰن) ''یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔ چنانچہ جب اس کے لیے قرینہ موجود نہ ہو تو شرک ظلم کے معنی میں اور ظالم مشرک کے معنی میں لیا جائے گا۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى وایاكم بالایات والذكر الحكيم ○○

درس ۵

اقامتِ دین کی جدّ وجہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝۱۴﴾ (الصّف)

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ .... الآية﴾ (الفتح:۲۹)

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱﴾ (التوبة)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰﴾ (الفتح)

﴿لَقَدْ رَضِىَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا

فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۱۸﴾ (الفتح)

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ (المُمتحنة) ...... صدق اللّٰه العظیم

وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰٓی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰٓی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰٓی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۱)

وفی روایة : وَ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّآ اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِیْهِ بُرْهَانٌ (۲)

قرآن مجید کے اس سلسلۂ درس میں ہم قرآن حکیم کی کچھ اُن آیات اور اُن مقامات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں اُس ہیئت اجتماعیہ کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں رہنمائی وارد ہوئی ہے جو اقامتِ دین' غلبۂ دین یا تکبیر ربّ کی جدوجہد کے لیے قائم ہو۔ اس اجتماعیت کا ایک پہلو ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ اس میں جو لوگ شریک ہوں ان کے مابین کیا رشتۂ اخوت' کیسا رشتۂ محبت اور کس نوعیت کی نسبتِ ولایت درکار ہے۔ اب اس اجتماعیت کی اصل جڑ اور بنیاد کے بارے میں ہمیں غور وفکر کرنا ہے اور وہ ہے اس کا ایک ڈسپلن' یعنی نظم جماعت۔ اس نظم جماعت کے وجود میں آنے کی اساس' اس کی بنیاد' اس کی جڑ کیا ہو؟ ڈسپلن کے حوالے سے ایک نسبت امیر اور ماٗمور کے مابین قائم ہوتی ہے۔ امیر اور ماٗمور کی یہ نسبت اسلام میں دو طرح سے وجود میں آتی ہے۔ ایک تو ہیئت سیاسیہ کے ضمن میں' جب حکومت کی تشکیل ہوتی ہے کہ جو بھی والیٔ امر' یعنی والیٔ حکومت یا مسلمانوں کا امیر ہے اس کے اور اس ریاست کے شہریوں کے مابین ایک نسبت ہے۔ اور اس کی ایک دوسری صورت اس جماعت کے نظم کے اعتبار سے ہے جو اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہو' یعنی اس کے امیر اور وہ لوگ جو اِس جدوجہد میں شریک ہیں ان کے مابین امیر اور ماٗمور کی ایک نسبت قائم ہوتی ہے۔ اس وقت ہم درحقیقت اس دوسری نوعیت کی نسبت کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة وتحریمها فی المعصیة۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی اموراً تنکرونها ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة......

اس کے ضمن میں سورۃ الصّف کی آخری آیت میں ہمیں ایک رہنمائی مل چکی ہے کہ یہ نسبت کیسے وجود میں آتی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ اٹھ کر ایک آواز لگاتا ہے۔ جب تک نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری تھا وہ نبی یا رسول ہوتا تھا' وہ لوگوں کو پکارتا تھا' وہ ماٗمور من اللہ بن کر آتا تھا' اور اس کے ساتھ علیحدہ سے کوئی عہد کرنا اور دستوری رشتے میں منسلک ہونا ضروری نہیں تھا' بلکہ محض اس پر ایمان لے آنے سے وہ نسبت وجود میں آ جاتی تھی۔ البتہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جس ایثار وقربانی اور جس طرح تن من دھن لگانے کا ایک تقاضا ابھرتا تھا اس کے حوالے سے ان کے مابین ایک صورت یہ بھی ہوتی تھی کہ وقت کا نبی یا وقت کا رسول کسی وقت خاص طور پر ایک صدا لگاتا تھا کہ: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؟ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟'' چنانچہ یہ الفاظ جب سورۂ آل عمران (آیت ۵۲) میں آئے ہیں تو وہاں اس سے پہلے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ یعنی جب عیسٰی علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف سے کفر کی شدت کا احساس کیا۔ معلوم ہوا کہ اب مقابلہ شدید ہونے والا ہے' اب ایک تصادم کی صورت پیدا ہونے والی ہے ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾ تو انہوں نے ایک صدا لگائی کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ج﴾ حواریوں نے اس کا جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم اللہ پر ایمان

لائے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک نسبت ان کے مابین قائم ہو چکی تھی اور وہ نسبت درحقیقت ایمان کی نسبت تھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا‘ جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ان کے ساتھی بن گئے‘ وہ فطری طور پر اُن کے تابع ہو گئے اور منطقی طور پر اُن پر حضرت عیسیٰؑ کی اطاعت واجب ہو گئی۔ لیکن جب وہ مرحلہ آیا جبکہ محسوس ہوا کہ اب شدید کشمکش کا آغاز ہونے والا ہے تو انہوں نے خاص طور پر ایک ندا لگائی ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؟'' جس کا ایک مثبت جواب اُن کے حواریوں نے دیا۔ بہرحال اس سے ہمیں رہنمائی ملی کہ اس جدوجہد کے لیے کسی ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی داعی یہ صدا لگائے‘ لوگوں کو پکارے‘ اور جو لوگ اس کی اس پکار پر لبیک کہہ کر حاضر ہو جائیں وہ اس کے ساتھی اور اعوان و انصار ہوں گے۔

اسی جانب مزید رہنمائی ہمیں سورۃ الفتح کی آخری آیت سے ملی‘ جس کے بارے میں کئی بار گفتگو ہو چکی ہے کہ یہی اجتماعیت جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وجود میں آئی تو ذہن میں رکھئے کہ اس کے بھی دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ کہ جس نے بھی تصدیق کی حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کی وہ فطری طور پر آپؐ کا ساتھی بن گیا۔ کیسے ممکن تھا کہ حضور ﷺ حکم دیں اور وہ اسے تسلیم نہ کرے! یہ تو اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے اور ایک ایسی اظہر من الشمس بات ہے کہ جس کے لیے کسی اضافی قول و قرار اور کسی اضافی عہد و میثاق کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئی اس کے اجزائے ترکیبی یہی ہیں کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ یعنی ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں'' یا ''اللہ کے رسول محمد (ﷺ)''۔ یہ میں بحث کر چکا ہوں کہ یہ دونوں نحوی ترکیبیں یہاں ممکن ہیں‘ لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ ''اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں''۔ یہ ہیں کہ جنہوں نے ان کی رفاقت اور معیت اختیار کی ہے‘ جو اُن پر ایمان لائے ہیں‘ ان کی تصدیق کی ہے‘ اور اب یہ مل کر جب ایک ہیئت اجتماعیہ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کے مابین ایک نسبت امیر اور مأمور

کی بھی قائم ہوتی ہے۔ ایک نسبت تو بنیادی ہے رسول اور اُمتی کی‘ اس پر یہ اضافی نسبت ہے امیر اور مأمور کی۔

اس اضافی نسبت کو نمایاں کرنے والی چیز جو ہمیں قرآن اور سنت اور سیرتِ رسول ﷺ سے ملتی ہے‘ اس کا عنوان ''بیعت'' ہے۔ اب اس بیعت کے سلسلے میں ہمیں سمجھنا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے‘ جڑ بنیاد کیا ہے‘ اس کا معنی و مفہوم کیا ہے‘ قرآن حکیم میں بیعت کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے‘ بیعت کی کتنی انواع و اقسام ہیں‘ سیرت النبیؐ میں اس بیعت کا کس تدریج کے ساتھ ذکر ملتا ہے؟ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب باتیں ایک تدریج کے ساتھ مختصر ترین وقت میں آپ کے سامنے آ جائیں۔ اس ضمن میں تفصیلی مباحث میری بہت سی تقاریر میں موجود ہیں‘ لیکن جامعیت کے ساتھ ایک مختصر وقت میں ان مباحث کا سامنے آ جانا اِن شاء اللہ بہت مفید ہو گا۔

بیعت کی حقیقت۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کی روشنی میں

اس بیعت کی اصل حقیقت پر جو آیۂ مبارکہ روشنی ڈالتی ہے وہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ہے۔ بیعت کے حروفِ اصلی ''ب‘ ی‘ ع'' ہیں اور بیع و شراء کے معنی خرید و فروخت کے ہیں۔ اور یہ ذہن میں رکھئے کہ جب تک کرنسی وجود میں نہیں آئی تھی تو خرید و فروخت اصلاً مبادلۂ اشیاء کا نام تھا۔ مبادلۂ اشیاء میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز اُس دوسری چیز کی قیمت ہے‘ اور برعکس بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہیں‘ یہ دوسری چیز اُس پہلی چیز کی قیمت ہے۔ دونوں ہی شے بھی ہیں اور دونوں ہی قیمتیں بھی ہیں۔ البتہ عربی زبان مین بیع اور شراء کے دو طرفہ الفاظ کا استعمال موجود ہے۔ اس اعتبار سے شراء کے معنی ہو جائیں گے بیچنا‘ جبکہ بابِ افتعال سے ''اِشْتِرَاء'' خریدنے کے معنی میں آئے گا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۲۰۷) ''لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جانیں اللہ کی رضا کی تلاش میں''۔ یہاں شَرٰی ‘ یَشْرِی بیچنے کے معنی میں آیا ہے اور سورۃ التوبۃ میں ''اِشْتَرٰی'' (باب افتعال) خریدنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ بیع

غالب استعمال کے اعتبار سے فروخت کرنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدار) کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہیں۔ بائع وہ ہے جو بیچ رہا ہے، لیکن جب یہ باب تفاعل یا باب مفاعلہ میں آئے گا تو اِن دونوں ابواب میں ایک خاصہ تو اضافی مبادلے کا پیدا ہو جاتا ہے اور ان کا دوسرا خاصہ دو فریقوں کے مابین کسی دوطرفہ معاملے کا وجود میں آنا ہے۔ جیسے جہد سے مجاہدہ اور قتل سے مقاتلہ ہے اسی طرح باب مفاعلہ میں بیع سے مبایعہ ہوا۔ اب مبایعہ میں جب دو فریق شریک ہو جائیں گے تو پھر وہی اشیاء کے مبادلے کی صورت بن جائے گی۔ اور اس دَور میں چونکہ کرنسی ایک علیحدہ شے معین ہوگئی ہے تو کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہے۔ بہرحال قرآن مجید میں یہ بیع کا لفظ تو کثرت سے آیا ہے، لیکن سورۃ البقرۃ میں باب تفاعل سے ''تَبَایَعْتُمْ'' بھی آیا ہے۔ اور یہاں آپ دیکھیں گے کہ ''مبایعہ'' باب مفاعلہ سے بھی وارد ہوا ہے۔ تو یہ درحقیقت مبادلہ ہے، جس کے لیے ہماری زبان میں سادہ ترین لفظ ''لین دین'' ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ ایک تو نقد بیع ہے، یعنی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہوگیا یا کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہوگیا، اور ایک ہے مستقبل کے اعتبار سے کوئی سودا کرنا۔ اس صورت میں ذرا اضافی پیچیدگی (complication) آتی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں لفظ ''تَبَایَعْتُمْ'' اسی مفہوم میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ﴾ (آیت ۲۸۲) ''اور جب کوئی سودا کیا کرو (جو فی الفور نہیں ہو رہا ہے) تو ضرور گواہ بنا لیا کرو''۔ اس لیے کہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ اس کی بحث ہمارے ہاں فقہ میں ''بیع سَلم'' کے عنوان سے آتی ہے۔ بیع سَلم وہ ہے جس میں کوئی مستقبل کا سودا ہو رہا ہے۔ مستقبل کی بیع کو اسلام عام طور پر discourage کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں اور کسی نہ کسی طور سے سود کا عنصر داخل ہو جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا اصلاً تو اسلام چاہتا ہے کہ سودا نقد ہوا کرے۔ بیع کی بہترین صورت تو وہی ہے، البتہ انسانی تمدن کے تحت یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ کسی وقت کوئی ادھار سودا بھی

ہو۔ اسلام نے اس کی صرف ایک شکل کو جائز رکھا ہے کہ مبادلے کے جو دو رُخ ہیں ان میں سے ایک شے بتمام وکمال اُسی وقت ادا ہو جائے۔ مثلاً آپ کو ماہِ مئی کے لیے گندم کا کوئی سودا کرنا ہے کہ دس ہزار من گندم دو سو روپے من کے حساب سے کوئی خرید رہا ہے اور کوئی بیچنے کا عہد کر رہا ہے تو اس گندم کی جو کل قیمت بنتی ہے وہ خریدار کے لیے اسی وقت ادا کر دینا لازم ہے، جبکہ اسے گندم ماہِ مئی میں ملے گی۔ یہ بیع سَلم کہلاتی ہے۔ اور یہ ہے درحقیقت وہ ''مبایعت'' یا ''تبایع'' کہ اس میں ایک سودا ہو رہا ہے لیکن بیع فی الفور مکمل نہیں ہوئی، مبادلۂ اشیاء اسی وقت نہیں ہوا۔

ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بات اور نوٹ کر لیں کہ عربوں کے ہاں جب اس مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہوتا تھا تو چونکہ یہ بات قول وقرار کے درجے میں ہوتی تھی، لہٰذا اس کو پختہ کرنے کے لیے ہاتھ ملانا ان کے ہاں ایک علامت کے طور پر رائج تھا کہ بات پختہ ہوگئی۔ ہوتے ہوتے اس کا استعمال نقد خرید وفروخت پر بھی ہونے لگا کہ جب کوئی سودا طے ہو جاتا اور بات پوری ہو جاتی تو اس پر بھی وہ مصافحہ کرتے۔ یہ ہاتھ کا ملا لینا درحقیقت اُس وقت اِس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اب بات پوری ہوگئی، سودا طے ہوگیا، جورد وقدح اور بحث وتمحیص ہونی تھی وہ ہو چکی۔

اب دیکھئے کہ قرآن حکیم اس بیع کا ذکر کن اسالیب میں کرتا ہے۔ قرآن مجید کسی حقیقت کی توضیح کے لیے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے۔ جہاں تک تجارت اور خاص طور پر اس بیع وشراء کا معاملہ ہے، اسے ہر انسان سمجھتا ہے۔ عامی سے عامی اور اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان بھی اس سے نابلد نہیں۔ یہ وہ بنیادی تصورات (concepts) ہیں کہ جن سے کوئی شخص ناواقف نہیں۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ الصّف میں اللہ تعالیٰ نے یہی الفاظ استعمال کیے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰﴾

''اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟''

تجارت میں ہوتا کیا ہے؟ کچھ سرمایہ، تھوڑا یا کم اور کچھ محنت۔ اور اس سرمائے

اور محنت کے لگانے سے مطلوب ایک نفع اور فائدہ ہوتا ہے۔ تین چیزیں اس کے لازمی اجزاء ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ نفع سامنے رکھا گیا کہ عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا! اس عظیم نفع کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ تجارت کرنی پڑے گی۔ اور جیسے تم تجارت میں سرمایہ بھی لگاتے ہو اور محنت بھی کرتے ہو اِسی طرح اس تجارت میں بھی سرمایہ اور محنت دونوں لگیں گے۔ وہ تجارت ہے کیا؟

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

''ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (اس میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی)۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو''۔

اب یہ وہ اسلوب ہے کہ جس کو عامی سے عامی انسان بھی سمجھ جائے گا۔ اس لیے کہ ان تصورات کو سمجھنے کے لیے فلسفہ و منطق پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ انسانی معاملات کے بنیادی تصورات ہیں جن کو ہر انسان جانتا ہے۔ ابھی میں نے سورۃ البقرۃ کی ایک آیت آپ کو سنائی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۲۰۷) یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی جانیں بیچتے ہیں' اپنی صلاحیتیں' اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنے اوقات بیچتے ہیں۔ کس لیے؟ اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔ یہی انداز ایک حدیث میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))(۱) یعنی ہر انسان جب صبح کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بیچنا شروع کرتا ہے۔ وہ کہیں کسی دفتر میں اپنی صلاحیتوں کو کھپا رہا ہے' اپنا وقت صرف کر رہا ہے' کہیں کسی کھیت میں محنت کر رہا ہے' اپنی توانائیاں کھپا رہا ہے' اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ شام تک وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہوتا ہے۔ البتہ اس کا نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ اپنے نفس کے بیچنے والے ایک وہ ہیں جو شام کو گھر لوٹتے ہیں تو گناہوں کی

(۱) صحيح مسلم' كتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذي' كتاب الدعوات عن رسول الله ﷺ' باب منه۔

گٹھڑی بھی ساتھ لے کر آتے ہیں' اپنے نفس کو تباہ و برباد کر کے لوٹتے ہیں' اس کے لیے جہنم کا پروانہ حاصل کر کے واپس آتے ہیں۔ اور ایک وہ ہیں جو جہنم سے رہائی کا پروانہ لے کر آتے ہیں۔ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔ وہ بھی ہیں جو گردن کو چھڑا کر لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جو اِس کو ہلاکت کے حوالے کر کے آتے ہیں۔

دین کی اس کُلی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے وہی انداز سورۃ التوبۃ میں اختیار کیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی بسبب اس کے کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ یعنی اللہ نے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ اب آپ یہ جان لیجیے کہ یہ بیع سَلم ہوگی۔ یہ مبادلہ یہاں نہیں ہو رہا۔ جنت تو آخرت میں ملے گی' جبکہ جان و مال یہاں حوالے کرنے ہوں گے۔ ایسی خرید و فروخت کو بیع سَلم اسی لیے کہتے ہیں کہ ایک شے فوری طور پر سپرد کر دی جاتی ہے۔ لفظ تسلیم ہم اردو میں بھی سپرد کر دینے اور حوالگی کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ تو ''بیع'' کا ایک طرف کا پہلو اگر مکمل حوالہ ہو جائے' اس کی تسلیم ہو چکے' وہ بیع سَلم ہے۔ اب اس کا جو بھی دوسرا عوض ہے وہ کسی وقت معینہ پر ملے گا۔ اسی طرح کی ایک مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے مابین ہوا۔

اب اس بیع کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ کیا ہے: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں''۔ وہ جان جو اللہ کو دے چکے' اب وہ اس کو کھپا رہے ہیں' لگا رہے ہیں اللہ کے راستے میں۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں قتال کا لفظ آیا ہے جو خاص ہے' جبکہ جہاد عام ہے' تو جہاں خاص کا ذکر آئے گا وہاں عام خود بخود اس میں شامل سمجھا جائے گا' جیسے ہر رسول تو نبی ہے ہی' ہر نبی رسول نہیں ہے' لہٰذا جہاں لفظ رسول آ جائے وہاں نبوت مقدر (understood) ہے' اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں بھی خاص اور آخری بات ''قتال'' کا ذکر ہو گیا' جہاد اس میں بدرجۂ اُولیٰ مراد ہے۔ اب وہ اس جہاد اور

''قتال'' میں اپنی جانیں بھی کھپا رہے ہیں' اپنے مال بھی کھپا رہے ہیں۔ ''جہاد'' کی طرح ''قتال'' بھی جان اور مال دونوں کو محیط ہے۔ انسان کے پاس سب سے قیمتی متاع جان ہے' جب وہ اس کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں حاضر ہو جاتا ہے تو بر سبیل تغلیب یہاں از خود مال بھی مراد ہو گیا۔ لہٰذا قتال میں جہاد بالمال والنفس گویا کہ یہاں پورا کا پورا مندرج ہے' understood ہے۔

سلسلۂ جہاد و قتال کے ضمن میں آخری شے کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق باقی ساری چیزیں اس میں از خود مذکور ہو گئیں۔ ﴿فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ ''وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ جان کا سودا تو پہلے کر چکے' اب تو صرف اس کی حوالگی باقی تھی' سو وہ بھی ہو چکی۔

اللہ تعالیٰ کی اہل ایمان سے بیع و شراء بیع سلَم ہے' ایک ادھار سودا ہے کہ جان و مال تو یہاں سپرد کر دیے ہیں اور جنت کا وعدہ آخرت میں ہے اور ادھار سودے پر انسان کے دل میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ تردّد پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ ادھار تو ہے بھی اتنا بڑا ادھار کہ یہاں صرف سالوں اور مہینوں کا مسئلہ نہیں' ایک عالَم اور دوسرے عالَم کا فرق ہے۔ اگرچہ اِس عالَم سے اُس عالَم میں منتقلی اسی وقت فی الفور بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں وقت لگ جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ابھی اس دنیا میں مزید کتنا عرصہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے فیصلے میں ہے۔ لہٰذا اس ادھار سودے پر طبیعت میں ایک اضطراب اور تردّد کا پیدا ہونا طبعی اور فطری ہے۔ اور پھر یہ وہ چیز ہے کہ جس پر شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع ملتا ہے کہ تم تو یہاں اپنا سب کچھ کھپا رہے ہو' پتا نہیں وہ آخرت ہو گی بھی کہ نہیں ہو گی! تم نے کسی پر اعتماد کر کے یہ فیصلہ کیا ہے لیکن پتا نہیں واقعہ کیا ہے! یہ ہے اصل میں شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ جس کو پس منظر میں رکھیں گے تب سمجھ میں آئے گا کہ اللہ کے اس وعدے کی حقانیت پر یہاں اتنا زور کیوں دیا جا رہا ہے اور اتنا تاکیدی انداز کیوں اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ﴾ ''یہ وعدہ اللہ کے ذمے ثابت ہے (شدنی' قطعی' یقینی اور حتمی

وعدہ ہے) تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں''۔ ''وَعْدًا عَلَيْهِ'' میں ''علیٰ'' کا صلہ جو آیا ہے اس میں انتہائی زور ہے کہ یہ وعدہ اس کے ذمے ہے اور یہ وعدہ اس پر ثابت ہے' یہ قطعی ہے' یہ حتمی ہے' یہ یقینی ہے۔ اور اس کی تین مرتبہ توثیق ہو چکی ہے۔ اور تین کیا' اس کی توثیق تو ہزاروں بلکہ لاکھوں مرتبہ ہوئی۔ اگر وہ روایت درست ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں' تو ہر نبی نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدے کی توثیق کی ہے۔ لیکن تین بڑے بڑے ادوار کے حوالے سے فرمایا کہ تورات میں یہ وعدہ ہوا' انجیل میں یہ وعدہ ہوا اور اب قرآن میں یہ وعدہ ہو رہا ہے۔

مزید فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اپنے عہد کا ایفاء کرنے والا اللہ سے بڑھ کر کون ہو گا؟'' اَوْفٰی کا لفظ جب آتا ہے تو اس کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ فعل کی صورت میں اَوْفٰی' یُوْفِیْ' اِیْفَاءً بابِ افعال سے آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ اَفْعَلُ کے وزن پر صیغۂ تفضیل ہے۔ یعنی سب سے بڑھ کر وفا کرنے والا' سب سے زیادہ پورا کرنے والا۔ کون ہو گا اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا؟ یہ دوسری تاکید ہو گئی۔ یہ بات مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ ایک انسان کسی وقت جذبات میں کوئی بڑا فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ وقتی طور پر ایک تحریک پیدا ہوئی تو اپنا کیریئر تج دینے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کے ساتھ جڑ گئے۔ لیکن محسوس ہو رہا ہے کہ طبیعت بجھی بجھی سی ہے' بجائے اس کے کہ طبیعت میں بشاشت ہو' وہ شخص اندر ہی اندر سے محسوس کر رہا ہے کہ یہ میں کتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھا ہوں' معلوم نہیں میں نے صحیح کیا ہے یا غلط کیا ہے' مجھے اتنا بڑا اقدم اٹھانا بھی چاہیے تھا کہ نہیں! آناً فاناً کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس طرح کی کسی کیفیت کا پیدا ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔ لیکن اگر اس قسم کی کیفیت کا انسان کے اندر کوئی مستقل سایہ پڑ رہا ہو تو یہ ایک بہت خوف ناک مرض کی علامت ہے۔ پھر اس ضمن میں اس کے اندر جو ایک کشمکش یا کشاکش ہوتی ہے وہ جماعتی زندگی کے اندر فتنہ انگیزی شروع کرتی ہے۔ ایسا شخص طرح طرح سے اپنے اس عدمِ اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں جذبات میں ایک غلط فیصلہ کر بیٹھا ہوں' لیکن اس کا علی الاعلان اعتراف آسان

نہیں ہوتا۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر اس کے اپنے اندر ایک بہت بڑی ہلچل ہوتی ہے‘ اور یہی ہلچل پھر اجتماعی زندگی کے اندر طرح طرح کی خرابیوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا مطالعہ کیجیے: ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ ”تم خوشیاں مناؤ اپنی اس بیع پر جو تم نے کی ہے!“ یہ سودا کرنے کے بعد ملول کیوں ہو گئے؟ غمگین کیوں ہو گئے؟ تمہاری طبیعت میں انقباض کیوں آ گیا؟ کیا تمہیں اللہ کی بات پر یقین نہیں؟ تم کہیں بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تو نہیں ہو؟ یا تمہارا ”ویلیو سٹرکچر“ کا معاملہ ابھی واقعتاً پختہ نہیں ہوا تھا اور یہ بات تم نے شعوری طور پر طے نہیں کی تھی کہ ہم دنیا دے کر آخرت قبول کر رہے ہیں؟ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷﴾ ”مگر تم اس دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو‘ حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے“۔ مطلوب یہ ہے کہ اس بات پر انسان کا دل مطمئن ہو جائے۔ اگر ایک وقت میں انسان اس کو قبول کر لے‘ اختیار کر لے یہ اور بات ہے اور اس پر دل کا جم جانا اور دل کا ٹھک جانا دوسری بات ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ حٰمٓ السجدۃ کے درس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ”یقیناً جنہوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے‘ پھر اس پر جم گئے“۔ استقامتِ عملی درحقیقت استقامتِ قلبی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بالفعل جم جانا اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ دل ٹھک چکا ہو۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ))(۱) ”کہو میں ایمان لایا اللہ پر‘ پھر اس پر جم جاؤ“۔ اگر ایمان میں ضعف ہو گا اور استقامتِ باطنی نہیں ہو گی تو اب انشراح کیسے ہو گا؟ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی وعدہ کر بیٹھا ہو‘ لہٰذا لگا بندھا کچھ ساتھ چل بھی رہا ہو‘ اپنی عزتِ نفس کے تحفظ میں کچھ نہ کچھ بھاگ دوڑ بھی کر رہا ہو‘ کبھی کوئی بات مان بھی لیتا ہو‘ لیکن اندر کی

(۱) مسند احمد۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب جامع اوصاف الاسلام۔

کیفیت وہ نہ ہو جس میں بشاشت اور استبشار ہو۔ چنانچہ جس طرح سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰﴾ ”اور بشارت حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے“۔ اسی طرح یہاں فرمایا گیا: ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ تم اپنے سودے پر خوشیاں مناؤ! تمہارے چہرے تو دمکنے چاہئیں۔ تمہیں تو اس پر جشن منانا چاہیے۔ تم نے وہ سودا کیا ہے کہ جس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ تم نے اپنے جسم و جان کی وہ قیمت وصول کی ہے جس سے بڑی قیمت کوئی نہیں۔ تم نے جنت کے عوض سودا کیا ہے‘ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ تم نے اپنی جان اور مال کا جو سودا کیا ہے اس کی جتنی بڑی قیمت تمہیں ملی ہے اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔

﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱﴾ ”اور (جان لو کہ) یہی ہے بڑی کامیابی!“ دنیا کا کوئی سودا ایسا نہیں ہے کہ جو اِس کے مقابلے میں آ سکے۔ دنیا و مافیہا اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ ہے وہ بیع جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے کی گئی ہے۔ ”جہاد و قتال“ اقامت دین کی اس جدوجہد کا جامع عنوان ہے۔ اس میں جان لگتی ہے‘ مال کھپتا ہے‘ یہاں تک کہ جان کے جانے کا رسک لے کر آدمی کو میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ سودا شعوری طور پر پہلے کر لیا گیا ہو اور اس پر دل ٹھک چکا ہو تو گاڑی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے گی‘ لیکن اگر یہاں اس میں کوئی کمی ہے تو پھر قدم قدم پر رکاوٹ آئے گی۔ وہ رکاوٹ اندرونی اور داخلی ہوتی ہے جس کا ظہور خارج میں بھی ہو کر رہے گا۔

اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والی اس بیع میں اللہ درحقیقت مشتری یعنی خریدنے والا ہے اور بندۂ مؤمن بائع یعنی بیچنے والا ہے۔ مبایعت ان کے مابین ہے‘ لیکن عالمِ واقعہ میں اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے غیب میں ہے یا یہ کہ ہم اس سے غیب میں ہیں۔ لہٰذا اب بالفعل یہ معاملہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی انسان دنیا میں اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ سودا کرتا

ہے۔ جب تک نبوت و رسالت جاری رہی وہ نمائندہ نبی اور رسول ہوتا تھا۔ نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہونے کے بعد اب یہ نمائندہ وہ شخص ہوگا جو نبوی منہاج پر دین کی دعوت کے لیے کھڑا ہو' اقامت دین کے لیے کمر کس کے میدان میں آئے اور ندا لگائے: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستے میں؟ جو لوگ اس کی پکار پر لبیک کہیں ان کے اور اس داعی کے مابین اب یہ معاہدہ ہوگا اور بات پختہ کرنے کے لیے علامت کے طور پر مصافحہ بھی ہوگا۔ اس ''مصافحہ'' (بیعت) کا ذکر اب سورۃ الفتح میں ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ﴾ کے مابین جو نسبت قائم ہوئی اس نے جو ظاہری صورت اختیار کی وہ بیعت کی شکل ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ یہ بات میں نے بارہا کہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یا کسی نبی کے معاملے میں اس بیعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے' اس لیے کہ نبی اور اُمتی یا رسول اور اُمتی کی نسبت اس سے اہم تر ہے۔ اُمتی ہر حال میں مطیع ہے۔ ہمارے ہاں تو اُمتی کا تصور بگڑ چکا ہے' لیکن کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو اس میں اشتباہ ہوسکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان لینے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ آپؐ کو مطاع ماننا! یہ تو سابقہ انبیاء کرام کی دعوت بھی قرآن مجید میں ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۳﴾ (نوح) ''یہ کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۃ الشعراء میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام' سب کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝﴾ ''میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

اس اعتبار سے وہاں تو وہ اصل بنیادی نسبت زیادہ قوی اور مضبوط موجود ہے' لیکن میں اس بات پر پوری طرح انشراحِ صدر رکھتا ہوں کہ بیعت کا معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی رہنمائی کے لیے کیا ہے۔ آپؐ کو بیعت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

لیکن آپؐ کے بعد آئندہ تو نبی اور اُمتی کی یہ نسبت کبھی قائم نہیں ہوگی۔ وہ تو ہمیشہ ہمیش کے لیے' تا قیامِ قیامت قائم ہو چکی محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر کلمہ گو کے مابین۔ لیکن جب بھی کوئی عملی جدوجہد ہوگی' کوئی اجتماعیت تشکیل پائے گی' کوئی تعیین ہوگی کہ کون لوگ اعوان و انصار ہیں اور معین ہوگا کہ ان کی کتنی قوت ہے' تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی علامت اور اس کا کوئی نظام ہونا لازم ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ نسبتِ بیعت کہ جو اَب اُمت کے اندر چلی ہے۔ اُمت کی پوری تاریخ میں آپ کو نظر آئے گا کہ جو بھی اجتماعی ہیئت وجود میں آئی وہاں بیعت کا نظام اختیار کیا گیا۔ اجتماعیت کی بلند ترین اور نمایاں ترین صورت حکومت کا قیام ہے' وہ بھی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوتی رہی۔ اس کی خفی ترین صورت سلسلۂ ارشاد و اصلاح ہے' اس کے لیے بھی بیعت کا نظام رائج ہے۔ کبھی حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک اٹھی تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ چنانچہ اجتماعیت درحقیقت جس شے کا نام ہے وہ اسلام میں بیعت ہی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

سورۃ الفتح میں بیعتِ رضوان کا ذکر

وہ بیعت جو محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے مقام پر کی' اس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ''اللہ تعالیٰ راضی ہو چکا اہل ایمان سے جبکہ (اے نبیؐ) وہ آپ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے''۔ فعل ماضی پر جب ''قَدْ'' آتا ہے تو اس کے قطعی' حتمی اور یقینی ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ ﴿فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جو کچھ کہ ان کے دلوں میں تھا''۔ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کی کیفیت کو خوب جانتا تھا۔ ﴿فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ عَلَیْهِمْ﴾ ''اس لیے اس نے اُن پر سکینت نازل فرمائی''۔ یعنی قلبی اطمینان عطا فرما دیا۔ حالانکہ معلوم تھا کہ ہم نہتے ہیں' ہم احرام باندھے ہوئے ہیں' ہم پر اچانک ہجوم ہو جائے' ایک دم حملہ ہو جائے تو کیا ہوگا؟ لیکن نہیں! انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اطمینان اور سکون کی کیفیت نصیب ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ تو جان دینے کا سودا پہلے سے کیے ہوئے ہیں' بالکل مطمئن

ہیں‘ دل ٹھکا ہوا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ وہ تو جان دیتے وقت ’’فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ‘‘ پکارنے والے لوگ تھے کہ ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا! ان کا معاملہ اس طرح کا ڈانواں ڈول معاملہ نہیں تھا۔ اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ ’’تو اللہ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو بدلے میں قریبی فتح عطا فرمائی‘‘۔ سورۃ الفتح کے تفصیلی درس میں مَیں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ کی فتح بھی ہے اور فتح خیبر بھی ہے جو اِس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے بطورِ انعام عطا فرمائی اور جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت فراہم فرمایا۔

اہل ایمان کی بیع وشراء کس کے ہاتھ پر؟

سورۃ الفتح کی آیت ۱۰ میں وہ اصل حقیقت بیان ہو رہی ہے کہ بات سمجھ لو کہ اصل میں یہ بیع وشراء کس کے ہاتھ پر ہے‘ کس کے مابین ہو رہی ہے‘ اس مبایعت کے فریق کون ہیں! فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ’’یقیناً (اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں‘‘۔ سودا اللہ سے ہوا ہے۔ تبایع یا مبایعت بندۂ مؤمن اور اللہ کے مابین ہے۔ نبی اس وقت عالمِ واقعہ میں اللہ کی طرف سے وصول کنندہ (receiver) ہے۔ یہ جو نظم قائم ہوا ہے اس میں اب ان کی حیثیت امیر کی اور ان کے ساتھیوں کی حیثیت مأمورین کی ہے۔ یہ سودا کرنے والے اپنے جان اور مال اب ان کے حکم سے صرف کریں گے‘ ان کے مطالبے پر حاضر کر دیں گے‘ جیسے اور جب وہ چاہیں گے یہ پیش کر دیں گے۔ لیکن یہ کہ اصل سودا اللہ کا اور بندے کا ہے۔ ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ ’’اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھوں کے اوپر‘‘۔ اب یہاں وہ بیعت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا‘ کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت ہوتی ہے۔ بیعت کرنے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور بیعت لینے والا کا نیچے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں فرمایا کہ ایک اور تیسرا ہاتھ بھی ہے۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر ایک اور ہاتھ ہے اور وہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو یہ ایک سہ فریقی (tripartite) معاہدہ ہے۔ عالم واقعہ

میں یہ بیعت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر ہو رہی ہے اور حقیقتاً یہ بیعت اللہ سے ہو رہی ہے۔ ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ ’’اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے‘‘۔

﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ ’’اب جو اِس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اسی پر ہوگا‘‘۔ اس بیعت کا یہ رُخ جو ہے بہت اہم ہے۔ نوٹ کیجیے عربی زبان میں حروف کے اعتبار سے جو الفاظ مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں ان کے معانی میں اور ان کی حقیقت میں بھی ایک بہت گہرا ربط ہوتا ہے اور ان میں ثقالت اور لطافت کی بھی ایک نسبت ہوتی ہے۔ نقض کے معنی ہیں توڑ دینا‘ ختم کر دینا۔ یہود کے بارے میں فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ﴾ (المائدۃ:۱۳) ’اس وجہ سے کہ یہ اپنے عہد معاہدے کو توڑ دیتے ہیں‘‘۔ نقضِ عہد‘ نقضِ میثاق کی ترکیب ہم استعمال کرتے ہیں۔ ایک اصطلاح ’’نقضِ غزل‘‘ بھی ہے جو اِس آیتِ قرآنی سے ماخوذ ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾ (النحل:۹۲) ’’اور اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو توڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے‘‘۔ لفظ ’’نکثَ‘‘ بھی دراصل ’’نَقَضَ‘‘ کے مشابہ ہے۔ ’’ن‘‘ دونوں میں مشترک ہے‘ نکثَ میں ’’ق‘‘ کے بجائے ’’ک‘‘ ہے‘ اسی طرح ’’ض‘‘ ثقیل حرف ہے تو اس کی جگہ ’’ث‘‘ ہے جو خفیف ہے۔ ’’نکثَ‘‘ کے معنی بھی توڑ دینا ہیں‘ لیکن یہ خفیف ہے۔ یعنی ایک اعلانیہ بات نہیں ہے‘ بلکہ انسان اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہے‘ قول وقرار سے پھر رہا ہے‘ اندر ہی اندر پسپائی ہو رہی ہے۔

یہی بات مَیں نے ارتداد کے ضمن میں عرض کی تھی کہ ایک ارتداد ظاہری ہے‘ کھلم کھلا ہے‘ اس کے اوپر تو مفتی کا فتویٰ لگے گا‘ قاضی کا حکم لگے گا اور حد جاری ہو جائے گی‘ لیکن ایک وہ ارتداد ہے جو اندر ہی اندر ہو رہا ہے‘ ایک اندرونی پسپائی (retreat) ہے‘ آدمی اپنے نقشِ قدم سے لوٹ رہا ہے۔ یہ جو اندر ہی اندر والا ارتداد ہے یہ نفاق ہے‘ جس پر قاضی کا حکم نہیں لگ سکتا‘ مفتی کا فتویٰ نہیں چل سکتا۔ نفاق پر تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے کسی حکم کا کوئی اجراء نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ تو ایک باطنی حقیقت ہے۔ یہی

معاملہ یہاں نکث کا ہے۔ ﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ اب جو اِس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ لہٰذا اپنے آپ کو ٹٹولتے رہا کرو' دیکھتے رہا کرو۔ جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں کہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہا کرو۔ اپنے دلوں کا جائزہ لیتے رہو کہ اس پر انشراح ہے' انبساط ہے' استبشار ہے یا انقباض ہو چکا ہے؟ کہیں پسپائی تو نہیں کر چکے؟ اندر ہی اندر کہیں اس قول وقرار کی خلاف ورزی تو نہیں ہورہی؟ جان لو کہ جو کوئی بھی یہ شکل اختیار کرے گا وہ اس کا سارا وبال درحقیقت اپنے اوپر لے گا۔ اس لیے کہ جس کے ہاتھ پر بیعت کی جا رہی ہے اس نے تو آپ سے کوئی چیز طے ہی نہیں کی۔ سودا تو آپ کا اللہ کے ساتھ ہوا تھا' قیمت اُسی نے دینی ہے' محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں کوئی قیمت نہیں دینی' قیمت تو تم اللہ سے لوگے۔ تمہارا عہد' قول وقرار اور مبایعت تو اللہ سے ہوئی ہے۔ تم اگر اپنے عہد سے پھرے تو سارا وبال اپنے اوپر لوگے' ان کا کوئی نقصان نہیں ہوگا' انہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس معاملے میں ذمہ داری ساری تمہاری ہے۔

اب آگے وہی لفظ ''اَوْفٰی'' فعل کی صورت میں آ گیا ہے (اَوْفٰی' يُوْفِيْ' اِيْفَاءً)۔ سورۃ التوبۃ کی مذکورہ بالا آیت میں ''اَوْفٰی'' افعل التفضیل کا صیغہ تھا' یعنی سب سے بڑھ کر وفا کرنے والا۔ یہاں یہ فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰﴾ ''اور جس نے اس عہد کو پورا کیا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا''۔ یہ ہے بیعت کی اصل حقیقت کہ جس سے ایک اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور اس میں امیر اور مأمور کی نسبت قائم ہوتی ہے۔

سورۃ الممتحنہ میں ''بیعت النساء'' کا تذکرہ

بیعت کا لفظ قرآن مجید میں چوتھی بار سورۃ الممتحنہ میں آیا ہے جہاں خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ سورۃ الممتحنہ' سورۃ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے' جس میں صلح حدیبیہ کا ذکر ہے۔ صلح حدیبیہ میں طے ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان مکّہ سے مدینہ آ جائے گا تو

اسے واپس کرنا ہوگا۔ اسی ضمن میں اب خواتین کا مسئلہ پیدا ہوا جو ایک جداگانہ حیثیت کا معاملہ تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر یہ سورۃ الممتحنہ نازل ہوئی۔ بہرحال میں اس پوری بحث میں نہیں جارہا' صرف یہ آیت نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں بیعت کا ذکر چوتھی بار اِس آیت میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ ''اے نبیؐ! جب آپ کے پاس مؤمن خواتین بیعت کرنے کے لیے آئیں'' ﴿عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گی'' ﴿وَّلَا يَسْرِقْنَ﴾ ''اور چوری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا يَزْنِيْنَ﴾ ''اور بدکاری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے کوئی بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گی'' ﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور کسی معروف کام میں جو حکم آپ دیں گے اس سے سرتابی نہیں کریں گی'' ﴿فَبَايِعْهُنَّ﴾ ''تو (اے نبیؐ!) ان کو بیعت کر لیجیے!'' ان کی بیعت قبول فرمایئے۔ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ غفور ہے' رحیم ہے''۔

یہ قرآن حکیم کے چار مقامات ہو گئے جن میں بیعت کا لفظ آیا ہے۔ ان میں سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ بیعت کی اصل حقیقت کو واضح کر رہی ہے' اور تین آیات میں لفظ بیعت کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہے۔

سیرت النبی ﷺ سے بیعت کا ثبوت

بیعت کے ضمن میں ہمیں سیرت النبی ﷺ سے جو طرزِ عمل ملتا ہے وہ ایک بالکل فطری معاملہ ہے۔ مکی دَور میں اہل مکّہ میں سے جو لوگ اسلام لائے سیرت میں ہمیں ان سے کسی بیعت کا ذکر نہیں ملتا (میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان سے حضور ﷺ نے بیعت نہیں لی' لیکن ذکر نہیں ملتا)۔ سیرت النبیؐ میں حضراتِ ابوبکر' عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کے واقعات بڑے اہم ہیں اور ان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے' لیکن ان کی

تفصیلات میں کہیں بھی بیعت کا لفظ نہیں آتا۔ البتہ اگر کوئی شخص باہر سے آیا اور اس نے آ کر اسلام کا اظہار کیا' وہ اسلام لایا تو اس کے ضمن میں روایات مل جاتی ہیں کہ پھر وہ مصافحہ اور قول وقرار بھی ہوا' اور اسے بیعتِ اسلام کہتے ہیں۔ یہ بیعتِ اسلام مکی دَور میں ثابت ہے' لیکن اہل مَکّہ سے نہیں' باہر سے آنے والوں سے۔ اس کے بعد ایک بیعت نظمِ جماعت' ڈسپلن اور سمع وطاعت کی بھی سیرتِ طیبہ سے ثابت ہے' لیکن اس کا بھی ہمیں مَکّہ والوں سے پورے مکی دَور میں کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کسی شے کا عدم ثبوت اس کے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی واقعہ ہوا ہو لیکن مذکور نہ ہو۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن مدینہ والوں سے دو اہم بیعتیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے لی ہیں۔ ایک سن ۱۱ نبوی میں اور دوسری سن ۱۲ نبوی میں۔

اہل مدینہ میں سے سب سے پہلے چھ افراد ایمان لائے تھے' ان کے ضمن میں کسی بیعت کا ذکر نہیں۔ یہ اغلباً سن ۱۰ نبوی ہی کا واقعہ ہے' وہی سال کہ جس میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا تھا۔ وہاں سے آپؐ واپس آئے تو اس کے فوراً بعد جو موسمِ حج آیا اس میں مدینہ کے چھ افراد حضور ﷺ پر ایمان لائے۔ لیکن اس وقت بھی کسی بیعت کا ذکر نہیں ہے۔ اگلے سال وہ بارہ تھے۔ پہلے سال والے چھ میں سے ایک صاحب نہیں آئے تھے' ان میں سے پانچ تھے اور سات مزید تھے۔ جب بارہ افراد نے اسلام کا اظہار کیا تو پہلی بیعت ہوئی۔ اس کو بیعت عقبہ اُولیٰ کہتے ہیں۔ اس بیعت کے الفاظ تقریباً وہی تھے جو کم وبیش دس برس بعد بیعت النساء کے ضمن میں نازل ہوئے اور ابھی ہم نے سورۃ الممتحنہ کی آیت میں پڑھے ہیں۔ گویا اس بیعت میں کسی نظمِ جماعت کا ایک بیج تو موجود ہے' حکم ماننے کا اقرار ہو رہا ہے کہ جو بھی نیکی کی بات آپؐ فرمائیں گے ہم مانیں گے' لیکن اس میں نظمِ جماعت' سمع وطاعت اور اس کے مختلف لوازم کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے گٹھلی کے اندر پورا درخت اور بیج کے اندر پورا پودا موجود ہوتا ہے اسی طرح یہ لوازم اسی بیعت میں بالقوۃ (potentially) موجود ہیں۔ بعد میں اُمت میں جو بیعت ارشاد کا سلسلہ چلا اس کے لیے اس بیعت کو بطور سند اور بطور

دلیل قبول کیا گیا کہ اس میں شرک سے اجتناب' چوری سے اجتناب' بدکاری سے اجتناب' قتلِ اولاد سے اجتناب اور بہتان طرازی سے اجتناب وغیرہ کا وعدہ ہے۔ چنانچہ اس کو بیعتِ توبہ بھی کہا جاتا ہے' بیعتِ ارشاد بھی اور بیعتِ اصلاح بھی۔

تو یہ جو خواتین کی بیعت قرآن میں مذکور ہے یہی بیعت ہمیں بیعت عقبہ اُولیٰ کی صورت میں سیرت النبیؐ میں ملتی ہے اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیعت عقبۂ اُولیٰ اور بیعت عقبۂ ثانیہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے۔ ابھی ہم جو بات سمجھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بیعت درحقیقت کسی نظم کا ہیولیٰ اپنے اندر کم سے کم ظاہری اور نمایاں طور پر نہیں رکھتی' بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ایمان بالرسالت کے اندر اس کے پورے مضمرات موجود ہیں کہ جب آپؐ کو رسول مان لیا' ایمان لے آئے تو اطاعت تو کرنی ہے' اسی طرح اس کا صرف ایک تھوڑا سا اظہار کر دیا گیا کہ آپؐ ہمیں جو حکم بھی دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اس بیعت کے وقت اہل مدینہ نے کہا تھا کہ ہمیں اپنا کوئی جان نثار' اپنا ساتھی دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائے۔ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا اور بعد میں کچھ دنوں کے بعد حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی بھیجا۔ ان حضرات کی تعلیم اور تبلیغ سے اب وہاں پر جو انقلاب آیا تو اگلے سال ۷۲ مَرد اور ۳ عورتیں آئیں اور ان ۷۵ افراد نے جو بیعت کی وہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ' اور وہ سرتاسر نظمِ جماعت کی بیعت ہے۔

اس کی وجہ بھی سمجھ لیجیے کہ حضور ﷺ نے یہ بیعتِ جماعت مَکّہ والوں سے کیوں نہیں لی؟ اس کا ایک سبب بالکل ظاہر وباہر ہے کہ حضور ﷺ وہاں خود موجود ہیں' ابھی کوئی نظم علیحدہ سے قائم کرنے کی ضرورت نہیں' کسی اور کو امیر بنانے کا سوال نہیں۔ وہ chain ابھی وجود میں نہیں آرہی کہ ایک کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا امیر مقرر کیا جائے۔ حضور ﷺ خود موجود ہیں۔ لہٰذا جو چیز از خود ہو رہی ہو اس کے لیے خواہ مخواہ کے تکلف اور تصنع کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جیسے مَکّہ والوں سے بیعتِ اسلام ثابت

نہیں‘ اسی طرح اُن سے کوئی بیعت سمع وطاعت بھی ثابت نہیں۔اور جس طرح باہر سے آنے والے اسلام لائے تو ان کے لیے بیعت کا ذکر مل گیا اسی طرح مدینہ والے آئے تو اُن سے بیعت سمع وطاعت لی گئی۔اور یہ بیعت سمع وطاعت بھی شروع میں نہیں لی گئی‘ بلکہ جب وہاں ایک ہیئت اجتماعیہ کے قیام کی ضرورت پیش آ گئی کہ اب دو چار آدمیوں کی بات نہیں ہے‘ ۷۲ افراد ہیں‘ تو ان سے بیعت سمع وطاعت لی گئی اور ان کے اندر حضورﷺ نے بارہ نقیب مقرر فرمائے۔ یہ نقیب کون تھے؟ یہ حضورﷺ کے نامزد کردہ تھے اور وہاں پر حضورﷺ کی طرف سے ڈسپلن اور نظم کے ذمہ دار مقرر کیے گئے تھے۔ان کے پاس ذاتی حیثیت سے کوئی اتھارٹی یا اختیار نہیں تھا۔جیسے دوسرے ایمان لانے والے ہیں ویسے یہ ایمان لانے والے ہیں۔ان کو اگر کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل ہوئی تو وہ درحقیقت نبی اکرمﷺ کی نامزدگی سے حاصل ہوئی۔اب یہاں ضرورت پیش آئی کہ وہ پورا ڈھانچہ اور پورا نظام تشکیل پا جائے‘ کہ کوئی شخص کوئی اتھارٹی حاصل کر رہا ہے تو کس بنیاد پر؟ اس لیے کہ حضورﷺ نے اس کو نامزد کیا ہے۔ اب گویا کہ ایک نظم قائم ہو رہا ہے۔حضورﷺ تو ابھی مکّہ میں تشریف فرما ہیں۔مدینہ والوں سے ملاقات بھی ہوگی تو ایک سال کے بعد موسمِ حج میں ہوگی۔یہاں مدینہ میں جو کام چلے گا اس کا کون نگران ہے‘ کون ذمہ دار ہے؟ کون امیر ہوگا‘ کون مأمور ہوگا؟ کون حکم دے گا‘ کون سنے گا؟ کس پر اطاعت لازم ہوگی؟ یہ ہے اصل میں وہ وقت کہ جب مدینہ والوں سے آپؐ نے بیعت سمع وطاعت لے لی۔فلسفۂ سیرت کو سمجھنے کے لیے اس تاریخی پس منظر کو اور اس تدریج کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح سے حالات کی exfoliation ہوئی ہے‘ کس طرح سے تقاضے ابھرے ہیں‘ کہاں ضرورت پیدا ہوئی ہے۔جہاں کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں ہمیں سیرت النبیؐ میں کوئی تکلف اور کوئی تصنع نظر نہیں آتا۔

بیعت عقبہ ثانیہ۔ نظم جماعت کی بیعت

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے میں نے بیعت کے جو

الفاظ شروع میں سنائے یہ روایت متفق علیہ ہے۔آپ جانتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس سے اونچا درجہ کسی حدیث کا نہیں جو متفق علیہ ہو‘ جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں کا اتفاق ہو۔اب ہم اس حدیث کا لفظاً لفظاً مطالعہ کرتے ہیں۔**عَنْ عُبَادَۃَ ابْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ** ’’حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی گئی ہے‘ اللہ اُن سے راضی ہو‘‘۔میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے‘ بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کی روایت بھی ان سے ہے اور بیعت عقبۂ ثانیہ کی روایت بھی ان سے ہے۔ کہتے ہیں: **بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ** ﷺ ’’ہم نے بیعت کی تھی رسول اللہﷺ سے‘‘۔کس بات پر بیعت کی تھی؟ کیا قول وقرار ہوا تھا؟ کیا معاہدہ ہوا تھا؟ **عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ** ’’سمع وطاعت پر‘‘۔یعنی سنیں گے اور مانیں گے۔جو حکم ہوگا بسر وچشم تسلیم کریں گے۔ نوٹ کر لیجیے کہ یہاں معروف کا لفظ نہیں ہے‘ اس لیے کہ یہ نظم جماعت کی بیعت ہے جو محمدؐ رسول اللہﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔لہٰذا یہاں اس اضافی لفظ کو لانے سے جو تھوڑا سا معاملہ نرم پڑتا تھا اس سے گریز کیا گیا۔مدینہ آ کر یہ بیعت حضورﷺ نے پھر سب سے لی ہے‘ مہاجرین سے بھی لی ہے۔ہجرت کے بعد تو پھر ایک نظم قائم ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیعت لیتے ہوئے آنحضورﷺ بعض اوقات ’’**فِی الْمَعْرُوْفِ**‘‘ یا ’’**فِیْ مَا اسْتَطَعْتُمْ**‘‘ کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا کرتے تھے کہ اپنی حدِّ استطاعت تک‘ اپنی امکانی حد تک اس بیعت پر قائم رہو گے۔لیکن یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اس معاملے میں ’’**اُمّ السُّنَّۃ**‘‘ کا درجہ درحقیقت اسی حدیث کو حاصل ہے اور اس میں وہ الفاظ موجود نہیں ہیں‘ تاکہ بات پوری ہو‘ پختہ ہو‘ گاڑھی ہو۔حضورﷺ کے معاملے میں معروف کی کوئی اضافی شرط لگانے کی عقلاً یا نقلاً ضرورت ہی نہیں۔البتہ آئندہ ہمیشہ یہ شرط موجود رہے گی۔وہ چاہے بیعتِ حکومت ہو یا بیعت نظم جماعت۔’’**فِی الْمَعْرُوْفِ**‘‘ کی یہ شرط تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے ساتھ بھی موجود تھی‘ تا بہ دیگراں چہ رسد! ان سے زیادہ کس کو حق ہوگا سمع وطاعت کا؟ لیکن وہاں بھی معروف کی شرط برقرار تھی۔اس لیے کہ اب کوئی شخص اپنی ذات میں معیار نہیں ہے‘ اب معیارِ مطلق اللہ اور

اس کا رسولؐ ہے۔

اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں ان پر غور کیجیے۔ چونکہ ڈسپلن قائم کرنا ہے لہٰذا ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جو ایک حصار قائم کر رہے ہیں اور بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑ رہے۔ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ''ہم سمع و طاعت پر کاربند رہیں گے چاہے مشکل ہو چاہے آسانی ہو''۔ شعوری طور پر زبان سے ایک شخص جب یہ الفاظ کہتا ہے' اور اگر واقعتاً وہ بودا انسان نہیں ہے اور سیرت و کردار کے اعتبار سے اسے دیمک نے چٹ نہیں کیا ہوا تو وہ یہ جب کہے گا خوب سوچ سمجھ کر کہے گا کہ میں حکم سنوں گا اور مانوں گا' چاہے تنگی ہو' چاہے آسانی ہو۔ عُسر کا لفظ ویسے تو ہر مشکل کے لیے عام ہے لیکن اس کا اطلاق خاص طور پر مالی تنگی پر ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں مالی تنگی کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ تو اس بات پر بیعت ہو رہی ہے کہ چاہے ہمارے لیے آسانیاں ہوں' فراوانیاں ہوں یا تنگیاں ہوں' ہر حالت میں ہم آپؐ کا حکم سنیں گے اور مانیں گے۔

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ ''طبیعت کی آمادگی میں بھی اور ناگواری میں بھی''۔ منشط' نشاط سے بنا ہے۔ نشاط طبیعت کے اندر ایک آمادگی کی کیفیت ہے۔ انسان جب کسی چیز سے متفق ہوتا ہے تو اس کے لیے کام کرنے کے لیے طبیعت میں آمادگی ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کبھی کسی اجتماعی معاملے میں بہت بحث اور ردّ وقدح ہوئی ہے اور آراء کا اختلاف سامنے آیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ آخری فیصلہ تو ایک ہوگا' اور وہ کچھ لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا اور کچھ کی رائے کے خلاف ہوگا۔ اب جن کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے انہیں تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے چاق و چوبند ہو کر اس میں لگ رہے ہیں' اس لیے کہ وہ تو اُن کی طبیعت کا انشراح ہے' ان کی اپنی رائے یہی تھی' ان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے' جبکہ جن لوگوں کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوا ہے انہیں اب اپنی طبیعت کو اس کے لیے مجبور کرنا پڑے گا۔ تو '' فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ '' کے الفاظ نے ان دونوں کیفیتوں کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاہے طبیعت آمادہ ہو اور چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے' اکراہ کرنا پڑے' اسے مجبور کرنا پڑے۔ اس لیے کہ نظم اس کے بغیر قائم نہیں رہ

سکتا۔ جماعتی زندگی کی تو روحِ رواں یہی ہے۔ یہی اس کا لازمی تقاضا ہے۔

اگر آدمی طے کر لے کہ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا تو ہم ساتھ دیں گے' ورنہ جن کی رائے کے مطابق ہوا وہ آگے بڑھیں' تو یہ جماعتی اعتبار سے منافقت ہے' جس کی سب سے نمایاں مثال غزوۂ اُحد میں سامنے آئی جب عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں خطرے میں کیوں ڈالیں؟ اس کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ خود حضورﷺ کی رائے بھی اگرچہ یہی تھی' لیکن حضورﷺ نے اپنے ساتھیوں کی رائے کا احترام کیا اور ان کی دل جوئی کے لیے' ان کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے' اپنی رائے پر ان کی رائے کو مقدم رکھ کر فیصلہ کر دیا۔ حضورﷺ جب مدینہ منورہ سے نکلے تو آپؐ کے ہمراہ ایک ہزار کی نفری تھی' لیکن اس شخص نے عین میدانِ جنگ میں کتنا بڑا نقصان پہنچایا' جس سے اس وقت کتنے ہی مؤمنین صادقین کے پاؤں میں بھی ایک دفعہ تو تزلزل پیدا ہوا ہوگا کہ ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے! پہلے ہی ہم مقابلے میں ایک تہائی تھے' تین ہزار کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا' اب ہماری ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے۔ اسی لیے سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ (آیت ۱۲۲) ''(وہ وقت یاد کرو) جب تم میں سے بھی دو گروہ ایسے تھے کہ جو ڈھیلے پڑ گئے تھے''۔ جن کے پاؤں میں تزلزل آ گیا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کا یہ اقدام کس بنیاد پر تھا؟ ان لوگوں کا کہنا تھا: ﴿ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (آیت ۱۵۴) ''ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟'' اپنی من مانی کرتے ہیں' جو چاہتے ہیں فیصلہ کر دیتے ہیں' یہ معاملہ تو نہیں چل سکتا' اگر اس طرح معاملہ چلانا ہے تو پھر خود ہی جائیں' خود ہی اپنی جان و مال پر سارے خطرات برداشت کریں' ہم ساتھ نہیں دیں گے!! یہ ہے وہ چیز جس کا سدّ باب کیا گیا ان الفاظ میں کہ فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ چاہے ہماری طبیعت میں نشاط ہو' آمادگی ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے۔ اگر ہم اسے خوشگوار فیصلہ

محسوس کریں تب بھی حکم مانیں گے اور اگر ہماری طبیعت کے خلاف ہو' ہم اس کے لیے اپنی طبیعتوں کو آمادہ نہ پا رہے ہوں تب بھی ہم اپنی طبیعتوں کو مجبور کریں گے اور آپ ﷺ کا حکم مانیں گے۔

آگے چلیے! ”وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا“ اور اس پر بھی (ہم نے بیعت کی) کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے“۔ یہ جماعتی زندگی کا تیسرا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی امیر تو نہیں ہے' جماعتی زندگی میں تو ایک chain چلے گی۔ ایک امیر ہے' اس نے کسی کو اپنا ایک نائب مقرر کیا ہے' پھر وہ کوئی لشکر بھیج رہا ہے تو وہاں اس نے کسی کو سپہ سالار بنایا ہے۔ اس لشکر میں سپہ سالار ہی تو نہیں ہے' کوئی میمنہ کا اور کوئی میسرہ کا امیر ہے' کوئی قلب کا انچارج ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بھی کئی گروپ ہیں' کسی کے پاس کسی گروپ کا جھنڈا ہے' کسی کے پاس کسی کا ہے۔ تو جب بھی کوئی ہیئت اجتماعی قائم ہو گی تو اس میں یہ chain ناگزیر ہے۔ سوائے ایک شخص کے جو اُس ہیئت اجتماعی کا امیر ہے' وہ تو امیر ہی ہے' باقی تو ہر شخص امیر بھی ہے اور مامور بھی ہے۔ اپنے سے اوپر والے کا مامور ہے اور اپنے سے نیچے والوں کے لیے امیر ہے۔

اس ضمن میں ایک اعتراض یہ اٹھا دیا جاتا ہے کہ صاحبِ امارت کے انتخاب اور عزل ونصب کے کوئی قواعد وقانون ہونے چاہئیں' یہ کیا بات ہوئی کہ جس کو چاہا پسند کر لیا اور اس کو جھنڈا تھما دیا۔ اس اعتبار سے آخری امتحان جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے صحابہٴ کرام رضی اللہ عنہم کا لیا ہے وہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت کا امتحان ہے۔ کس اعتبار سے وہ افضل تھے؟ عمر میں وہ پختہ نہیں تھے۔ ابوبکر وعمر' عثمان وعلی اور دیگر کبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود ہیں اور جھنڈا تھما دیا اسامہ بن زیدؓ کو۔ یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چاہے تم پر ایک حبشی غلام امیر بنا دیا جائے' تمہیں اس کا حکم ماننا ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہم اعلیٰ ہیں' ہم برتر ہیں اور یہ کمتر ہے' اس کو ہم پر خواہ مخواہ امیر بنا دیا گیا' کوئی معیار ہونا چاہیے' کوئی قاعدہ' قانون اور ضابطہ ہونا چاہیے' یہ کیا ہے کہ بس ایک شخص پسند آ گیا اور اس کو امیر بنا دیا!! ان ساری چیزوں کا سدّ باب پہلے ہی

سے کر دیا گیا اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات تسلیم کروالی کہ یہ میرا اختیار ہوگا' جس کو چاہوں امیر بناؤں۔ بیعت میں ”وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا“ کے الفاظ ادا کرنے والے پہلے سے طے کر رہے ہیں' عہد کر رہے ہیں کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے پھر بھی ہم سمع وطاعت پر کاربند رہیں گے۔ دیکھئے یہاں اس کا بھی امکان ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ واقعتاً یہی شخص جس کو امیر بنایا جا رہا ہے' افضل ہے یا اہل تر ہے' لیکن ایک خیال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہم میں افضل نہیں ہے۔ اس کے باوجود جس کے ہاتھ میں جھنڈا تھما دیا جائے' تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہے۔ یہ chain جو ہے اطاعت کی' اسے برقرار رکھنا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ)) ”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی“ ((وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ))(۱) ”اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی“۔ اب یہ chain چلی جائے گی۔ البتہ اب معروف کی شرط آپ سے آپ آ جائے گی۔ حضور ﷺ نے بھی کسی کو معین کیا ہو تو وہاں اطاعت فی المعروف ہوگی۔

ایک صاحب کا واقعہ ملتا ہے کہ ان کو حضور ﷺ نے کسی دستے پر کمانڈر بنا کر بھیجا' وہ جلالی مزاج کے آدمی تھے' اپنے ساتھیوں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تو اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے انہیں بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ ساتھیوں نے گڑھا کھود دیا۔ اب حکم دیا کہ اس میں لکڑیاں ڈالو۔ انہوں نے لکڑیاں ڈال دیں۔ حکم دیا کہ لکڑیوں کو آگ لگاؤ۔ انہوں نے آگ لگا دی۔ یہاں تک تو اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس آگ میں کود جاؤ! اس پر وہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللہ تعالی: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامرمنکم۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔

ٹھٹک کر کھڑے رہ گئے کہ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما‘ تو اس آگ میں ہم آپ کے حکم سے کیسے کود جائیں؟ بعد میں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے ٹھیک کیا‘ اور اگر کہیں وہ اس آگ میں کود جاتے تو پھر آگ ہی میں رہتے۔ یعنی جہنم میں داخل ہو جاتے۔ آپ ﷺ نے اس کی توثیق اس لیے فرمائی کہ یہ حکم فی المعروف نہیں تھا‘ یہ تو منکر کا حکم تھا‘ خودکشی کا حکم تھا۔ ایسے حکم کی اجازت کسی صاحب امر کو نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا چاہے وہ حضور ﷺ کا مقرر کردہ امیر ہو لیکن اس کی اطاعت بھی فی المعروف ہوگی‘ مطلق نہیں ہوگی۔ مطلق اطاعت صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ محمد ﷺ آخری انسان تھے جن کی اطاعت مطلق تھی‘ ان کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اطاعت مطلق نہیں ہے تو اور کس کی ہوگی؟

یہ بھی نوٹ کیجیے کہ بخاری و مسلم ہی کی بعض روایات میں لفظ ’’اَمِیْرِیْ‘‘ کے بجائے ’’اَلْاَمِیْرَ‘‘ ہے: ((وَمَنْ یُطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ)) اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد امارت کو ایک ادارے (institution) کی حیثیت حاصل ہونی تھی۔ اب یہ تو نہیں ہے کہ ہر ایک کو امارت کا پروانہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہی سے ملے گا‘ بلکہ وہ نظم کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی بجا آوری کے لیے قائم کیا جا رہا ہے‘ جس میں اصلاً اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطاع مانا گیا ہے‘ اب اس میں جو بھی نصبِ امارت ہوگا اس کے ضمن میں یہ تیسری بات بھی پہلے سے مان لی گئی کہ ہم سمع و طاعت کی روش اختیار کریں گے خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ اسی ’’اَثَرۃ‘‘ سے بابِ ’’اِفعال‘‘ میں لفظ ایثار بنا ہے۔ سورۃ الحشر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ﴾ ’’وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں‘‘۔

آگے چوتھی بات بیان کی جا رہی ہے: وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ’’اور ہم صاحبِ امر سے جھگڑیں گے نہیں‘‘۔ جو بھی ولاۃِ امر ہوں گے‘ جو جس سطح پر ہے‘ جس جگہ

ہے‘ ہم اس کا حکم مانیں گے‘ اس سے امر میں جھگڑیں گے نہیں۔ اس کے بعد ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ((اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ)) اور یہ الفاظ حضور ﷺ کی طرف سے ہیں کہ: ’’سوائے اس کے کہ تم دیکھو (صاحبِ امر کی طرف سے) کوئی کھلم کھلا کفر جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو‘‘۔ یہ نہیں کہ ہمیں اختلاف ہے صاحب! ہم تو اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتے! جہاں بات تعبیروں کی یا تدبیروں کی ہوگی‘ جہاں مباحات کا دائرہ ہوگا وہاں آپ اختلاف نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کوئی دلیل قطعی ہو‘ کوئی ثبوت موجود ہو تب تو تم اطاعت سے سرتابی کر سکو گے‘ تب تم کوئی جھگڑا ڈال سکو گے‘ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو معمولی اختلافات‘ تعبیر کے فرق یا تدبیر میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر آپ کوئی جھگڑا پیدا کرنے کھڑے ہو جائیں تو یہ اس بیعت کے خلاف ہو جائے گا۔

بیعت کے اگلے الفاظ ہیں: وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ ’’اور (ہم نے بیعت کی تھی) اس پر بھی کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں‘ اور ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے‘‘۔ ان الفاظ کے ذریعے عقیدت کی بنیاد پر سمع و طاعت میں غلو کا راستہ بند کر دیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر شخصیت پرستی برآمد ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اندھے‘ بہرے اور گونگے بن کر چلو‘ بلکہ تم اپنی رائے کو برقرار رکھو۔ اپنی سوچ اور عقل کے اوپر پہرے نہ بٹھاؤ‘ اس کو بروئے کار لاؤ۔ اللہ نے جو استعدادات دی ہیں‘ ان کو بھرپور طریقے پر استعمال کرو اور تمہاری جو رائے ہو اُس کے بیان کرنے میں کبھی بھی کوئی ہچکچاہٹ‘ کوئی جھجک‘ کسی کا رعب یا کسی کی عقیدت مانع نہ آئے۔ کسی ملامت کرنے والے کے خوف سے اپنی زبانوں پر تالے مت ڈالو!

نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت

یہیں وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت کیا ہے!

دراصل اظہارِ رائے یا مشورہ دینا حق نہیں ہے بلکہ فرض ہے۔ تم اپنی رائے دو' مشورہ دو' اس کے بعد تم فارغ ہو' تمہاری ذمہ داری ادا ہوگئی۔ ہمارے یہاں حقوق پر توجہ بہت زیادہ ہے' جبکہ فرائض نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تو ایک ہی لفظ کو آپ حق بھی کہہ سکتے ہیں اور فرض بھی کہہ سکتے ہیں۔ شوہر کا جو حق بیوی پر ہے وہی بیوی کا فرض شوہر کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح بیوی کا جو حق شوہر پر ہے وہی شوہر کا فرض بیوی کے ضمن میں ہے۔ یہ حقوق وفرائض کا معاملہ ہے۔ لیکن آج جو ہمارا معاشرہ سارا تلپٹ ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق کی بات سب کرتے ہیں' فرض کی بات کوئی کرنے کو تیار نہیں۔ اگر انسان کی توجہ ذرا فرائض کی طرف منعکس ہو جائے تو تمام معاملات درست ہو جائیں۔ لہٰذا اپنے فرائض ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔ کوئی حق اگر مارا بھی گیا تو اللہ کے ہاں اس کی تلافی (compensation) ہو جائے گی' فرض کے اندر کوتاہی ہوگئی تو کیا کرو گے؟ جواب دہی تمہاری ہوگی۔ اگر فریق ثانی نے تمہارا کوئی حق مار لیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سارا لین دین ہو جائے گا۔ وہاں کی کرنسی نیکیاں اور بدیاں ہے' وہاں تو اعمال کا مبادلہ ہوگا' یعنی نیکیوں اور بدیوں کا۔ لہٰذا اس میں گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ گھاٹے کا سودا اس میں ہے کہ تم نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی' اس کی جواب دہی اللہ کے ہاں کرنی پڑے گی۔ وہاں اپنی نیکیاں دینی پڑ جائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا وبال تمہارے اوپر آ جائے۔ تو یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں مشورہ دینا حق نہیں ہے' فرض ہے۔ آدمی فرض ادا کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہتا کہ لازماً میری بات مانی جائے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار تو عبداللہ بن اُبی کا طرزِ عمل ہے۔ مشورہ دینے میں کوئی رکاوٹ (inhibition) پسندیدہ نہیں ہے۔ اس میں کسی کے روکنے کی وجہ سے یا کسی کے خیال اور لحاظ کی بنا پر رک جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ تم بات کہو! کہنے کے بعد تم نے اپنا فرض ادا کر دیا' عنداللہ تم بری ہو گئے۔ اب معاملہ صاحبِ امر کا ہے۔ وہاں ووٹوں کی گنتی سے فیصلے نہیں ہوں گے۔ تنظیم کا وہ ڈھانچہ ہی مختلف ہوتا ہے جس میں کہ یہ سارا معاملہ

ووٹوں کی گنتی سے وجود میں آتا ہے۔

آپ نے نوٹ کر لیا ہوگا کہ اس ایک حدیث میں اسلامی نظم جماعت کے جتنے بھی دستوری تقاضے ہیں ان کا حصر موجود ہے۔ میرے نزدیک تو یہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ الفاظ صحابہ کرام ؓ نے خود نہیں کہے ہوں گے' بلکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائے اور ان میں حضور ﷺ نے نظم اور ڈسپلن کے اعتبار سے بیعت کرنے والوں کا اس طرح ''گھیراؤ'' کیا ہے کہ کہیں کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا۔ معاذ اللہ' آپؐ کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ دین کا کام کرنا ہے تو اس کے لیے ایک مضبوط نظم والی جماعت چاہیے' ڈھیلا ڈھالا ادارہ نہیں چاہیے۔

نظم اجتماعی کا شعور اور صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام ؓ کے اندر اس نظم کا شعور اس قدر پیدا ہو چکا تھا کہ ہر شخص ہر وقت یہ نوٹ کرتا کہ اس وقت میں کس حیثیت میں ہوں اور دوسرا شخص کس حیثیت میں ہے۔ آیا ہم ہم مرتبہ (equi-status) ہیں اور کوئی تیسرا ہمارا امیر ہے' ہم دونوں اس کے تابع ہیں یا یہ کہ میں امیر ہوں اور یہ مأمور ہے' یا یہ کہ وہ امیر ہے' میں مأمور ہوں۔ نظم کے اعتبار سے یہ تین مختلف حیثیتیں ہیں' اور ایک انسان ہر معاملے میں' جو بھی اقدام وہ کر رہا ہے یا زبان سے جو بھی لفظ نکال رہا ہے' اس کا رویہ اگر اس شعور کے تحت نہیں ہو گا تو سارا نظم تہہ و بالا ہو جائے گا۔ ایک نظم جماعت کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے یقیناً سب برابر ہیں' لیکن جب امر قائم ہوا ہے' صاحب امر کا نصب ہو گیا ہے' اب وہ امیر ہے اور آپ مأمور ہیں۔ جیسے انسان ہونے کے ناتے مَرد وزن یقیناً برابر ہیں۔ شرفِ انسانیت کے اعتبار سے عورت گھٹیا نہیں ہے' لیکن جب ایک مَرد اور ایک عورت کے اندر رشتۂ ازدواج قائم ہوا ہے تو ان کے مابین محض مَرد اور عورت کی نسبت نہیں رہی' اب شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ یہاں قرآنی ہدایت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۳۴) کا اطلاق ہوگا۔ اب معاملہ بالکل بدل گیا' نوعیت تبدیل ہوگئی' نسبت اور ہوگئی! اسی طرح تمام رفقاء آپس میں برابر ہیں' لیکن جب کوئی صاحب امیر

بنا دیے گئے تو اب امیر اور مأمور کی جو ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے اس کا تعین ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کی نمایاں ترین مثال جب پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تو عقل دنگ رہ گئی کہ حضور ﷺ نے ڈسپلن کا کیسا شعور پیدا کیا تھا!

مشہور واقعہ ہے کہ سن ۹ ھ میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر قافلہ روانہ فرما دیا۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات نازل ہوئیں، جن میں تیسری آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ یعنی حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ باتیں لوگوں کے سامنے بیان کر دی جائیں، ان کا اعلان (proclamation) ہو جائے۔ تو حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ تم میرے نمائندے کی حیثیت سے اجتماعِ حج میں یہ آیات پڑھ کر سنا دو! اس لیے کہ یہ ایک انتہائی اہم اعلان تھا کہ مشرکین سے تمام معاہدے ختم ہو جائیں گے، کسی کا کوئی عہد نہیں رہے گا اور یہ بات کہ چار مہینے ختم ہوئے تو قتل عام بھی شروع ہو جائے گا۔ اصل میں مسلمان تو اپنے نظم کو جانتے تھے، لیکن ابھی جو لوگ دائرۂ اسلام سے باہر تھے وہ اس سے واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی سابقہ روایت کے مطابق یہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ اعلان اسی صورت میں مؤثر (valid) ہے جبکہ حضور ﷺ کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار، اُن کے گھرانے کا کوئی فرد یہ اعلان کرے۔ تو گویا اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا اور ان کے ذمے لگایا کہ اجتماعِ حج میں ان آیات کو پڑھ کر سنا دیں۔ جب حضرت علیؓ آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟'' یعنی مجھے پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں یا مأمور کی حیثیت سے؟ مجھے اپنی حیثیت بھی معلوم ہونی چاہیے اور آپ کی حیثیت بھی۔ اگر حضور ﷺ نے مجھے معزول کر کے آپ کو امیر بنایا ہے تو میں حاضر ہوں، امارت سنبھال لیے! اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''مَاْمُوْرٌ!'' یعنی میں امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا، امیر آپ ہی ہیں، میں مأمور بنا کر بھیجا گیا ہوں، صرف ایک خاص کام میرے

ذمے لگایا گیا ہے، وہ میں کروں گا۔ یہ ہے اس نظم اور ڈسپلن کا احساس!

اس نظم و ضبط کو میں انقلاب کے معاملے میں مثال کے طور پر پیش کیا کرتا ہوں کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب میں یہ پہلو مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ جس معاشرے میں کوئی نظم اور کوئی ڈسپلن نہیں تھا، جسے ''قَوْمًا لُّدًّا'' (جھگڑالو قوم) کہا گیا ہے، اس میں کون کسی کی بات سنتا تھا اور کون کسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہوتا تھا۔ اس قوم میں ڈسپلن کا یہ احساس پیدا کیا! اسی کا مظہر تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ پر کمانڈر مقرر کیا گیا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ اچھا جی، اب مجھے رخصت دیجیے، جو شخص میرے ماتحت رہا ہے میں اس کے ماتحت رہ کر اب کیسے کام کروں گا! اس لیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جو تربیت کی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ ہر ایک کے پیشِ نظر یہی تھا کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے، خواہ امیر کی حیثیت سے ہو خواہ مأمور کی حیثیت سے۔ جس کو جو حکم ملا ہے اس کو وہ کام کرنا ہے، ہم اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے حاضر ہوئے ہیں، کسی پر احسان رکھنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ساری جدوجہد ہم اپنی عاقبت بنانے کے لیے کر رہے ہیں، ہم کسی اور کا جھنڈا تھامنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی عاقبت بنانے کے لیے دین کو قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اجتماعیت لازم ہے اور جماعتی حیثیت کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔ اس کے لیے ایک ڈسپلن ہوگا، جس میں امراء کی اور مأمورین کی ایک chain ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ جب امیر اور مأمور کی یہ نسبت قائم ہوگی تو اس نسبت کا پھر جو بھی تقاضا ہوگا وہ پورا کیا جائے گا۔ لیکن سمع و طاعت کا یہ معاملہ شخصی نہیں ہوگا، بلکہ اس نظم کے اعتبار سے کسی شخص کی جو حیثیت ہے اسی درجے میں اس کی اطاعت ہو رہی ہے۔ یہ ہے وہ نظم جماعت جو آنحضور ﷺ نے قائم کر کے دکھایا اور یہ ہے وہ بیعت کا نظام جو منصوص بھی ہے، مسنون بھی ہے اور مأثور بھی۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ مختلف مواقع پر اور بھی بیعتیں لے لیتے

تھے۔مثلاً کسی سے بیعت لی: ''عَلٰی نُصْحٍ لِکُلِّ مُسْلِمٍ''۔یعنی اس بات پر کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو گے۔اسی طرح آپؐ نے کہیں ہجرت کی بیعت' کہیں جہاد کی بیعت اور کہیں موت کی بیعت لی۔کہیں یہ بیعت بھی لی کہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے (عَلٰی اَنْ لَّا نَفِرَّ)(۱) تو حضورﷺ کے زمانے میں یہ بیعتیں ہوئی ہیں۔لیکن یہ جان لیجیے کہ اصل بیعتیں دو بنیں: ایک بیعت اسلام اور اس کے ساتھ بیعت ارشاد' اور دوسری بیعت جہاد اور بیعت سمع وطاعت۔اس لیے کہ اس اجتماعیت کے لیے بیعت سمع وطاعت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔نظم اجتماعی کے ضمن میں اس حدیث کو اصل ''منات'' کی حیثیت حاصل ہے۔یعنی یہ وہ کھونٹا ہے جس کے گرد اجتماعیت کی چکی گھومتی ہے۔اس حدیث کا تو ایک ایک لفظ ہم میں سے ہر شخص کو زبانی یاد ہونا چاہیے اور ان تقاضوں کا پورا شعور ہونا چاہیے' اس لیے کہ ہمیں اب اپنی اجتماعیت ہیئت کو بالکلیہ اس پوری حدیث کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اب بالکلیہ اسی بیعت کے نظام پر اپنے پورے ڈسپلن کو اور اپنے پورے ڈھانچے کو کھڑا کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

آج کے اس درس کو میں اس شعر پر ختم کر رہا ہوں جو متفق علیہ روایات کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا(۲)

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمدﷺ سے جہاد کی بیعت کی۔اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہمارے جسم وجان کا رشتہ برقرار ہے''۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب استحباب مبایعۃ الامام الجیش عند ارادۃ القتال۔
(۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب التحریض علی القتال وباب حفر الخندق۔
وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوۃ الاحزاب وھی الخندق۔

درس ۶

بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں
اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام کا عنوان:
'نہی عن المنکر' اور 'محافظتِ حدود اللہ' کے ضمن میں
طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ج وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۱۲﴾ (التوبۃ) ...... صدق اللہ العظیم

دروس کی ترتیب پر ایک نظر

اِن نشستوں میں منتخب نصاب (۲) کے دروس جس ترتیب سے آ رہے ہیں اس کو دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ درحقیقت درسِ اوّل میں ہمارے اصل اور بنیادی منتخب نصاب (۱) اور اس منتخب نصاب (۲) کے مابین ربط قائم کیا گیا ہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ اور اس کا ہدفِ اوّلین شہادت علی الناس' جو سورۃ الحج کی آخری آیت میں مذکور ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ (آیت ۷۸) ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے''۔ اور اس کی غرض وغایت' اس کا مقصد بھی اسی آیت میں بیان ہوا: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ پھر سورۃ الصّف کے حوالے سے جہاد کی نہایت زوردار دعوت ہے ان الفاظِ مبارکہ میں: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۱) ''تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ''۔ اور اس کا ہدف' اس کی غایتِ قصویٰ اور اس کی آخری منزل بیان ہوئی سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴿۹﴾﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تاکہ اسے غالب کرے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر''۔ یہ دونوں مقامات ہمارے منتخب نصاب (۱) میں شامل ہیں۔

شہادت علی الناس اور غلبۂ دین کے تصور کو مزید مؤکد کیا گیا اس منتخب نصاب (۲) کے درسِ اوّل میں' جو سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ پر مشتمل ہے' جس میں اقامتِ دین کا تصور سامنے آیا۔ اس میں اقامتِ دین کے لیے نہ صرف پکارا گیا

ہے بلکہ للکارا گیا ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ ''یہ کہ تم دین کو قائم کرو اور اس (دین کے معاملہ) میں متفرق مت ہو جانا''۔ اس درس کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ ۵۳ آیات پر مشتمل اس پوری سورت (الشوریٰ) میں جمع کے صیغہ میں صرف ایک ہی فعل امر آیا ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ اور ایک ہی فعل نہی آیا ہے: ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ اور پھر سورت کے آخر میں جا کر دوبارہ ان دونوں کے لیے زوردار دعوت ہے۔ ویسے تو ''امر'' اور ''نہی'' دونوں میں اللہ کا حکم آ گیا' لیکن سورت کے آخری حصے میں اسے مزید مؤکد کیا گیا: ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ﴿۴۷﴾﴾ ''اپنے ربّ کا حکم مان لو اُس دن کے آنے سے پہلے کہ جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے والا ہو گا''۔

شہادت علی الناس اور غلبۂ دین کی یہ جدوجہد کس نے کی؟ اور وہ لوگ کن اوصاف کے حامل تھے؟ یہ سورۃ الفتح کی آخری آیت کا مضمون ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب (۲) کے درسِ دوم میں ''اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف'' کے عنوان سے شامل ہے۔ پھر اسی عنوان کے تحت سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ اور سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۴۳ بھی اس نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔

ان اسباق کے ذریعے یہ بات معین ہو گئی کہ اگرچہ مسلمان کا اصل نصب العین سوائے نجاتِ اُخروی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے اور کچھ نہیں' تاہم اس دنیا میں اس کی جدوجہد کا اصل ہدف اور اس کے لیے منزل اللہ کے دین کا غلبہ اور اس نظام کا بالفعل قیام ہے جس میں اللہ کو حاکمِ حقیقی تسلیم کیا جائے اور اسی کو شارعِ حقیقی مانا جائے۔ ظاہر ہے اُس کے نمائندے کی حیثیت سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں' لیکن حاکمِ حقیقی اللہ ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾۔ اس تصور کو ہم نے ایک جدید اصطلاح ''اسلامی انقلاب'' سے واضح کیا۔ یہ انقلاب لازماً افراد سے شروع ہو گا' اور افراد میں

بھی ان کے اذہان وقلوب سے۔ اور اس کا نتیجہ عملی انقلاب ہوگا۔ پھر جو افراد جمع ہوں گے وہ ایک بنیانِ مرصوص بنیں گے' ایک قوت کی شکل اختیار کریں گے اور یہ قوت اللہ کے دین کے اس غلبے کے راستے میں مزاحم قوتوں کو چیلنج کرے گی اور اُن سے ٹکرائے گی۔ اس چیلنج اور ٹکراؤ کے نتیجے میں اگر اللہ کو منظور ہوا تو اللہ کا دین غالب ہو جائے گا' بصورتِ دیگر ایسے افراد اللہ کی راہ میں اپنی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں گے۔ یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح سیدھا اور واضح راستہ ہے۔ انسان کے دل میں اگر چور ہو تو وہ جدھر سے چاہے چور دروازہ بنائے اور نکل جائے' لیکن یہ بالکل سیدھا راستہ ہے' سیدھا تصور ہے۔ اس میں کہیں جھول اور ہیر پھیر نہیں ہے' اس میں کہیں تکلف اور تصنع نہیں ہے۔

اب جہاں تک اس انقلاب کے عمل کا تعلق ہے' اس کے ضمن میں پہلی بات جس کو ہم نے نمایاں کیا ہے وہ یہ کہ یہ انقلاب محض اسی راستے سے آ سکتا ہے جس راستے سے محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا' جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے' جسے امام مالک ؒ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

" لَا یَصْلُحُ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا "

''اس اُمت (مسلمہ) کے آخری حصہ کی اصلاح محض اسی طریق پر ہوگی جس پر کہ پہلے حصہ کی ہوئی ہے''۔

دیگر تبلیغی' تدریسی' تعلیمی اور اصلاحی کام وغیرہ تو اس کے بغیر ہو سکتے ہیں' ان میں سے ہر ایک اہمیت کا حامل ہے' لیکن اگر اقامت دین اور اظہار دین الحق علی الدین کلّہ کا کلی تصور سامنے ہو تو اس کے لیے راستہ سوائے اُسوۂ رسول ؐ کے اور کوئی نہیں۔ ذاتی اصلاح کے لیے اگر کوئی خانقاہی نظام پہلے کی طرح اب بھی موجود ہو اور مفید نتائج برپا کر رہا ہو تو اس کی نفی نہیں ہے۔ اسی طرح وعظ وتلقین وارشاد کا جو سلسلہ بھی اجتماعی اور انفرادی سطح پر ہو رہا ہے' اس کی بھی نفی نہیں ہے' وہ بھی ایک خدمت ہے کہ جو ہو رہی ہے۔ دین کی تعلیم وتدریس کا کوئی کام کہیں ہو رہا ہے' وہ چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو چاہے بڑے پیمانے پر ہو' اس کی بھی نفی نہیں ہے۔ وہ بھی ایک مفید خدمت ہے جو ہو رہی ہے۔ لیکن

اگر ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ اور ﴿وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾ کے قرآنی احکام کے حوالے سے غلبۂ دین اور اقامت دین کا کلی تصور پیش نظر ہو کہ دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے تو اس کے لیے ہمیں پوری طرح غور وفکر اور سوچ بچار کر کے اور پوری باریک بینی سے اپنی تمام ذہانت اور استعداد کو بروئے کار لا کر خالص معروضی طور پر یہ سمجھنا ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیسے کیا! اس پر میری مفصل تقریریں تحریری صورت میں چھپ چکی ہیں۔

منہج انقلابِ نبویؐ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

اب اس غور وفکر اور سوچ بچار کے دو مراحل ہوں گے۔ پہلے مرحلے میں ایک خالص معروضی مطالعہ (absolutely objective study) کرنا ہوگا کہ حضور ﷺ نے اقامتِ دین کا کام کیسے کیا۔ اس میں دو چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں' جس کو میں نے ''سیرت'' اور ''فلسفۂ سیرت'' سے تعبیر کیا ہے۔ سیرت تو اس جدوجہد کے سلسلہ وار مراحل بتائے گی کہ آپ ﷺ نے ابتداءً یہ کیا' پھر یہ کیا' پھر یہ کیا' لیکن یہ سوال کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی کیا حکمتیں ہیں؟ حضور ﷺ نے پہلے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ پھر یہ دوسرا قدم کیوں آیا؟ پہلے اور دوسرے قدم کے مابین کتنا فاصلہ ہے؟ دوسرا قدم اٹھانے کے لیے کیا شرائط ہیں' کیا لوازم ہیں' کون سے تقاضے کس حد تک پورے ہو چکے ہوں کہ اگلا قدم اٹھایا جائے گا؟ ان تمام سوالات کا واضح طور پر جواب سیرت النبی ﷺ میں نہیں ملتا' بلکہ یہ چیزیں ''فلسفۂ سیرت'' کے طور پر سیرت سے اخذ کرنی ہوں گی۔

دوسرے مرحلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس ماحول اور جس دَور میں ہم یہ کام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے آیا سیرت النبی ﷺ سے اخذ شدہ طریق کار میں ہمیں کہیں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ بجائے اس کے کہ غیر شعوری طور پر انسان زمانی اور مکانی عوامل سے متأثر ہو کر کوئی تبدیلی کر لے' اسے شعوری طور پر اس چیز کو معین کرنا چاہیے' تاکہ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر جو نتیجہ نکالا گیا ہو اُس پر نظر ثانی بھی ممکن ہو سکے' اور

برعکس نتائج نکلنے کی صورت میں یہ دیکھا جا سکے کہ آیا اس معاملے میں ہمارا صغریٰ غلط تھا یا کبریٰ غلط تھا! ان چیزوں کو میں اپنی تقاریر میں معین کر چکا ہوں۔

اقامت دین کے لیے پہلا مرحلہ دعوت کا ہے۔ اس میں تو زمان و مکان کے تغیر سے کوئی فرق و تفاوت نہیں ہوگا' بلکہ یہ عین منہاجِ نبویؐ کے مطابق ہوگی۔ دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔ اس کے طریق کار میں صرف ایک فرق ہوگا۔ وہ یہ کہ وہاں تو تنظیم کی اصل بنیاد تھی نبی اکرمﷺ پر ایمان' ان کی تصدیق۔ گویا جس نے آپﷺ کو نبی اور رسول مانا وہ مطیع ہے۔ اس کے لیے کسی اضافی بیعت کی فی الاصل ضرورت نہیں تھی۔ میرے نزدیک سیرت النبیﷺ میں بیعتوں کا جو نظام ہمیں نظر آتا ہے وہ دراصل بعد والوں کی راہنمائی کے لیے ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا قول نہایت اہم ہے' اسے یاد رکھنا چاہیے۔ غزوۂ بدر سے قبل ہونے والی مجلسِ مشاورت میں انہوں نے عرض کیا تھا: اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ...... حضورﷺ! آپ متردّد کیوں ہیں؟ آپ شاید اِس خیال کی وجہ سے متردّد ہیں کہ ہم نے بیعت عقبۂ ثانیہ میں صرف یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر مدینے پر حملہ ہوگا تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے! لیکن ہمارے سامنے تو یہ حقیقت موجود ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں' ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے' ہم نے آپؐ کو نبی مانا ہے' رسول مانا ہے۔ اب ہمارے لیے استثناء کہاں ہے؟ آپؐ جو حکم دیں گے ہم بسر وچشم اس کی تعمیل کریں گے۔ آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے' آپ حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو لاغر کر دیں گے' لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے۔ آپ حکم دیجیے ہم حاضر ہیں! یہ ہے وہ اصل بات۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ تنظیم کی یہ بنیاد اَب کبھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اب ہمارے پاس اس کے لیے صرف ایک ہی مسنون و ماثور راستہ ہے' ایک ہی اساس اور بنیاد ہے اور وہ بیعت ہے۔ اس پر ہمارے دروس تفصیلاً ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے تربیت اور تزکیہ کا۔ اس میں بھی اگر ہم نے بعینہٖ وہی رُخ اختیار نہ کیا جو محمدٌ رسول اللہﷺ کا ہمیں نظر آتا ہے تو اس تربیت اور تزکیہ

سے وہ اوصافِ مطلوبہ کبھی پیدا نہیں ہوں گے جو اقامت دین کی جدوجہد کے لیے ضروری ہیں۔ طریقِ نبویؐ سے ہٹ کر اگر تزکیہ اور تربیت کا عمل اختیار کیا جائے تو اِس میں ہو سکتا ہے کہ کچھ روحانی ترقع پیدا ہو جائے' کچھ کشف و کرامت کا زیادہ عمل دخل ہمیں نظر آنے لگے' لیکن وہ صورت ہرگز پیدا نہیں ہوگی جو ایک انقلابی جدوجہد کے لیے ناگزیر ہے۔ کشف و کرامت کی بھی نفی قطعاً نہیں ہے' لیکن دراصل جو طریقِ تربیت و تزکیہ محمدٌ رسول اللہﷺ نے اختیار فرمایا ہمیں حتی الامکان اسے اختیار کرنا ہے۔ البتہ کس حد تک ہم اس طریق کار کے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے' یہ بات دوسری ہے' اس کا تعلق کمیت سے ہے' یہ quantitative element ہے۔ لیکن اپنی امکانی حد تک معروضی مطالعہ کر کے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس تربیتی نظام کے کیا اجزائے ترکیبی تھے جو محمدٌ رسول اللہﷺ سے ثابت ہیں اور ہمیں اپنی امکانی حد تک اس کی پیروی کرنی ہے۔

چوتھا مرحلہ صبرِ محض (passive resistance) کا ہے۔ یہ زبانی ایذاء کے مقابلے میں بھی ہوگا' جیسے حضورﷺ سے فرمایا گیا: ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (طٰہٰ:۱۳۰) اور ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (الحجر) اور جسمانی ایذاء کے مقابلے میں بھی ہوگا' جس کا سورۃ العنکبوت میں ذکر آیا: ﴿فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۰)۔ یہ مرحلہ بھی جوں کا توں رہے گا' یعنی زبانی اور جسمانی ایذاؤں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہے اور جوابی کارروائی ہرگز نہیں کرنی۔ اب سوال ہے کہ یہ صبرِ محض (passive resistance) کا مرحلہ کب تک رہے گا! تو جان لیجیے کہ جب تک مکمل تجزیے کے بعد یہ رائے قائم نہ ہو جائے کہ اب ہمارے پاس اتنی قوت موجود ہے اور وہ مناسب تربیت پا چکی ہے کہ اب وہ اقدام کرے' چیلنج کرے اور اس قائم نظام کی دکھتی رگ کو کہیں سے چھیڑے' اُس وقت تک یہ صبرِ محض جاری رہے گا۔

اب آگے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اقدام کی صورت کیا ہوگی؟ تو پہلے یہ جان لیجیے کہ اب اُس دَور میں اور اِس دَور میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب ہمارے

سامنے دو عوامل کارفرما رہیں گے۔ ایک عامل یہ کہ وہاں حضور ﷺ بذاتِ خود موجود تھے۔ آپؐ کا اپنا ایک مقام اور مرتبہ ہے۔ پھر یہ کہ وہاں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کافر تھے۔ جو آپؐ پر ایمان لایا وہ مسلمان، جو ایمان نہیں لایا، وہ چاہے اپنی جگہ پر کتنا ہی نیک اور شریف آدمی ہو اور چاہے وہ موحّد کامل ہی کیوں نہ ہو، وہ کافر۔ لہٰذا وہاں بالکل دوٹوک اسلام اور کفر کی جنگ تھی۔ یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ یہاں بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ ہے۔ درس کے عنوان میں اسی کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں سب مسلمان ہیں، شرعاً مسلمان، فقہی طور پر مسلمان۔ اور مسلمان کے کچھ حقوق ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ایک بنیادی فرق واقع ہوا جس کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ بعض لوگ اپنے جوشِ تبلیغ اور جذبے میں اس کو نظر انداز کر دینے کی طرف چلے گئے۔ اُن میں پھر سختی اور انتہا پسندی آئی ہے، اور یہ انتہا پسندی بہت خطرناک ہے۔ مسلمان بہرحال مسلمان ہے، خواہ کوئی فاسق ہے یا فاجر ہے، کوئی اوہام میں مبتلا ہو گیا ہے، کوئی شرکِ خفی میں مبتلا ہے، بلکہ اگر کوئی شرکِ جلی بھی کر رہا ہے لیکن اس کی کوئی تاویل کر رہا ہے، تو ان معاملات کا سارا تعلق افتاء اور قضاء سے ہے۔ ہم اپنے جوش میں آ کر انہیں 'مشرک' کافر یا اس طرح کا کوئی اور لقب نہیں دے سکتے۔ مسلمان بہرحال مسلمان ہے، لہٰذا یہاں اب منطقی طور پر کچھ فرق لازمی ہو گا۔

میں اس کا ہرگز قائل نہیں ہوں کہ اقامت دین صرف جمالِ روحانی یا جمالِ عقلی سے ممکن ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اقامت دین یا بالفاظِ دیگر غلبۂ دینِ حق کے لیے آخری مرحلہ آئے گا جس میں لازماً سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے گی۔ اِس لیے کہ اس کا تعلق اصل میں ایک جمے ہوئے مضبوط نظام کو جڑ سے اکھیڑنے سے ہے، جس میں مختلف طبقات ہوتے ہیں، جنہیں خصوصی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور خصوصی مفادات حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جس سے وہ غنڈوں کو خرید سکتے ہیں۔ وہ اس سرمائے سے علمائے سوء کو خرید سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کی جنگ بڑی پیچیدہ جنگ ہے اور اس میں جان کی بازی لگانے کا مرحلہ تو لازماً آ کر رہے گا۔ مسلمان کے خلاف ہتھیار

اٹھانا اگرچہ مطلقاً خارج از بحث نہیں ہے، خصوصاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر دین کے غلبے کے لیے اس کی ضرورت پیش آئے اور اس کی شرائط پوری ہو گئی ہوں تو اس کی بھی اجازت ہے، لیکن وہ شرائط بڑی کڑی اور بہت سخت ہیں۔ وہ معاملہ بہرحال نہیں ہے جو کافروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس دَور میں حکومتوں کے پاس وسائل، ذرائع اور قوت بے پناہ ہے اور شہری پہلے کے مقابلے میں بالکل نہتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مسلمان حکومتوں کے خلاف جنگ اگرچہ ناممکن تو نہیں ہے، گوریلا جنگ ہو سکتی ہے، لیکن عملاً یہ بہت ہی مشکل ہے۔

اب ان دو حالتوں میں اقدام کے لیے ہمیں غور و فکر کر کے کوئی اور عنوان، کوئی اور راستہ اور طریقہ تلاش کرنا ہو گا۔ انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجے میں روشن خیالی (illumination) کی منازل طے کرتے ہوئے ہم جہاں پہنچے ہیں وہ ہے اصل میں اس درس کا موضوع اور اس کا عنوان۔ اب یہ راستہ اور طریقہ بھی ہمیں کہیں باہر سے نہیں تلاش کرنا۔ یہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآن اور سنت رسولؐ میں موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسلام کے آخری اور کامل دین ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اور یہ ہے درحقیقت فریضہ ''نہی عن المنکر'' جسے قرآن و حدیث میں بہت نمایاں کیا گیا ہے۔ حدیث میں نہی عن المنکر کے تین مراتب آئے ہیں۔ ان میں سب سے اونچا مرتبہ نہی عن المنکر بالید ہے۔

نوٹ کیجیے کہ زمانے نے جہاں مسلح اقدام کو بہت ہی مشکل بنا دیا ہے وہاں زمانے نے ایک متبادل طریقہ بھی پیدا کیا ہے۔ اس معاملے میں درحقیقت اس سیاسی ارتقاء (political evolution) کو سمجھنا ہو گا جو اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ انسان کے سیاسی شعور کے ارتقاء اور سیاسی اداروں کے ارتقاء سے آج یہ بات واضح ہوئی ہے کہ حکومت اور شے ہے، ریاست اور شے ہے۔ یہ بات آج سے دوسو برس پہلے بھی دنیا کو معلوم نہیں تھی۔ یہ بھی ایک انکشاف ہے اور ایک طرح کی ایجاد ہے۔ جیسے موٹر، ریل، ہوائی جہاز جیسی مادی ایجادات ہیں ویسے ہی یہ عمرانی ایجادات

ہیں۔ مادی ایجادات کا تو ہم بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں' جبکہ بدقسمتی سے اس عمرانی ایجاد کا فہم وشعور' خاص طور پر ہمارے رجالِ دین کے طبقے میں' موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا' یہ ان کا موضوع نہیں ہے کہ جدید پولیٹیکل سائنس کیا ہے اور جدید تصورِ ریاست کیا شے ہے۔ آج کے دَور میں حکومت تو پہلے کے مقابلے میں ایک تہائی رہ گئی ہے' اصل شے اب ریاست ہے۔ شہری کی وفاداری ریاست سے ہوتی ہے' حکومت سے نہیں ہوتی۔ حکومت تو ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) میں سے ایک ہے۔ یعنی مقنّنہ (Legislature)' عدلیہ (Judiciary) اور انتظامیہ (Executive) میں سے حکومت کے پاس صرف انتظامیہ کا کردار ہے' یعنی یہ صرف تنفیذی اور انتظامی قوت ہے' جبکہ قانون سازی کا ادارہ اور ہے' عدلیہ کا ادارہ اور ہے۔ مزید یہ کہ ہر شہری کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی تشکیل میں رائے دے اور ناپسندیدہ حکومت کو بدل دے۔ جماعت سازی بھی اس کا حق مانا گیا ہے' اس لیے کہ اگر وہ جماعت نہیں بنائے گا تو قوت کیسے وجود میں آئے گی؟ اور اجتماعی قوت کے بغیر وہ حکومت کو کیسے بدلے گا اور وسائل و ذرائع کو کیسے مجتمع کرے گا کہ اپنے فکر کو لوگوں کے سامنے لا سکے؟ حکومت کی تبدیلی کا ایک جمہوری طریق کار ہے اور ایک انقلابی طریق کار۔ لیکن جماعت سازی اور اظہارِ رائے بہرحال شہری کے وہ حقوق ہیں جن پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ جو ادارے (institutions) وجود میں آئے ہیں انہوں نے ان راستوں کو اَب کھول دیا اور آسان کر دیا ہے۔ گویا تمدنی ارتقاء نے ایک دروازہ بند کیا ہے تو دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ آدمی کو اگر اِن چیزوں کا شعور نہ ہو تو بھی وہ ششں و پنج میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں کیا کرے اور کیسے کرے؟ تو ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ درحقیقت اس سیاق وسباق میں نہی عن المنکر کی جو اہمیت قرآن وحدیث سے ہمارے سامنے آتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس منتخب نصاب (۲) میں اس درس کو شامل کیا گیا ہے۔

☆☆☆

اس درس میں سورۂ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) شامل کی گئی ہیں' جن میں سے اس درس کی ترکیب کے اعتبار سے صرف آخری اور مختصر آیت (۱۰۴) متعلق ہے:

﴿وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝۱۰۴﴾

اسی طرح سورۃ التوبۃ کی دو آیات میں سے آیت ۱۱۲ اِس موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں اہل ایمان کے نو اوصاف بیان ہوئے ہیں' جن میں سے آخری تین اوصاف کا تعلق اصل میں اس موضوع سے ہے: ﴿الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاهُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ ؕ﴾ اس سے ماقبل آیت ۱۱۱ کا مطالعہ ہم گزشتہ درس میں کر چکے ہیں کہ اس آیت سے درحقیقت بیع اور پھر بیع سے بیعت کا تصور اجاگر ہوا ہے۔ ان دونوں آیتوں کا باہمی ربط یہ ہے کہ آیت ۱۱۲ میں اہل ایمان کے جو اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں ان میں سے یہ جو آخری تین اوصاف ہیں ان کے لیے قوت درکار ہے۔ اور اس قوت کے لیے وہ لوگ درکار ہیں جو اللہ سے وہ بیع وشراء کر چکے ہوں جو آیت ماقبل میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے خرید لی ہیں ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض"۔ اس لیے یہاں پر اس آیت کو بھی شامل کیا گیا۔

اُمّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

جہاں تک سورۂ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کا تعلق ہے' یہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ مقام بھی قرآن مجید کے جامع ترین مقامات میں سے ہے اور ان میں اُمتِ مسلمہ کے لیے تین نکات پر مشتمل ایک مکمل لائحہ عمل دے دیا گیا ہے۔ یہ درس اصلاً تو ہمارے منتخب نصاب کے حصہ اوّل (جامع اسباق) میں شامل ہونا چاہیے اور سورۃ العصر' آیۃ البر' سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع' سورۂ حم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کے ساتھ آنا چاہیے کہ یہ بالکل اسی معیار اور اسی سطح کا اور اتنی ہی جامعیت کا حامل مقام ہے۔

اس کی پہلی آیت ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ میں جو چیز ایک فرد سے مطلوب ہے اس کو انتہائی جامعیت' انتہائی اختصار اور انتہائی تاکید سے بیان کر دیا گیا ہے اس آیت میں ۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب ہے۔ تو گویا سورۃ العصر کا ''اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' خود بخود اِس میں آ گیا۔ اور ''وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کے لیے اس آیت میں جامع ترین' مؤکد ترین' خوبصورت ترین اور مختصر ترین تعبیر ہے کہ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کا حق ہے''۔ میرے نزدیک یہ آخری تاکیدی اسلوب ہوسکتا ہے اور یہ ناممکن الحصول ہے۔ اس مقام تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اصول بہرحال یہی ہے۔ یعنی آئیڈیل اونچا ہونا چاہیے' نگاہ بلند ہونی چاہیے۔ اب جہاں تک کوئی رسائی حاصل کر سکے یہ اس کی ہمت ہے' البتہ اصول واضح رہنا چاہیے۔ یہ حکم سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے تھے کہ حضور (ﷺ)! کس کے لیے ممکن ہے اللہ کا حقِ تقویٰ ادا کرنا! پھر جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تم استطاعت رکھتے ہو''۔ تو اُن کی جان میں جان آئی۔ حالانکہ سورۃ البقرۃ کے اندر بھی یہ مضمون موجود ہے: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (آیت ۲۸۶) لیکن اس کو مزید واضح کرنا اطمینان کے لیے ضروری تھا۔

اس آیت میں دوسرا حکم ہے: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اور (دیکھو اہل ایمان!) ہرگز مت مرنا' مگر حالت اسلام میں''۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں اسلام کے جب اصطلاحی معنی مراد لے لیے جاتے ہیں تو اس آیت کی ساری جان نکل جاتی ہے۔ جان لیجیے یہاں اصطلاحی اور فقہی معانی مراد نہیں ہیں۔ یہاں ''مسلم'' کے اصل لغوی معنی مراد ہیں کہ ''تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالت فرماں برداری میں''۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ کے انتہائی گاڑھے حکم کے ساتھ یہاں پر ''اسلام'' کا فقہی مفہوم ہرگز مراد نہیں ہوسکتا۔ یہ اس حکم سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں توازن نہیں ہوتا وہ اس طرح بھٹکتے ہیں۔

اب اس بحث کو چھوڑ دیجیے کہ گناہِ کبیرہ سے بھی کوئی شخص کافر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ یہ قانونی بحث ہے۔ اس دنیا میں آپ کسی کے اوپر کوئی فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ یہاں وہ حدیث نبویؐ ذہن میں رکھئے: ((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))(۱) ''کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' اور کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی (شراب پینے والا) حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا''۔ حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہی مفہوم مراد ہے کہ ''ہرگز مت مرنا مگر حالت فرماں برداری میں''۔ جب آدمی گناہ کر رہا ہے تو اُس وقت وہ فرماں بردار کہاں ہے! وہ تو فرمان کو توڑ رہا ہے۔ اس حالت میں موت بڑی عبرت ناک اور حسرت ناک موت ہے۔ بالفرض ایک شخص کی عین عمل زنا کے دوران جان سلب کر لی جائے تو تصور کیجیے یہ کتنی عبرت ناک موت ہوگی! لیکن اب یہ بھی جان لیجیے کہ یہ عملِ زنا تو ہمیں طبعاً بہت ہی بُرا لگتا ہے' اس لیے کہ اسے برا سمجھنا ہماری روایت کا ایک جزو بن گیا ہے' یہ ہمارے اجتماعی شعور (collective consciousness) کا ایک جزوِ لاینفک ہو گیا ہے' جبکہ اس سے سو گنا برا عمل سود ہے۔ اب سود کھاتے ہوئے مرنا' اس تصور پر ہمیں جھرجھری نہیں آتی اور ناگواری محسوس نہیں ہوتی' حالانکہ یہ زنا سے سو گنا زیادہ برا عمل ہے' بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ایک حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا' اَیْسَرُھَا اَنْ یَنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ))(۲) ''سود کے ستر حصے ہیں' ان میں سے سب سے ہلکا یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے''۔ اس حدیث کی روشنی میں عملِ زنا اور عملِ سود میں کیا نسبت قائم ہوسکتی ہے! ہزار گنا بھی کہا جائے تو کم ہے۔ اب یہاں جو لفظ آیا ہے: ''وَلَا تَمُوْتُنَّ'' ''دیکھنا تمہیں موت نہ آئے'' اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ حکم گویا اس حکم کے ہم پلہ ہوگیا ہے کہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ۔ اب

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب اثم الزناۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی و نفیه عن المتلبس۔ (الفاظ صحیح مسلم کے ہیں)

(۲) سنن ابن ماجه' کتاب التجارات' باب التغلیظ فی الربا۔

ایک ایک لمحہ جاگ کر اور چوکس اور چوکنے رہ کر بسر کرنا ہے کہ کہیں کوئی لمحہ حالتِ معصیت میں نہ گزرے۔ کیا کوئی ضمانت ہے کسی کے پاس کہ اسی لمحے اس کی موت نہیں آ سکتی؟

اب اس سے آگے آیئے! افراد کو جمع کر کے ان کی شیرازہ بندی سے ایک قوت وجود میں آتی ہے۔ دیکھئے مسلمانوں کی یہ شیرازہ بندی کس بنیاد پر ہے؟ ان کو جوڑنے والی شے کون سی ہے؟ یہ چیز ''حبل اللہ'' ہے' یعنی قرآن مجید۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ''سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو''۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ''۔ بڑا خوبصورت ربط ہے ان دونوں کے مابین۔ عَصَمَ' يَعْصِمُ کے معنی ہیں ''کسی کو بچانا''۔ جیسے حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدۃ: ۶۷) ''(اے نبی!) اللہ آپ کو بچائے گا (آپ کی حفاظت فرمائے گا) لوگوں سے''۔ بابِ اِفتعال سے مصدر بنتا ہے اِعتِصام۔ اس کا مطلب ہے ''خود بچنا' اپنا تحفظ حاصل کرنا''۔ اس کے ساتھ حرف ''ب'' کا صلہ لگنے سے یہ متعدی ہو جاتا ہے کہ اس بچاؤ کا ذریعہ کیا چیز بنے گی؟ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''چمٹ جاؤ اللہ سے'' یعنی اللہ کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ! اب ان الفاظ میں جو ایک اجمال ہے اس کی وضاحت ہے بایں الفاظ: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ کہ اپنے تحفظ کے لیے اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ!

اس حوالے سے مَیں بے شمار مقامات پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں کہ حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے کیا مراد ہے! الفاظ عام ہیں۔ ان سے توحید' دین' شریعت' کلمۂ شہادت وغیرہ سبھی چیزیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب ہمارے پاس مرفوع تفسیر موجود ہو تو کسی اور طرف جانا درست نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے حبل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قرآن ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ ' اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ......))[1] ''آگاہ رہو کہ میں تمہارے

(۱) صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب من فضل علی بن ابی طالب۔

درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے' یہ اللہ کی رسی ہے''۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ))[1] ''یہی (قرآن مجید) اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ نیز فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ))[2] ''اللہ کی کتاب آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسّی ہے''۔ تو اب یہ قرآن ہی اصل شے ہے۔ اب چمٹو قرآن کے ساتھ! اعتصام بالقرآن ہونا چاہیے۔ اعتصام بالقرآن کے دونوں پہلو اِس میں موجود ہیں جو تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ یعنی تزکیہ بھی ہوگا تو اسی قرآن سے' دعوت بھی دی جائے گی تو اسی قرآن سے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) ''اے لوگو! تمہارے پاس آ چکی ہے نصیحت تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفاء ہے دل کی بیماریوں کی اور اہلِ ایمان کے لیے راہنمائی اور رحمت ہے''۔ اس سے بڑا معجزہ کوئی نہیں ہے۔ انسان کے نفس کے اندر جو روگ ہوتے ہیں' جیسے حبّ جاہ' حبّ دنیا' حبّ مال' ان کے ازالے اور ان کے معالجے کے لیے اس سے بڑی دوا کوئی نہیں۔ پھر یہ کہ دعوت اور تذکیر کا ذریعہ بھی یہ قرآن ہے۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (قٓ) ''(اے نبیؐ!) اس قرآن کے ذریعے یاددہانی کرایئے اس کو جو میری تنبیہہ سے ڈرتا ہو''۔ یعنی انذار بھی اسی قرآن کے ذریعے اور تبشیر بھی اسی قرآن کے ذریعے۔ تو یہ اعتصام دونوں اعتبارات سے ہے۔

''جَمِيْعًا'' کے لفظ کے لیے یہاں دونوں امکانات موجود ہیں۔ ''جَمِيْعًا'' قرآن کا حال بھی ہوسکتا ہے اور مخاطبین کا بھی۔ یعنی یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورے قرآن کو تھامو! ایسا نہ ہو کہ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔
(۲) سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب مناقب اهل بیت النبی ﷺ۔

بلکہ پورے کے پورے قرآن کو اختیار کرو۔ اہل کتاب کو اُن کی اسی روش پر سرزنش کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾ (البقرۃ:۸۵) ''کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟'' تو اے مسلمانو! تمہاری یہ روش نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے عام طور پر ''جَمِيْعًا'' سے دوسرا مفہوم مراد لیا گیا ہے کہ ''سب مل جل کر اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لو''۔ اس سے اب ایک جمعیت وجود میں آ گئی۔ یہ مقام مُحْتَمِلِ الْمَعْنَيَيْن ہے' یعنی اس میں دونوں معانی کا احتمال ہے' اور دونوں اپنی جگہ مقصود بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ یہی ہے اعجازِ کلام اور یہی ہے فصاحت اور بلاغت کا نقطۂ عروج۔ تو اب ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ میں دونوں باتیں آ گئیں' لیکن اس کے بعد والے الفاظ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے ساتھ یہ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ ''لَا تَفَرَّقُوْا'' باب تفعّل سے جمع مخاطب کے لیے صیغۂ نہی ہے اور اس میں عام طور پر ایک ''ت'' گر جاتی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں یہ لفظ آ چکا ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ ''کہ دین کو قائم کرو اور دین کے باب میں متفرق نہ ہو جانا''۔ تو یہاں بھی اصل میں لفظ وہی ہے' لیکن قواعدِ صرف کی رو سے باب تفعّل میں کبھی ایک ''ت'' گرا دی جاتی ہے۔ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ آپس میں متفرق مت ہونا' بٹ نہ جانا' ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔

اب اس کے بعد ایک خالص تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ان الفاظ میں:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ﴾

''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو جبکہ تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے' تو اس نے تمہارے دلوں کے مابین محبت ڈال دی تو تم اس کی اس نعمت کے سبب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے''۔

یہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ذرا اپنے ماضی کو یاد کرو کہ تم آپس میں کتنے بٹے ہوئے تھے' کتنے منقسم تھے! جان لیجیے

پورے عرب میں کوئی نظام نہیں تھا۔ حالی نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا!

چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبی لمبی جنگیں چلتی تھیں۔ خاص طور پر قبیلہ اَوس اور قبیلہ خزرج کے مابین کب سے جنگ چلی آ رہی تھی! جیسے ہمارے ہاں قتل اور خون ریزی کے قبائلی اور خاندانی واقعات نسل در نسل چلتے ہیں' تو وہاں بھی کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم تباہی کے آخری کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳﴾ ''اور (یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو) جبکہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو''۔ اب اس میں آپ تفصیل' تبیین' وعظ اور نصیحت کا جتنا چاہیں رنگ بھر لیں' لیکن اس وقت میں اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

نوٹ کیجیے کہ اب یہاں سے دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔ اس مرحلے میں میرے نزدیک اصل شے جمعیت ہے کہ سب مل جل کر اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اس میں تبعاً وہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اصل میں دعوت اور تزکیہ کا ذریعہ حبل اللہ یعنی قرآن ہے۔ اقبال کی جو عزت میری نگاہ میں ہے اس کا ایک بہت اہم سبب یہ ہے کہ ان مفاہیم کو جس خوبصورتی سے اس نے ادا کیا اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں۔

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

”وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسد ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' اور ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ دراصل قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اسے مضبوطی سے تھام لو کہ یہی اللہ کی رسی ہے!“

اب تیسری بات آ رہی ہے' جو ہمارے اس درس سے متعلق ہے۔ فرمایا: ﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ﴾ ”تم میں سے ایک ”اُمت“ ہونی چاہیے“۔ یہاں ”اُمَّۃٌ“ کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اَمَّ ، یَؤُمُّ کے معنی ہیں قصد کرنا۔ جیسے سورۃ المائدۃ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ﴾ ”وہ جو بیت حرام کا قصد کر کے چل رہے ہیں“۔ اسی طرح ”اُمت“ افراد کا وہ مجموعہ ہے جنہیں ایک مقصد باندھ لیتا ہے۔ اُمت کسی نسل' زبان یا علاقے کی بنیاد پر نہیں بنتی۔ البتہ ”قوم“ کے لیے یہ چیزیں بنیاد بن سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کی نفی نہیں کی گئی ہے' لیکن ”قوم“ کا لفظ قرآن میں ”اُمت“ کے معنی میں نہیں آیا۔ ”قوم“ کا لفظ کسی قبیلے یا کسی علاقے کے رہنے والوں کے لیے مستعمل ہے۔ مولانا مودودی نے اس اعتبار سے صحیح کہا تھا کہ ”مسلمان قوم نہیں ہیں“۔ اصل میں دو باتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ہندو کے مقابلے میں تو مسلمان ایک قوم ہیں۔ جب ایک مشترک وطنی قومیت کا تصور پیش کیا گیا تو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ نہیں' ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں ہیں' دو الگ الگ قومیں ہیں' یہ بات درست تھی۔ اس لیے کہ بات کہنے کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات بلند تر ہے کہ ”مسلمان ایک قوم نہیں ہیں“۔ اس لیے کہ وہ تو ایک جماعت ہیں' ایک اُمت ہیں' حزبُ اللہ ہیں۔ البتہ ہمارے زوال اور اضمحلال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم جماعت' حزب اور اُمت نہیں رہے' بلکہ ایک قوم بن گئے۔ یہ ہے اصل میں اس پوری بحث کا لُبِّ لباب۔ چنانچہ مولانا مودودی کی بات صد فی صد صحیح تھی' اگرچہ de facto صورت میں اُس وقت جو خطرات تھے ان کے پیش نظر ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کا شعور دلانا بھی ضروری تھا۔ بہرحال مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے

لیے پورے قرآن میں کہیں لفظ ”قوم“ نہیں آیا۔ قرآن میں یہ لفظ سابقہ انبیاء و رُسل کی دعوت کے ضمن میں آیا ہے کہ: یٰقَوۡمِ ' یٰقَوۡمِ۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ وہ اپنی قوموں ہی کی طرف مبعوث ہوئے تھے' اور وہ بین الاقوامیت اور آفاقیت حضور ﷺ سے پہلے کسی رسول کی دعوت میں نہیں تھی۔ طبعی طور پر (physically) ابھی یہ ممکن بھی نہیں تھا' کیونکہ ابھی وسائل و ذرائع اتنے نہیں تھے لہٰذا اُن کا دائرۂ دعوت اپنی اپنی قوم تک محدود تھا۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا﴾ اور ﴿وَاِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا﴾ (ھود) چنانچہ ان کی دعوت میں یٰقَوۡمِ کا لفظ مستعمل ہے۔ جبکہ قرآن میں خطاب ”یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ“ اور ”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا“ سے ہوتا ہے۔ لفظ ”اُمت“ کا مطلب' جیسا کہ میں نے عرض کیا' ہم مقصد' ہم ارادہ اور ہم سفر ساتھیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ ”حزب“ ہے جو اِس منتخب نصاب نمبر۲ میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک حزب الشیطان ہے اور دوسرا حزب اللہ۔

اب یہاں لفظ ”مِنۡ“ پر غور کریں۔ ”مِنۡ“ کے یہاں دو اِمکانات ہیں' ایک ”مِنۡ بیانیہ“ اور دوسرا ”مِنۡ تبعیضیہ“۔ یہاں اگر مِن تبعیضیہ مراد لیں گے تو ”بعض“ اور ”جزو“ کے معنی پیدا ہو جائیں گے اور عام طور پر زیادہ تر یہی مفہوم سمجھا گیا ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بڑی زوردار تحریر لکھی تھی کہ یہاں مِن تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ مِن بیانیہ ہے۔ دیکھئے تبعیضیہ ماننے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سب کے کرنے کا کام لازمی نہیں رہتا' بلکہ یہ ایک فرضِ کفایہ بن جاتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ہونے چاہئیں' کچھ لوگ رہنے چاہئیں جو یہ کام کریں۔ اصل میں اس مفہوم کی نفی کے لیے انہوں نے اس کو مِن تبعیضیہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کو زوردار دعوت دینا چاہتے تھے کہ یہ ایمان کا عین تقاضا ہے' جبکہ مِن تبعیضیہ ماننے سے یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے کہ کچھ لوگ تم میں سے یہ کام کر دیں تو یہ فرض ادا ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسے مِن بیانیہ کہا ہے اور ﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ﴾ کا مفہوم یہ لیا ہے کہ ”تم سے ایک ایسی اُمت وجود میں آنی چاہیے“۔ ”تم میں سے“ نہیں

"تم سے"۔ یہ مِن بیانیہ کا مفہوم ہے۔ جیسے میں بیان کر چکا ہوں' سورۃ الفتح کی آخری آیت میں بھی یہ بحث موجود ہے۔ فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ "اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے' مغفرت کا اور بہت بڑے اجر کا"۔ میں واضح کر چکا ہوں کہ اس آیت میں مِن تبعیضیہ نہیں' بیانیہ ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت سے اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ اگر تبعیضیہ مانیں گے تو مِنْكُمْ سے تبعیض ہو جائے گی اور ذہن کو شیعیت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ایک بہانہ بن جائے گا۔ وہی معاملہ یہاں ہے' لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مِن تبعیضیہ ہو۔

اب اس کا حل کیا ہو گا؟ اس کا جواب اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۱۰ میں بایں الفاظ آ گیا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ "تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے"۔ اب اگر کوئی مغالطہ ہو سکتا تھا تو وہ نکل گیا۔ پوری اُمت سے کہا گیا ہے کہ "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے دنیا والوں کے لیے نکالا گیا ہے"۔ مزید فرمایا: ﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ "تم (لوگوں کو) نیکی کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔ لہٰذا اگر یہاں (آیت ۱۰۴ میں) "مِن تبعیضیہ" مان کر کسی کمی کا پہلو آ جاتا ہے تو اس سے اس کی تلافی ہو گئی' اس تصور کا راستہ بند ہو گیا۔ اور اگر "مِن بیانیہ" ہو تو یہ دونوں آیتیں (آیت ۱۰۴ و ۱۱۰) بالکل ہم معنی ہو جائیں گی۔ جیسے کہا جاتا ہے: لِلْاَمِيْرِ مِنْ اَوْلَادِهٖ جُنْدٌ کہ امیر کی تو اولاد ہی سے ایک لشکر وجود میں آ گیا ہے' اسے کسی اور لشکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر اللہ نے اسے سو بیٹے دے دیے ہوں تو لشکر تو بن گیا۔ پچھلے زمانے میں تو ایک شخص کے سو بیٹے ہو سکتے تھے۔ تو یہاں پر "مِن تبعیضیہ" نہیں ہے' بلکہ "مِن بیانیہ" ہے۔ اسی کو مولانا ابوالکلام آزاد دلیل کے طور پر لائے ہیں کہ لِلْاَمِيْرِ مِنْ اَوْلَادِهٖ جُنْدٌ۔ درحقیقت پوری اُمت کے سامنے ایک مقصد اور ایک ہدف رکھا جا رہا ہے کہ تم سے اب ایک اُمت وجود میں آنی چاہیے۔ تمہیں جو آپس میں اینٹوں کے مانند

جوڑ کر ایک دیوار بنائی جا رہی ہے تو اسی مقصد کے لیے۔ پہلے ایک فرد کا معاملہ تھا۔ فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ پھر ان افراد کی شیرازہ بندی کے لیے حبل اللہ دے دی گئی۔ اب شیرازہ بندی خود مطلوب و مقصود تو نہیں ہے' جماعت خود کوئی مطلوب و مقصود شے نہیں ہوا کرتی' جماعت تو کسی ہدف اور کسی مقصد کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اب وہ مقصد کیا ہے؟ یہ مقصد ہے جو اس سلسلے کی تیسری آیت (آیت ۱۰۴) میں بیان ہوا ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ......﴾ "تم سے- یا بالفاظ دیگر تم میں سے- وجود میں آنی چاہیے ایک اُمت جو (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائے ......!"

اس میں ایک تطبیق اور بھی ہے۔ ایک لحاظ سے تو اس پوری اُمت کو یہ کام کرنا ہے۔ یہ تو ہمیں دَورِ صحابہؓ میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس دورِ زوال میں کیا ہو گا؟ اب پوری اُمت تو اس کام پر قائم نہیں۔ عملی طور پر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک دم پوری اُمت کو اس کام پر آمادہ کر دیا جائے' جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں "مِنْكُمْ" میں "مِن تبعیضیہ" نکھر کر سامنے آ رہا ہے کہ "تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا ہی چاہیے"۔ اب یہ گروہ جاگے' منظم ہو' دوسروں کو جگائے۔ یہ پراسیس تو اسی طرح شروع ہو گا۔ یوں سمجھئے کہ پہلے وہ نیوکلیئس وجود میں آئے گا تو اس کے گرد مختلف الیکٹرانز آئیں گے اور وہ ایٹم بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر نیوکلیئس ہی نہ ہو تو ایٹم کہاں سے وجود میں آئے گا؟ لہٰذا وہاں مِن تبعیضیہ کا ایک بہت خوبصورت مفہوم سامنے آتا ہے۔ یعنی "تم میں سے ایک اُمت تو رہنی ہی چاہیے"۔ ایسا تو نہ ہو کہ اس کام کے لیے کوئی نہ رہے۔ اس کے ساتھ اس حدیث کو جوڑ لیجیے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ)) (۱) "میری اُمت میں ایک گروہ تو ہمیشہ رہے گا جو حق پر قائم ہو گا"۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک طرح کی حضور ﷺ نے ضمانت دی ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق ......

اسلامی جماعت کے کرنے کا اصل کام

اب وہ گروہ کیا کام کرے! فرمایا: ﴿یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ﴾ ''وہ دعوت دیں خیر کی طرف''۔ یہ بہت جامع لفظ ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ ''اور وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں''۔ ''دعوت الی الخیر'' اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ایک وحدت ہے' یہ ایک باقاعدہ قرآنی اصطلاح ہے۔ قرآن مجید میں نو مقامات پر یہ بالکل اسی طرح جڑ کر آیا ہے۔ حضور ﷺ کے لیے سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا: ﴿یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (آیت ۱۵۷) ''وہ انہیں معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے''۔ اہل کتاب میں سے جو اچھے لوگ تھے ان کی مدح ہوئی ہے ان الفاظ میں: ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۴) ''اور وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں''۔ اہل ایمان کے لیے سورۂ آل عمران میں دو مرتبہ یہ اسی طرح جڑ کر آ چکا ہے' ایک مرتبہ آیت ۱۰۴ میں' اور دوسری مرتبہ آیت ۱۱۰ میں بایں الفاظ: ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۲ میں بھی یہ جڑ کر آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ ''(وہ ہیں) نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے''۔

میں نے ایک مرتبہ ''نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت'' کے موضوع پر تقریر میں وہ نو مقامات گنوا دیے تھے جہاں یہ ایک وحدت کی شکل میں بالکل جڑ کر آیا ہے۔ (یہ خطاب ہماری کتاب ''اُمت مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل'' میں شامل ہے!) جیسے گاڑی کے دو پہیے باہم ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ویسے ہی یہ دو اجزائے لاینفک ہیں اور ایک ہی حقیقت کے اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں' ان کو جدا کر دینا قرآن پر اور اسلام پر بہت بڑا ظلم ہے اور دین کے بنیادی تصورات کی گویا شکست و

ریخت ہے۔ البتہ ان دونوں (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو بریکٹ کر کے ''دعوت الی الخیر'' کے ساتھ جمع کیجیے۔ اب یہاں حرفِ عطف ''وٗ'' ''دعوت الی الخیر'' اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے درمیان مغائرت کرے گا۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ یہ مغائرت کیا ہے! دیکھئے دعوت کی اصل روح سوز' ہمدردی' نصح و خیر خواہی اور اپیل کا انداز ہے۔ اس میں خوشامد ہے' جبکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں قوت کا اظہار ہے' اختیار ہے اور وعظ و نصیحت کا نہیں بلکہ تنفیذ کا انداز ہے۔ یہ چیزیں الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی ہیں۔ ایک تو اس کی روح کے اعتبار سے یہ دو چیزیں ایک دوسرے کی غیر بن گئیں۔

دوسرے یہ کہ 'خیر' کو معین کیجیے! اب یہاں بھی لفظ عام ہے۔ چنانچہ اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ ایمان سب سے بڑا خیر ہے' شریعت کُل کی کُل خیر ہے۔ اس بارے میں جو رائیں بھی ہیں مَیں انہیں غلط نہیں کہتا۔ کسی نے اسلام کو خیر کہا' کسی نے توحید کو خیر کہا' کسی نے شریعت کو خیر کہا' کسی نے کلمۂ شہادت کو خیر کہا۔ تو یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں' لیکن ہمیں حدیث نبویؐ سے معین کرنا ہو گا کہ خیر کا مصداقِ اوّل کیا ہے' جیسے حدیث نبویؐ سے حبل اللہ کا مصداقِ اوّل قرآن معین ہوا۔ خیر کا لفظ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر دو معنی میں آتا ہے۔ خیرِ دُنیوی مال و اسباب کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ﴾ (العٰدیٰت) ''اور یقیناً وہ (انسان) دُنیوی مال و اسباب کی محبت میں شدید ہے''۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۱۹ میں بھی منافقین کے بارے میں آیا ہے: ﴿اَشِحَّةً عَلَی الْخَیْرِ﴾ اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے یوں کیا ہے: ''وہ ڈھکے پڑتے ہیں مال پر''۔ یعنی جب لڑنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ کہیں چھپ جاتے ہیں اور جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو سب سے آگے وہی ہوتے ہیں' سایہ کیے ہوئے ہوتے ہیں مالِ غنیمت پر سب سے آگے کہ انہیں lion's share مل جائے۔ تو خیر کا ایک مفہوم تو یہ ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہاں سیاق و سباق کے اندر اس کے فٹ بیٹھنے کا سرے سے امکان نہیں ہے کہ مال و دولتِ دُنیوی کی طرف دعوت دو۔ اب دوسرا خیر کیا ہے؟ وہ خیر ''ہدایت''

ہے۔ یہ بھی جان لیجیے کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ دنیا میں نعمت صرف ایک ہی ہے اور وہ نعمتِ ہدایت ہے' کوئی اور شے نعمت نہیں ہے۔ جنہیں ہم عام طور پر نعمتیں کہتے ہیں وہ اگر نعمتِ ہدایت کے ساتھ ہوں تو نعمت ہیں' اس کے بغیر ہوں تو زحمت ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں اسی نعمت ہدایت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا''۔ یعنی نعمت ہدایت کا۔ اور ہدایت کیا ہے؟ الھدیٰ یہ قرآن ہے! آپ سوچیں گے کہ یہ تو ذرا لمبا اور ایچ پیچ استدلال ہے۔ اس کے لیے اب قرآن سے براہِ راست دلیل پیش کرتا ہوں۔ سورۃ یونس کی آیات ۵۷'۵۸ عظمت قرآن کے بیان میں بہت اہم ہیں۔ ان کے آخر میں فرمایا: ﴿ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''وہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اُس سب سے بڑھ کر خیر یہی (قرآن) ہے''۔ یعنی یہ خیر مطلق ہے' تمام چیزوں سے بڑھ کر خیر ہے' رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں فرمایا: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ یعنی رحمٰن کی رحمانیت کا مظہر اتم اور مظہر کامل یہی قرآن ہے۔ تو دعوت الی الخیر کا ہدفِ اوّلین دعوت اِلی القرآن ہے۔ ظاہر بات ہے خیر کا اس سے بڑا منبع' سرچشمہ اور خزانہ کوئی متصور نہیں ہوسکتا۔

تو یہ دونوں پہلو آپ کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ دعوت الی الخیر' اور اس میں بھی سوز' نصح وخیر خواہی کا جذبہ اور یہاں تک کہ خوشامد۔ لوگوں کے سامنے گڑگڑایئے کہ خدا کے لیے قرآن کی طرف لوٹ آؤ' اپنی غلط روش سے باز آ جاؤ۔ لیکن دوسرے پہلو (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) میں تحکّم بھی ہے اور قوت کا استعمال بھی ہے۔ یہ اس کی مزاجی نوعیت کا فرق ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے ایک بہت بڑا دھوکہ کھایا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ ان کے دھوکہ کھانے کا اصل سبب اس کے مزاج میں موجود یہی تحکّم ہے' اگرچہ ''امر'' کا لفظ عربی زبان میں عام ہے اور یہ صرف حکم کے لیے ہی نہیں بلکہ مشورے کے لیے بھی آتا ہے۔ ایک مصرع

ملاحظہ کیجیے: ع

اَطَعۡتِ لِاٰمِرِیۡکِ بِصَرۡمِ حَبۡلِیۡ

شاعر اپنی محبوبہ سے کہہ رہا ہے کہ ''بالآخر تم نے ان ہی لوگوں کا کہنا مان لیا نا جو تمہیں مجھ سے ترکِ تعلق کا مشورہ دے رہے تھے''۔ تو یہاں ''امر'' حکم کے معنی میں نہیں' بلکہ مشورے کے معنی میں ہے۔ چنانچہ امر کے درجے میں یہ ساری چیزیں آ جائیں گی' لیکن غالب استعمال کے اعتبار سے لفظ ''امر'' میں زیادہ رجحان حکم کا ہے۔ لہٰذا اس میں ایک طرح کا تحکّم بھی ہے' یعنی اس میں تنفیذ ہے' طاقت کا استعمال ہے۔ اور نہی عن المنکر کے ضمن میں تو حدیث نبویؐ نے بالکل ہی واضح کر دیا کہ ایک نہی عن المنکر بالقلب ہے' ایک نہی عن المنکر باللّسان ہے اور ایک نہی عن المنکر بالید ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال ہوگیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو صرف حکومت کے کرنے کا کام ہے۔

اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں کہ جب اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو اصلاً یہ اُس کا ہی منصب اور اسی کا فرض ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ﴾ (الحج:۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے''۔ ویسے تو درحقیقت حکومت کی پوری پالیسی میں یہ چیز شامل ہونی چاہیے' لیکن سعودی عرب میں الگ سے ''**ھیئۃ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر**'' کے نام سے ایک محکمہ بنایا گیا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں مَیں نے جدہ میں یہ نقشہ دیکھا تھا کہ نماز کا وقت آیا اور اس ہیئت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کوئی شخص محض لاٹھی بجاتا ہوا آیا' اسے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی' بلکہ صرف لاٹھی کی کھٹ کھٹ کی آواز پر لوگ دکانیں بند کر کے بھاگنے لگے۔ اگرچہ کچھ لوگ دکان کا شٹر نیچے گرا کر اندر گھس گئے اور انہوں نے

نماز نہیں پڑھی لیکن دکانیں بہرحال بند ہوگئیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ اُس ہیئت کے ملازم بے چارے آتے ہیں اور زور زور سے الصلوٰۃ، الصلوٰۃ پکارتے ہیں، لوگ سنتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں اور دکانوں کے شٹر نیچے نہیں گرتے۔ تو اس ہیئت کی مٹی اب پلید ہو چکی ہے، کیونکہ اوپر مزاج بدل چکا ہے۔ اب تو وہ اپنی تنخواہ لے رہے ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کی ڈیوٹی پوری ہوگئی۔ بہرحال میں عرض کروں گا کہ محض ایک محکمہ بنا لینے سے تو یہ کام ہوتا بھی نہیں۔ اس لیے کہ جب تک یہ چیز پوری حکومت کی مکمل پالیسی کا جزو نہ بنے محض محکمہ بنانے سے یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ چلیے محکمہ بھی بنایا ہو تو لوگوں کو معلوم ہو کہ اُن کے پاس کچھ اختیارات بھی ہیں۔ چوک میں کھڑے سپاہی سے، جو ٹریفک کنٹرول کر رہا ہوتا ہے، وہ لوگ لرزتے ہیں۔ اس شُرطے (سپاہی) کا خوف اور رعب ہے ان کے دلوں میں، اس لیے کہ اس کے پاس اختیار ہے، لیکن ان بے چاروں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو اب ''مُطوّع'' کا لفظ عام ہو چکا ہے کہ یہ مُلاّٹے کہاں سے آ گئے ہیں! بہرحال یہ تو محض سمجھانے کے لیے ایک ضمنی سی بات تھی۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ یہ کام اصلاً ہو جاتا ہے حکومت کا جبکہ اسلامی حکومت قائم ہو۔ یہ ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے، بلکہ یہ اس کے اوّلین فرائض میں داخل ہے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اس دلیل سے اپنے آپ کو بچا لینا ایک طرح کی فراریت ہے۔ یہ دین سے غداری ہے کہ اس وقت بھی آدمی یہ کہہ کر نکل جائے کہ یہ تو حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ ایک شے ایک خاص محل میں صحیح ہوتی ہے۔ ظلم یہی تو ہے کہ ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ'' کہ کسی چیز کو اُس کی اصل جگہ سے ہٹا کر کہیں اور لے جانا۔ لہٰذا یہ اسلام کے ساتھ بدترین ظلم شمار ہوگا۔ اس کی مثال مَیں دیا کرتا ہوں کہ اگر حکومت قائم ہے، نظم ٹھیک ہے تو جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے! فرض کیجیے کہ ملک میں انارکی ہو جائے، نظام درہم برہم ہو جائے، یا پولیس انتہائی کرپٹ ہو چکی ہو اور آپ کو پتا ہو کہ یہ پہرے دار تو خود ڈاکو بنے ہوئے

ہیں، تو ان حالات میں آپ کیا کریں گے؟ پاؤں پھیلا کر اطمینان سے سو جائیں گے یا اپنے پہرے کا انتظام کریں گے؟ بالکل وہی معاملہ یہاں ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کی ذمہ داری ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اب یہ ذمہ داری ایک ایک فرد پر منتقل ہو جاتی ہے اور یہ ہر فرد کے ایمان کا عین تقاضا ہے۔ لہٰذا مراتبِ ایمانی کے ساتھ علی الترتیب تین مراتب ہو جائیں گے: ایک نہی عن المنکر بالقلب۔ حدیث نبویؐ کی رو سے یہ اضعف الایمان ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ: ''اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے''۔ دوسرا نہی عن المنکر باللّسان۔ یہ اس سے ذرا اوپر کا معاملہ ہے اور یوں سمجھئے کہ یہ دعوت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور تیسرا مرتبہ جو مطلوب ہے، وہ ہے نہی عن المنکر بالید۔ تو ان تین الفاظ کو اس طریقے سے علیحدہ علیحدہ سمجھنا ضروری ہے کہ جو بھی اجتماعیت مطلوب ہے اور جس اُمت کی تشکیل کی طرف یہ آیۂ مبارکہ راہنمائی کر رہی ہے، اس کے کرنے کا کام کیا ہے؟ فرمایا: ﴿یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ﴾ ''خیر کی طرف بلائیں''۔ (میری ابتدائی تحریروں میں سے ایک مضمون ''دعوت الی اللہ'' ہے۔ اگر آپ نے اس کا مطالعہ کیا ہے تو یہاں اُس پورے مضمون کا خلاصہ اپنے ذہن میں رکھیے۔)

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

آگے فرمایا: ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ ''اور نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں''۔ یہاں آپ وہ احادیث پڑھ لیجیے اور انہیں یاد کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان کے بارے میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ تو پھر بھی مشہور ہے اور اس کو تقریر و تحریر میں بیان بھی کیا جاتا ہے، لیکن دوسری حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکی ہے، حالانکہ مسلمان معاشرے پر اطلاق کے اعتبار سے یہ حدیث بہت اہم ہے۔ پہلے ہم اسی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیادہ عام ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : ((مَنْ رَّاٰی مِنکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ)) (۱) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو کوئی بھی تم میں سے دیکھے کسی منکر کو (کسی بدی کو) اس کا فرض ہے کہ اس کو بدلے اپنے ہاتھ سے''۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ''اسے چاہیے'' سے کیا جاتا ہے' لیکن اس سے بڑا مغالطہ ہو جاتا ہے۔ یہ اخلاقی تعلیم نہیں ہے' یہ ''فعل امر'' ہے۔ اور اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ (امر وجوب کے لیے ہوتا ہے) اِلّا یہ کہ کوئی اور قرینہ ہو۔ لہٰذا ترجمہ ہوگا: اس پر واجب ہے' لازم ہے' فرض ہے۔ یہ نزولی ترتیب ہے۔ یعنی اصلاً تو مطلوب یہ ہے' البتہ اگر کوئی مانع ہے تو اس کا دوسرا درجہ یہ ہے: ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ)) ''پھر اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان کے ساتھ اس سے روکے''۔ استطاعت کا نہ ہونا دونوں اعتبارات سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آدمی بودا ہے' کمزور ہے' بزدل ہے' دوسرے یہ کہ حالات واقعی انتہائی خوفناک اور خطرناک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں چیزوں سے نتیجہ ایک ہی نکلے گا کہ استطاعت نہیں ہے' داخلی یا خارجی۔ پس اگر بیچ میں یہ عارض موجود ہو' یعنی کوئی چیز رکاوٹ ہو تو پھر یہ دوسرا درجہ آئے گا کہ زبان سے اس برائی سے روکا جائے۔ بدقسمتی سے اس وقت یہ تصور عام کر دیا گیا ہے کہ یہ بس زبان سے ہی کرنے کا کام ہے' طاقت سے کرنے کا کام تو حکومت کا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کی اصلاح مطلوب ہے۔

آگے فرمایا: ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) ''اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (برا جانے اور اسے بالید روکنے کے لیے قوت فراہم کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اس میں بھی استطاعت کا نہ ہونا خارجی اور داخلی دونوں اعتبارات سے ہو سکتا ہے۔ تو اس برائی کے خلاف دل میں نفرت ہو' طبیعت کے اندر اباء ہو' revolt ہو' بلکہ خون جوش میں آ رہا ہو۔ ایک معاملہ تو قہر

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان وان الایمان یزید وینقص۔

درویش بر جانِ درویش والا بھی ہوتا ہے۔ اگر اس برائی کو ہاتھ سے روک دینے کی ہمت یا استطاعت نہیں ہے تو کم سے کم خون تو کھولے۔ اگر خون بھی نہیں کھول رہا تو گویا ایمان کی رمق بھی دل میں موجود نہیں ہے۔

یہاں وہ حدیث مبارکہ پیش نظر رہنی چاہیے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَاءِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا)) قَالَ : ((فَقَالَ : یَارَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ)) قَالَ : ((فَقَالَ : اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ' فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ)) (رواہ البیہقی)

''اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وحی کیا کہ فلاں فلاں بستی کو الٹ دو اُن کے رہنے والوں سمیت (اس لیے کہ وہ گنہگار ہیں)''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تو جبرائیل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا: ''اے پروردگار! اس بستی میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری نافرمانی نہیں کی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس بستی کو پلٹو پہلے اس پر پھر دوسروں پر' اس لیے کہ میری حمیت میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا چہرہ متغیر نہیں ہوا''۔

ایسا شخص تو بے حمیت اور بے غیرت ہے کہ اِن حالات میں اس کے احساسات پر جوں تک نہیں رینگتی' اس کا خون نہیں کھولتا۔ کم از کم خون تو کھولے! اس کے بعد اگر حالات کے جبر کی کیفیت ہے' کوئی مجبوری ہے تو الگ بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کمزور سے کمزور انسان کو بھی اگر ماں کی گالی دی جائے' اور چاہے وہ اپنی کمزوری کے سبب گالی دینے والے پر اپنا ہاتھ نہ اٹھا سکے' مگر وہ غصے سے کانپے گا تو سہی' اس کا خون تو کھولے گا' چاہے وہ لرز کر اور کانپ کر اپنی جگہ پر رہ جائے اور کچھ کر نہ سکے۔ لیکن اگر اس کا خون بھی نہیں کھولتا تو پھر تو وہ بے غیرت ہے۔ اور یہ ''بے غیرت'' پٹھانوں کے نزدیک سب سے بڑی گالی ہے' کوئی اور گالی اس کے ہم وزن نہیں ہے۔

اب ہم مسلم شریف کی دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حدیث خاص طور

پر کسی مسلمان اُمت کے ضمن میں اہم تر ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ''کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی اُمت میں مبعوث کیا ہو مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی اُمت میں سے حواری اور اصحاب ہوتے تھے''۔ حواری کا لفظ قرآن مجید میں خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے آیا ہے اور اصحاب کا لفظ تو ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھیوں کے لیے بھی بولتے ہیں۔ تو ان تمام کو شامل کر لیجیے! یعنی وہ لوگ جو اُن کے ساتھی' دست و بازو اور جان نثار بنتے تھے' ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے تیار رہتے تھے' جو انصار اللہ اور انصار الرسول بنتے تھے وہ سب حواری اور اصحاب ہیں۔ ان اصحاب کا طرزِ عمل کیا تھا! ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ''وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کا اقتدا کرتے تھے''۔

((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ''پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے''۔ اب یہ لوگ کون ہیں؟ ہیں تو اُمتی ہی' نام لیوا تو ہیں' اس نبی کو ماننے والے تو ہیں' لیکن وہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ ((يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ)) ''کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے''۔ اسلام کی بات کہنی تو پڑتی ہے۔ مسلمان معاشرے میں اسلام کی بات زبان سے کہے بغیر تو چارۂ کار نہیں ہے۔ ((وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ)) ''اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا''۔ اب اس میں قول و فعل کا تضاد' عمل میں فسق و فجور اور بدعات تینوں چیزیں آ گئیں۔ یہ ہے گویا وہ بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ جو اِس درس کا عنوان ہے اور یہ اس کی بہترین تعبیر ہے۔ اس سے زیادہ جامع الفاظ ممکن نہیں۔ یہاں حضور ﷺ کا وہ دعویٰ ملاحظہ کیجیے کہ ((اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) ''مجھے (اللہ کی طرف سے) انتہائی جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں''۔ اور یہ کہ ((اَنَا

اَفْصَحُ الْعَرَبِ)) ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔

اب اس صورتِ حال میں کیا کرنا ہے؟ فرمایا:((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''تو جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مؤمن ہے''((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اُن کے ساتھ جہاد کرے گا اپنی زبان سے وہ مؤمن ہے''((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اُن سے جہاد کرے گا اپنے قلب سے وہ مؤمن ہے''((وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں''۔(۱)

ان الفاظ میں پورا لائحہ عمل موجود ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ طاقت نہیں ہے تو طاقت حاصل کرو۔ جیسے ارشادِ الٰہی ہے : ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال:٦٠) ''اور اُن کے مقابلے کے لیے اپنی امکانی حد تک تیاری کرو''۔ یہاں اگر طاقت حاصل کرنے کی امکانی جدوجہد تم کر لو اور طاقت ہاتھ میں نہ آئے تو تم معذور ہو گے۔ لیکن طاقت تم نے چھوڑ دی ہو فساق و فجار کے لیے اور خود قانع ہو گئے ہو اپنے کچھ مذہبی مناصب پر' میدان کھلا چھوڑ دیا ہو فاسقوں اور فاجروں کے لیے' خود اُن کا ضمیمہ بن جانا قبول کر لیا ہو تو یہ ہرگز نہ قرآن کا تقاضا ہے' نہ ایمان کا تقاضا ہے اور نہ عقل کا تقاضا ہے۔ لہٰذا طاقت حاصل کرو' جدوجہد کرو' جمعیت فراہم کرو! آج کے دَور کی اصل طاقت جمعیت ہے۔ کتنے پیارے الفاظ ہیں سراج منیر کے کہ ''نتیجہ خیزی کا دار و مدار تنظیم پر ہے''۔ یہ ہے اُمت ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾۔ قوت تو اسی سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہ کس طریقے سے وجود میں آتی ہے؟ یہ قوت ''ایک اکیلا دو گیارہ'' کے تناسب سے بڑھتی ہے' جسے آپ Geometric progression کہتے ہیں۔ لہٰذا طاقت حاصل کرو' جماعت بناؤ! جب ایک منظم جماعت (disciplined organization) وجود میں آ جائے تو پھر اپنی پسند اور ناپسند کا مظاہرہ (Demonstration of your will) کرو' یعنی یہ بتاؤ کہ یہ بات ہمیں پسند نہیں

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان ......

ہے۔ اور یہ بھی میرے نزدیک ابھی نہی عن المنکر باللّسان کی ایک صورت ہے۔ باللّسان کی ایک صورت وعظ ونصیحت ہے۔ ہر مسجد کا خطیب اور ہر خادمِ دین وعظ کر رہا ہے۔ وہ نہی عن المنکر باللسان میں شامل ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد یہی بات جب آپ منظّم اور پُرامن طریقے سے ایک اجتماعی مظاہرے کی شکل میں سامنے لائیں گے‘ تو یہ بھی باللسان ہی ہے‘ لیکن یہ اب گاڑھا ہوگیا ہے۔

موجودہ دَور میں ’جہاد بالید‘ کی عملی صورت

اب دیکھئے ’’نہی عن المنکر بالید‘‘ کیا ہے؟ یہ کہ آپ گھیراؤ کریں کہ فلاں کام شریعت کے خلاف ہے‘ ہم جیتے جی نہیں ہونے دیں گے۔ اس کا نام گھیراؤ (picketing) ہے‘ کہ ہم ظالم کا ہاتھ پکڑ لیں گے‘ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ جو شے بھی دین کے خلاف ہے وہ ظلم ہے۔ یہ سب ظلم کے مظاہر ہیں۔ حق صرف یہ ہے کہ زمین اللہ کی ہے‘ اس پر قانون اللہ کا چلے گا۔ اس سے انحراف ہی تو ظلم ہے۔ یہی تو دراصل کفر اور شرک ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ...... فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ...... فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المائدۃ) ’’اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو کافر ہیں......وہی تو ظالم ہیں......وہی تو فاسق ہیں‘‘۔ اس کفر‘ ظلم اور فسق کے خلاف جب اقدام ہوگا کہ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ تصادم کی صورت میں نکلے گا۔ ایک امکان ہے کہ اس میں انقلابی جماعت کو پسپائی ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو فبہا‘ اور کیا چاہیے! اور اگر کامیابی نصیب ہو جائے تو اسی انداز سے ایک ایک کر کے منکرات کو اِس قوت کے ساتھ ہٹواتے چلے جائیں گے۔ یہی ہمارا مطلوب ہے۔ اس کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ حکومت طلب کرنا تو اصلاً بیماری اور مرض ہے۔ یہ بڑا پُرخطر راستہ ہے۔ اِدھر کہاں جاتے ہو؟ مت ماری گئی ہے اُن کی جو اِس راستے کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس راستے میں تو طالع آزما لوگ آپ کے ساتھ آئیں گے۔ آپ کو کیا پتا کہ ان کے دل میں کیا ہے؟ کس کا

دل چیر کر آپ دیکھیں گے؟ کسی کے دل میں حبِّ جاہ اندر ہی اندر مچل رہی ہو تو آپ کو کیا پتا! لیکن اس انقلابی راستے پر تو وہی آئے گا جو سر پر لاٹھی کھانے کو تیار ہو۔ یہاں وہی آئیں گے کہ جو اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جو بلند ترین درجہ ہے اس میں جان کا خطرہ تو موجود ہے۔ اس لیے کہ تصادم ہو کر رہے گا۔ اگر حکومت پسپائی نہیں کر رہی ہے تو وہ لاٹھیاں برسائے گی‘ آنسو گیس چھوڑے گی‘ جیلوں میں ٹھونسے گی‘ گولیاں برسائے گی۔ تو اس میں جان کا اندیشہ تو بہرحال ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب اس مضمون کو سورۃ التوبۃ کی اس آیت سے جوڑا گیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ’’یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض‘‘۔ گویا اس کام کے لیے تو سرفروش چاہئیں۔ ﴿یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟﴾ ’’وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں‘ پس وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں‘‘۔ حضور ﷺ کے دَور میں تو دو طرفہ معاملہ تھا کہ مسلمان قتل کرتے بھی تھے اور قتل ہوتے بھی تھے‘ جبکہ اِس دَور میں صرف یک طرفہ طور پر قتل ہونے کا معاملہ ہے۔ اگرچہ اس کی شرائط پوری ہو رہی ہوں تو قتال بھی جائز ہے۔ اگر کچھ فساق وفجار دین کے راستے کے اندر ایک رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے ہوں اور آپ نے باقی سارے تقاضے پورے کر لیے ہوں تو کیا ان کی جانیں اتنی مقدس ہیں کہ ان کی وجہ سے دین کو پامال رہنے دیا جائے؟ یہ بات نہ عقل کی میزان پر پوری اترنے والی ہے اور نہ نقل کی میزان پر۔

حدیث نبویؐ میں ’’جہاد بالید‘‘ کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہاتھ سے جہاد‘ قوت سے جہاد۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دَورِ نبویؐ میں جہاد بالید کا کیا تصور تھا جب حضور ﷺ نے جہاد بالقلب‘ جہاد باللسان اور جہاد بالید کے الفاظ ادا فرمائے؟ اس وقت تو جہاد بالید کے معنی قتال ہی کے تھے‘ کیونکہ اس وقت تو مظاہروں (demonstrations) کا کوئی

طریقہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ موجودہ سیاسی ادارے وجود میں آئے تھے۔ یہ تو آج کے دَور میں اس عمرانی ارتقاء کی بنیاد پر مظاہروں اور گھیراؤ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک اس حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا موقف صد فی صد درست ہے۔ کچھ بہت ہی محتاط قسم کے لوگ اور بعض روایات کے ظاہر پر بہت زیادہ ڈیرہ ڈال دینے والے یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی حال میں بھی مسلمان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی الّا یہ کہ وہ کلمۂ کفر کہے اور کفر کو نافذ کرے۔ اس کے لیے حکمت کی ضرورت ہے کہ اس موضوع پر جملہ روایات کو سامنے رکھ کر اُن میں تطبیق پیدا کی جائے‘ ان کو جمع کیا جائے‘ ان میں باہم موازنہ کیا جائے اور پھر اُن سے نتیجہ نکالا جائے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے‘ البتہ اس کی شرائط بہت ساری ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی آپ مطلقاً خارج از بحث نہ کیجیے۔ آج اس کو خارج از بحث کرنے کا جو تصور ہے یہ سب سے زیادہ زور اور شدت کے ساتھ غلام احمد قادیانی نے دیا تھا اور یہ چیزیں ہمارے بہت سے حلقوں کے ذہنوں کے اندر مختلف درجے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ بہرحال میں نے اس کو سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کے ساتھ جوڑا ہے۔ جن مؤمنین نے جنت کے عوض اللہ سے اپنے جان و مال کا سودا کیا ہے وہ کس ہستی کے ہاتھ پر کیا ہے‘ یہ ہم سورۃ الفتح کی آیت میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ﴾ ”یقیناً جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں“۔

اب اگلی آیت (آیت ۱۱۲) میں ان مؤمنین کے نو اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ایک بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ ابتدا ”اَلتَّآئِبُوۡنَ“ کی صفت سے ہے کہ وہ اللہ کے حضور توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ پہلا قدم ہے۔ تنظیم اسلامی کے ہر کتابچے پر ہماری ایک تحریر چھپتی رہی ہے: ”تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت: تجدیدِ ایمان‘ توبہ‘ تجدیدِ عہد“۔ تو یہ نقطۂ آغاز ہے۔ ایک مسلمان معاشرے میں اصلاح کا آغاز ایمان لانے سے نہیں بلکہ ایمان کی تجدید سے ہوگا۔ اسی کا نام توبہ ہے۔ اس کے بعد دوسری صفت ”اَلۡعٰبِدُوۡنَ“

ہے کہ اب خود اللہ کے بندے بنو‘ اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرو۔ جیسا کہ سورۃ الحج کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ۷۷﴾﴾ ”اے ایمان والو! رکوع کرو‘ اور سجدہ کرو‘ اور اپنے ربّ کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ“۔ پہلے قدم کے بغیر دوسرا قدم نہیں ہوگا اور دوسرے قدم کے بغیر تیسرا قدم نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ”اَلۡحٰمِدُوۡنَ“ کی صفت آئی ہے کہ وہ اللہ کی حمد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا زیادہ تعلق انسان کے شعور‘ ذہن اور فکر کے ساتھ ہے۔ جتنی اللہ کی معرفت بڑھے گی اتنی ہی اللہ کی حمد کی جا سکے گی۔

اس کے بعد چوتھی صفت ”اَلسَّآئِحُوۡنَ“ کی ہے کہ وہ سیاحت کرنے والے (لذاتِ دُنیوی سے کنارہ کش رہنے والے) ہوتے ہیں۔ اس صفت کا عمل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ سیاحت کسے کہتے ہیں؟ پرانے زمانے میں سیاحت یہ ہوتی تھی کہ لوگ بن باس لے لیتے تھے۔ جنگلوں کو نکل جاتے تھے۔ یہ تربیت کا ایک خاص اسلوب رہا ہے۔ اس نے ایک institution کی شکل اختیار کر لی جسے ہم ”رہبانیت“ کہتے ہیں۔ اس کی اسلام میں نفی کی گئی ہے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ”سیاحت“ صوم یعنی روزہ ہے۔ یہ بھی تو ایک طرح کی رہبانیت ہے کہ نہ کھانا ہے‘ نہ پینا ہے اور نہ تعلقِ زن و شو ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بھی اسلام کی رہبانیت ہے۔ اس میں بھی آدمی کو گھر کے آرام اور گھر کی سہولتوں وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلنا پڑتا ہے۔ یہاں اس چیز کو خاص طور پر نوٹ کیجیے۔ یوں سمجھئے کہ زمین سے جڑے رہنے کے ذہن اور مزاج کو بدلنا ہوگا۔ سیاحت اصلاً یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلنا۔ یہ نہ ہو کہ ع ”حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے!“ دنیا کے لیے تو بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں یہاں سے وہاں نقل مکانی کرتے پھریں‘ لیکن دین کے معاملے میں یہ سمجھیں کہ یہ کیسے مناسب ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے کہ وہ جب ہمیں طلب کرے‘ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ یہ چیز عکس ڈال رہی ہے انسان کے value

structure پر کہ اس کے ہاں کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ کبھی اس بارے میں سوچا کہ دُنیوی معاملات میں تو گھر والے کبھی آڑے نہیں آتے' جہاں بہتر روزگار مل رہا ہو وہاں گھر والے خود بھیجتے ہیں اور سامان باندھنے میں بیوی بچے سب لگ جاتے ہیں' جبکہ دین کے معاملے میں کہتے ہیں پاگل ہو گئے ہو' دماغ خراب ہو گیا ہے؟ گھر بار چھوڑ رہے ہو؟ بیٹھے رہو! حالانکہ کوئی حرکت اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ یہ ترجیح معین ہو کہ تمہارا تعلق کس کے ساتھ ہے۔ زمین سے یا اللہ سے؟ زمین سے یا دین سے؟ سورۃ العنکبوت میں یہی بات کہی گئی ہے: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''اے میرے اہل ایمان بندو! میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی کرو''۔ یعنی دین کے تقاضے جہاں اور جس طور سے بہتر سے بہتر ادا ہوں وہاں چلے جاؤ۔ حرکت میں رہو! زمین کے اندر کہیں جڑیں نہ اتارلو کہ نہ زمین ہلے نہ ہم ہلیں۔ انسان سوچتا ہے کہ میں نے یہاں محنت کی ہوئی ہے' یہاں پریکٹس جمائی ہوئی ہے' میری بیس سال کی مشقت اس زمین میں گڑی ہوئی ہے' یہاں سے ہل جاؤں تو مجھے کہیں جا کر از سرنو پریکٹس جمانی ہوگی۔ یہاں میری شہرت ہے اور میرے تعلقات ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ اللہ کی راہ میں سیاحت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا نظریہ بقول اقبال یہ ہوتا ہے: ؏ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

پھر یہ کہ ﴿اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ﴾ ''(وہ) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے (ہوتے ہیں)''۔ جھکنے کی ابتدا رکوع سے ہوتی ہے اور انتہا سجدہ ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''(یہ) نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روک دینے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (ہوتے ہیں)''۔ اس میں لفظ ''اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ'' نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اس کو سمجھ لیجیے کہ ایک ہے خود حدود اللہ پر قائم رہنا۔ اس کا حکم تو پہلے آ چکا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' دیکھنا موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔ اور پھر ''اَلْعٰبِدُوْنَ'' میں بھی یہ بات آ

گئی ہے۔ لہٰذا یہاں محض یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کی حدود کی خود حفاظت کرنا اور اس پر کاربند رہنا۔ یہ بات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے' مگر اس کا مطلب اصلاً یہ ہے کہ اللہ کی حدود کے پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاؤ کہ انہیں اب نہیں توڑنے دیں گے۔ خدائی فوج دار بنو کہ ہم اللہ کے سپاہی ہیں اور اُس کی حدود کے محافظ ہیں۔ یہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے۔ ترتیب اور سیاق دیکھئے کہ کہاں سے چلی ہے یہ بات! ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ؕ﴾ کہ اللہ کی حدود کے پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاؤ' سنتری بن جاؤ! کوئی تمہیں گرانے کے بعد ہی اللہ کی حد توڑ سکے۔ جیسے گاندھی نے کہا تھا: پاکستان صرف میری نعش پر بن سکتا ہے۔ جسے ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم جیتے جی نہیں ہونے دیں گے۔ تو ''اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ'' کا یہاں یہ مطلب ہے۔ یہ ہے اقدام کا عنوان! یہ ہے ایک بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے میں قرآن و حدیث کی رہنمائی میں اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام!!

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم

درس ۷

اطاعتِ امر
بمقابلہ
تنازع فی الامر

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾﴾ (النساء)

﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِیۡحُکُمۡ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الانفال)

﴿وَلَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَعَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَکُمۡ عَنۡهُمۡ لِیَبۡتَلِیَکُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾﴾ (آل عمران)

﴿یَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾

(آل عمران:۱۵۴)

﴿قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِیۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ (النور)

اس سے ماقبل اسباق میں جو باتیں بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہیں ان میں اوّلین بات ’’فرائضِ دینی کا جامع تصور‘‘ سے متعلق ہے کہ فرائض دینی کی چوٹی کیا ہے۔ اسے خواہ اقامتِ دین کہہ لیا جائے‘ خواہ تکبیرِ ربّ کہہ لیا جائے‘ خواہ غلبۂ دینِ حق یا اعلائے کلمۃ اللہ کہہ لیا جائے‘ خواہ زمین پر آسمانی بادشاہت کا قیام کہہ لیا جائے‘ خواہ قیامِ حکومتِ الٰہیہ کا نام دے دیا جائے‘ خواہ اسے قیامِ نظامِ اسلامی سے تعبیر کر لیا جائے‘ خواہ نفاذِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ سے تعبیر کیا جائے‘ خواہ اسلامی انقلاب کہہ لیا جائے‘ یہ عبارات مختلف ہیں‘ اصطلاحات جدا ہیں‘ لیکن بات ایک ہی ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں سمع وطاعت کا تصور

دوسری بات ہم نے ماقبل اسباق میں یہ سمجھی تھی کہ یہ کام بغیر ایک منظّم جماعت کے ممکن نہیں۔ یعنی صرف جماعت ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک منظّم (disciplined) جماعت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے قرآن وسنت کی اصطلاح ’’سمع و طاعت‘‘ ہے : وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا ’’سنو اور (بلاچون و چرا) اطاعت کرو‘‘۔ یہ اصطلاح ہمارے منتخب نصاب (۱) میں سورۃ التغابن کے آخر میں بایں الفاظ

ذکر ہوئی ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ’’پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنے امکان کی حد تک‘‘ تاحدّ استطاعت۔ اللہ کا تقویٰ تو دین کی روح ہے۔ اور اس کا جو نظام بنے گا وہ ہوگا سمع و طاعت کا نظام کہ ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ’’سنو اور بس اطاعت کرو۔‘‘ اور اس کے لیے انفاق کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں چیزیں سورۃ التغابن میں ایک ساتھ ذکر ہوئی ہیں کہ ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا﴾ ’’اور (التزام کے ساتھ) سنو اور (بلا چون و چرا) اطاعت کرو اور انفاق کرو‘‘۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انفاق دو طرح کا ہے‘ انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔ یہ بات سورۃ الحدید کی ابتدائی آیات میں واضح ہو جاتی ہے۔ تو اب بات گویا پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ روحِ دین اللہ کا تقویٰ ہے اور نظامِ دین سمع و طاعت ہے اور اس نظام کے تحت انفاقِ مال اور بذلِ نفس مطلوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اِس حدیث نبویؐ میں مذکور ہے جو حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت‘ سمع و طاعت‘ ہجرت اور جہاد‘‘۔

نوٹ کیجیے کہ اس میں تیسری بات ’’اطاعت‘‘ ہے اور ہم یہ بات پوری تفصیل سے سمجھ چکے ہیں کہ اس کے لیے بیعت کا نظام لازم ہے‘ جو قرآن و سنت سے منصوص اور ماثور ہے اور یہ نظامِ بیعت ہماری پوری تاریخ میں معمول بہ رہا ہے۔ ہر اجتماعیت اسی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ ڈھیلی سے ڈھیلی اجتماعیت بھی جو خالص انفرادی اصلاح کے عنوان سے قائم ہوئی‘ وہ بھی بیعت کے عنوان سے قائم ہوئی‘ حکومت بنی تو بیعت کے تحت بنی‘ حکومت سے بغاوت کی نوبت آئی تو بیعت کی بنیاد پر آئی۔ ہماری پوری تاریخ میں یہی نظر آتا ہے‘ لہٰذا اس کا نظام‘ نظامِ بیعتِ سمع و طاعت ہے۔ یہ بیعتِ سمع و طاعت حضور ﷺ اور دیگر انبیاء و رُسل کے لیے مطلق‘ غیر مشروط اور غیر مقید ہے‘ لیکن حضور ﷺ کے بعد ہر شخص کے لیے‘ خواہ وہ خلافتِ راشدہ تھی خواہ بیعتِ ارشاد ہو‘ فی المعروف کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔ اس کے سوا اس نظامِ اطاعت کے حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ البتہ ایک اور پہلو سے اس میں ایک فرق ہے‘ جسے اچھی طرح سمجھ لینا

چاہیے‘ تاکہ اس کی اہمیت بھی سامنے آ جائے اور اس کا صغریٰ کبریٰ بھی پورے طور سے واضح ہو جائے‘ اور اس طرح سے انشراحِ صدر ہو جائے۔

اس کے ضمن میں سب سے پہلی آیت جو ہم نے منتخب کی‘ وہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ’’اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اُس کے رسول کی اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی‘‘۔ بیعت کے سلسلے میں جو حدیث ہم تفصیل سے پڑھ چکے ہیں اس میں الفاظ آئے ہیں: ’’وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ‘‘ کہ ہم نہیں جھگڑیں گے اصحابِ امر سے‘ چاہے جو بھی امیر ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ امارت کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص امیر نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ مسلمانوں کے امیر مطلق تھے۔ پھر آپؐ کہیں کوئی جیش بھیجتے تھے تو کسی کو اس کا امیر بناتے تھے۔ پھر اس جیش میں بھی کوئی ایک امیر نہیں ہوتا تھا‘ اس کے تابع مختلف دستوں کے کمانڈر ہوتے تھے۔ یعنی کوئی میمنہ پر امیر ہے تو کوئی میسرہ پر‘ کوئی قلب پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو کوئی ہراول دستے پر۔ اسی طرح کوئی پیچھے محفوظ فوجوں (Reserved Forces) پر امیر ہے۔ پھر فوج کے مختلف حصوں کی مزید تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بہت سے دستے اور ان کے الگ الگ کمانڈر ہو سکتے ہیں۔ تو یہ تو ایک سلسلہ ہے‘ اس لیے ’’اولی الامر‘‘ کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔

مزید نوٹ کیجیے کہ یہاں اطاعت کی جو تین کڑیاں ہیں‘ اللہ کی اطاعت‘ رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت‘ ان میں سے پہلی دو کڑیوں کے ساتھ تو فعل امر ’’اَطِيْعُوْا‘‘ کی تکرار ہوئی‘ لیکن تیسری کڑی کے ساتھ نہیں ہوئی۔ ورنہ عام ذہن چاہتا ہے کہ یا تو ایک ہی مرتبہ اَطِيْعُوْا کا لفظ کافی ہے‘ کیونکہ بریکٹ کے باہر والی قدر بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار سے ضرب کھاتی ہے۔ یا پھر اگر تکرار کی گئی تھی تو ایک لفظ کے اضافے سے کوئی حرج نہیں تھا کہ اولی الامر کے ساتھ بھی لفظ ’’اَطِيْعُوْا‘‘ دہرا دیا جاتا۔ لیکن نہیں‘ جو کچھ ہوا بالحق ہوا‘ اللہ کی حکمت کی بنیاد پر ہوا۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس سے

نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت تو مطلق ہے‘ جب کہ اولی الامر کی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور پہلی دو اطاعتوں کے تابع ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے جو اِن الفاظ کی ترکیب کے اندر مضمر اور مقدر (understood) ہے۔

اب ذرا توجہ کو لفظ اطاعت پر مرکوز کیجیے! اس کا مادہ ”طوع“ ہے اور طوع بمقابلہ ”کرہ“ کے آتا ہے‘ جیسے طوعاً و کرہاً عام مستعمل ہے۔ اطاعت کہتے ہیں دلی آمادگی سے کسی کی بات ماننے کو۔ یہی اصل میں مطلوب ہے۔ اگرچہ حدیث میں جو بیعت کے الفاظ ہیں ان میں ساتھ ہی اضافہ کر دیا گیا کہ اگر بطوعِ خاطر ہے فبہا‘ ورنہ اگر کرہاً ہے تو بھی کرنی پڑے گی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ یعنی چاہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو‘ تمہارے بارِ خاطر ہو‘ تمہاری رائے اس کے حق میں نہ ہو‘ لیکن چونکہ فیصلہ ہو گیا ہے‘ صاحبِ امر نے طے کر دیا ہے اور آپ اسے خلافِ دین ہونا یا شریعت کے کسی واضح حکم کے مخالف ہونا بھی ثابت نہیں کر سکے تو آپ کو وہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔ اگرچہ جماعتی نظم میں جو روح درکار ہے‘ جس سے کامیابی کی ضمانت ہوگی‘ وہ تو یہ ہے کہ جماعت کی اصل ریڑھ کی ہڈی کے اندر یہ اطاعت اپنی اصل روح کے ساتھ یعنی بطوعِ خاطر ہو رہی ہو۔

اب اس میں جو اصل بات ہے‘ جسے میں چاہتا ہوں کہ آپ پورے شرح وبسط کے ساتھ سمجھ لیں‘ وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے ساتھ شرط ہے مِنۡکُمۡ کی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اولی الامر مسلمان ہونے چاہئیں۔ اب اگر کہیں غیر مسلم زبردستی قابض ہو جائے تو مجبوراً اور اضطراراً تو اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے‘ جیسے بھوک سے مرتا انسان سُور یا مردار کھا سکتا ہے‘ جیسے فرمایا گیا: ﴿فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) (پس جو حالت مجبوری میں ہو تو اس پر [یہ ناپاک چیز کھانے میں] کوئی گناہ نہیں‘ بشرطیکہ [اس کے کھانے میں] کوئی سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو)۔ ورنہ اسلام میں اصلاً غیر مسلم کی اطاعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مقدمۂ بغاوت ہماری گزشتہ دو سو سالہ تاریخ کے اندر روشنی کا ایک عظیم

مینار ہے‘ جہاں ہماری تین عظیم شخصیتوں نے انگریز کی عدالت میں برملا تسلیم کیا کہ ہاں ہم باغی ہیں اور مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار نہیں ہے۔

اولوالامر سے اختلاف کی صورت میں لائحہ عمل

اب آپ ایک بات اور سمجھئے کہ یہ نظامِ اطاعت دو طرح کا ممکن ہے۔ ان دونوں کے ضمن میں حکم ہو رہا ہے کہ: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ یعنی اگر تم کسی چیز کے معاملے میں اختلافِ رائے کا شکار ہو جاؤ‘ تمہارے مابین کسی معاملے میں تنازُع ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ اب دیکھئے تنازُع کسے کہتے ہیں۔ یہ نزع سے باب تفاعل ہے۔ نزع کے معنی ہیں کھینچنا۔ جب جان کھینچی جائے گی تو وہ عالمِ نزع ہے۔ لہٰذا تنازُع کے معنی ہیں کھینچ تان۔ اگر ایک طرف سے ایک کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف سے کوئی دوسرا کھینچ رہا ہے تو یہ تفاعل کے وزن پر تنازُع ہے۔ بابِ مفاعلہ کی طرح بابِ تفاعل کے بھی دو خواص مبالغہ اور مشارکہ ہیں۔ یعنی شرکت بھی ہوتی ہے اور مبالغہ بھی ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اسی بات کی طرف راہنمائی کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارے مابین یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اب کیا کرنا ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہو کہ یہ چیز صحیح ہے اور دوسرے کی رائے ہو کہ نہیں‘ یہ غلط ہے۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ میں نے ’صحیح‘ اور ’غلط‘ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صحیح اور غلط کے مختلف درجات ہیں۔ ایک معاملہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہے کہ یہ چیز انسب ہے‘ زیادہ مناسب ہے اور ایک کی رائے ہے کہ یہ کم مناسب ہے۔ معاملہ نصوص کا نہ ہو‘ حلال وحرام کا نہ ہو‘ بلکہ صرف تدبیر کا ہو کہ بحالاتِ موجودہ ہمارے لیے کون سا طریقہ کار موزوں تر ہے؟ ابھی ہم کوئی مزید قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں ہیں؟ ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ ہیں اور ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ نہیں ہیں۔ اس بحث کو ایک طرف رکھ دیجیے! یہاں معاملہ نصوص کا ہے۔ جو معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مطلق اطاعت سے متعلق ہوں‘ یعنی

حلال وحرام، جائز وناجائز اور صحیح وغلط میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے اور تنازُع پیدا ہو جائے۔ یہاں وہ حدیث ذہن میں لے آیئے کہ ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَبَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ))(۱) ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، البتہ ان دونوں کے مابین کچھ چیزیں مشتبہ (غیر واضح) ہیں''۔ دین میں جو قطعی حلال وحرام ہیں وہ تو بالکل بیّن ہیں۔ البتہ ان کے مابین مشتبہات کا دائرہ آ جاتا ہے جہاں اصل میں مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مشتبہات میں بھی آدمی کی رائے میں سختی ہو سکتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز حرام سے زیادہ قریب ہے اور کسی دوسرے کی رائے میں یہی چیز حلال سے زیادہ قریب ہے تو دونوں اپنی اپنی رائے پر جازم ہو جائیں گے اور ان کی آراء میں سختی پیدا ہو جائے گی۔ اس کیفیت کو ذہن میں رکھئے! اس کا حکم یہ دیا کہ: ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''لوٹا دو اُس شے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف''۔ یہ بالکل منطقی سی بات ہے۔ اس لیے کہ غیر مقید، غیر مشروط اور مطلق اطاعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

اب دیکھئے، نظمِ جماعت کی دو علیحدہ علیحدہ شکلیں ہیں، جنہیں سمجھ لینا چاہیے۔ ایک معاملہ ہو سکتا ہے کسی اسلامی ریاست میں حکومت کے ساتھ اس جھگڑے کے پیش آ جانے کا۔ ہم سورۃ الحجرات میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ اسلامی ریاست کا اصل الاصول یہ آیۂ کریمہ ہے: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۱) ''اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو!'' کیونکہ قرآن وسنت ہی اس کا دستورِ اساسی ہے اور اہل ایمان کے پاس جو بھی قانون سازی کا اختیار ہے وہ ایک دائرے کے اندر محدود ہے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں بھی یہ شق موجود ہے کہ:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب اخذ الحلال وترك الشبهات۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست کا ایک شہری اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو مسودۂ قانون اس وقت زیر بحث ہے اس کی کوئی شق یا وہ پورا قانون شریعت کے دائرے سے تجاوز کر رہا ہے، یا یہ کہ جو قانون اس وقت ریاست میں موجود ہے، اس کی رائے کے مطابق (چاہے اس کی رائے صحیح ہو یا غلط) اس میں اللہ اور اس کے رسول کے دائرے سے تجاوز ہے، تو اس صورت میں اس کا کیا حل ہوگا؟ اس کی وضاحت تفصیلاً ہو چکی ہے کہ الحمد للہ، ثم الحمد للہ کہ اس دَور میں جو ادارے (institutions) وجود میں آئے ہیں اور جو عمرانی ارتقاء ہوا ہے اس نے ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) کو علیحدہ علیحدہ متعارف کرایا ہے۔ ایک قانون ساز ادارہ (Legislature) ہے، ایک انتظامیہ (Executive) ہے اور ایک عدلیہ (Judiciary) ہے۔ تو یہ معاملہ عدالت کے حوالے ہوگا۔ جیسے دستور کی جو دوسری provisions ہیں، ان سب کی امین (custodian) عدلیہ ہے۔ مثلاً اگر کسی کے بنیادی حقوق میں کمی کی گئی ہے تو وہ کہاں جائیں گے! عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اسی طرح جب ریاست کے دستورِ اساسی میں یہ طے ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی تو اختلاف کی صورت میں آپ عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی عمل قرآن وسنت کے خلاف ہو رہا ہے، ممکن ہے آپ کو مغالطہ ہو، لیکن یہ کہ آپ کے لیے راستہ تو یہی ہے کہ جو بھی اعلیٰ عدالتیں ہیں ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں! وہاں علماء کو بھی بحث اور استدلال کا موقع ہے کہ وہ عدالت میں جائیں اور دلائل دے کر ثابت کریں کہ یہ صرف مغالطہ تھا یا بات واقعی صحیح تھی۔ یہ ہے صورت جو اسلامی ریاست کے اندر اِس دَور میں اختیار کی جائے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے اندر تو دیگر ہزاروں حیثیتوں کے ساتھ یہ تینوں حیثیتیں بھی جمع تھیں۔ صدرِ ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ ہی چیف جسٹس بھی تھے، حضور ﷺ ہی چیف ایگزیکٹو بھی تھے اور قانون سازی بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ تو خود شارع ہیں۔ شارعِ اوّل اللہ

تعالیٰ اور شارع ثانی محمدؐ رسول اللہ ﷺ۔ تو یہ تینوں حیثیتیں حضور ﷺ کی ذات میں جمع تھیں۔ اسی کا عکس آپ کو خلافت راشدہ میں نظر آئے گا' اگرچہ ذرا آگے چل کر اس میں تقسیم شروع ہوئی ہے۔ غالباً حضرت عمرؓ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام قائم ہوا ہے' ورنہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں کوئی علیحدہ عدالتی نظام نہیں تھا اور خلیفۂ وقت چیف جسٹس بھی تھا۔ ان چیزوں کے بارے میں لوگوں کو مغالطے لاحق ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ کیفیت ہمیشہ کے لیے واجب العمل (binding) ہے اور وہ تمدنی ارتقاء کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے بڑے لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نظامِ خلافت راشدہ دراصل نظامِ دورِ نبوت کا تتمہ اور اس کا عکس ہے اور یہ حیثیت آئندہ کسی بھی نظامِ حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتی' اس لیے کہ حضور ﷺ نے اس کے نظائر کو ہمارے لیے binding قرار دے دیا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ))(۱) ''پس تم پر لازم ہے کہ میرا طریقہ اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کا طریقہ اختیار کرو''۔ اب کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی حکومت کا بھی تا قیامِ قیامت یہ مقام نہیں ہوگا۔ خلافت راشدہ تو اصل میں تتمہ اور نمونہ ہے دورِ نبوت کا۔ بہرحال یہ اولی الامر کا معاملہ اس طور سے اسلامی ریاست میں حل ہوگا۔

نظم جماعت کی دوسری صورت ایک اسلامی جماعت کی ہے۔ بالفرض ریاست قائم نہیں ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک جماعت قائم ہوئی ہے تو اس میں جو اولی الامر ہوں گے ان کے ساتھ معاملہ کس طور سے ہوگا؟ اب اس میں بھی دیکھئے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی ہے۔ وہ آپ کا امیرِ اوّل ہے' وہ داعیٔ اوّل ہے۔ اس نے پکارا ہے مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ آپ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جمع ہو گئے۔ اس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت سمع و طاعت

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ وسنن ابی داوٗد' كتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔

فی المعروف کی ہے۔ اب اس کے نیچے امراء کا ایک نظام ہے اور امراء کی ایک لمبی زنجیر ہے۔ جتنی بڑی وہ جماعت ہوگی اور اس جماعت کا جتنا پھیلاؤ ہوگا اتنی ہی وہ لمبی زنجیر بنتی چلی جائے گی۔ اب یہاں پر اگر تدبیر کے معاملے میں آپ کا کوئی اختلاف ہوگا تو آپ صرف اپنی رائے پیش کر کے آزاد ہو جائیں گے۔ اب اس پر جو فیصلہ صاحب امر کرے گا آپ کو اسے تسلیم کرنا ہوگا' چاہے آپ اسے فِی الْمَنْشَطِ قبول کریں اور چاہے فِی الْمَکْرَہِ۔ اب یہاں تک تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوگا جب ایک شخص کا خیال ہو کہ یہ تو شریعت کی حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ اب اس صورت میں یہ ہوگا کہ اگر تو یہ زیریں اطاعتیں ہیں' یعنی اصحابِ امر امیر اوّل سے نیچے والے ہیں تو آپ کو ایک لائن آف اپیل میسر ہے۔ آپ اس امیر سے بالاتر امیر کے پاس اپیل کریں گے۔ اور اگر آپ کو اس سے بھی اختلاف ہے تو اس سے بالاتر کے پاس جائیں گے۔ آپ کو through proper channel اس بات کو امیر اوّل تک پہنچانا ہوگا۔ اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو آخری فیصلہ کرنے والا متصور نہ کرے۔ فرض کیجیے کہ بات آخری امیر یعنی امیر اوّل تک پہنچ گئی اور آپ اس کی ذات سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو آپ کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوگا کہ آپ اس سمع و طاعت کی بیعت کا قلادہ گردن سے نکال کر پھینک دیں۔

ریاست اور جماعت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ریاست کی علاقائی حد بندی (territorial jurisdiction) ہوتی ہے' آپ اس سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہاں جو بھی نظام قائم ہے آپ طوعاً یا کرہاً اس کے رکن ہیں' جب کہ جماعت کا کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا۔ آپ فوراً ہی جماعت سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو نہ شہر اور گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے اور نہ ملک چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ نے جماعت کا ایک نظم اختیار کیا تھا جو ایک معنوی نظم ہے' علاقائی نظم نہیں ہے۔ کسی شخص کی اصابتِ رائے پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ فکری ہم آہنگی کی بنا پر جماعت میں شامل ہوئے تھے' کسی شخص کے خلوص و اخلاص پر آپ کے دل نے گواہی دی تھی اور اُس کی عزیمت اور

ہمت پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ شامل ہوئے تھے۔ اگر آپ کے نزدیک اب ان میں سے کوئی چیز نہیں رہی تو آپ کے لیے راستہ کھلا ہے' آپ آنِ واحد میں علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ہے اصل فرق جسے لوگ نہیں سمجھتے۔ یعنی ریاست کے ضمن میں فیصلے کے لیے عدلیہ سے رجوع کیا جائے گا۔ اور جماعت میں امکان بھر کوشش کیجیے کہ اس بات کو معین طریق کار کے ذریعے آگے تک پہنچایئے! لیکن بہرحال کہیں نہ کہیں جا کر تو بات رُکے گی! کہیں پر جا کر تو وہ زنجیر بند ہو گی اور بات آخری امیر تک پہنچے گی! لہٰذا وہاں جا کر آدمی کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اگر اس کا دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کیسے چل سکتا ہے! تدبیر کے معاملے میں اگر دل مطمئن نہیں ہے تو اس کو چلنا چاہیے۔ لیکن اگر نصوص کے بارے میں دل مطمئن نہیں رہا تو اب اس کا چلنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اس اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکے۔ اس کے لیے یہ راستہ کھلا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ ''یہی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے صحیح طریقہ ہے''۔ اس میں لفظ ''تاویل'' کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ اٰلَ' یَؤُوْلُ کا مطلب ہے کسی چیز' کسی مرکز کی طرف لوٹنا۔ اسی سے لفظ آل بنا ہے جس میں ایسے تمام لوگ ہوتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کریں' اپنے آپ کو اس سے جوڑیں' اس سے تعلق قائم کریں' کسی معاملے میں اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ سب گویا اس کی آل ہیں۔ اس معنی میں ''آلِ محمد'' پوری اُمت ہے۔ جو بھی حقیقت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ آپ ﷺ کی آل میں شامل ہے۔ تو اٰلَ' یَؤُوْلُ کے باب تفعیل میں تأویل بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹانا' کسی چیز کو رجوع کرانا۔ یعنی اگر اپنی جدوجہد کو کامیابی اور نتیجہ خیزی کی طرف لوٹانا چاہتے ہو تو اس کا یہ راستہ ہے' جو بہت بہتر اور سب سے عمدہ اور خوبصورت شکل ہے لوٹنے کی اور اپنے معاملے کو لوٹانے کی۔ کیونکہ آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ تو یہ اس کی ظاہری شکل اور کامیابی کی طرف لوٹنا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی بیعت کی متفق علیہ حدیث کی ایک

روایت میں: '' وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے: ''اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ ''(۱)۔ یہ الفاظ حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہوں گے' اس لیے کہ یہاں صیغہ بدل گیا ہے۔ ان الفاظ میں حضور ﷺ نے گویا ایک مضمر شے کو نمایاں فرمایا: ''سوائے اس کے کہ تم کھلم کھلا کفر کا مشاہدہ کرو جس کے ضمن میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان ہو (دلیل اور سند ہو)''۔ کوئی بھی محض اپنے ذاتی خیال اور وجدان کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے' بلکہ یہاں تو واضح دلیل اور سند کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو نظم کہاں رہا! پھر تو سمع و طاعت کی روح غائب ہو گئی! سمع و طاعت کے پورے نظام کی چولیں ہل جائیں گی۔

تنازُع کی ممانعت اور اس کے ممکنہ نتائج

اب آگے چلیے! سورۃ الانفال (آیت ۴۶) میں فرمایا: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی''۔ اب یہاں اَطِيْعُوْا کا لفظ رسول کے ساتھ بھی دہرا کر نہیں لایا گیا۔ اس لیے کہ الفاظ کے استعمال میں بھی قرآن مجید میں لفاظی نہیں ہے' کم سے کم جچے تلے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ امراء کے اِس سلسلے کو نمایاں کرنا اور اس میں فرق و تفاوت کو واضح کرنا مقصود نہیں تھا' لہٰذا ایک ہی بار ''اَطِيْعُوْا'' لایا گیا۔ اور قرآن میں ہمیشہ ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ'' ہی آتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو''۔

رسول اللہ ﷺ کی جملہ حیثیتوں میں ایک حیثیت مدنی دَور میں یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ حاکم یعنی چیف ایگزیکٹو اور چیف جسٹس بھی تھے اور قانون سازی کا سارا اختیار بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزیں حرام کی ہیں اور میں نے بھی کچھ چیزیں حرام کی ہیں۔ یہاں میں آپ ﷺ کی جس حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں وہ قبل از ہجرت کی حیثیت ہے۔ اس وقت مکّہ میں آپ ﷺ

(۱) حوالہ گزر چکا ہے۔

کی حکومت نہیں تھی‘ کوئی علاقائی تسلط آپؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مکّے میں تو آپ ﷺ مغلوب تھے‘ کمزور تھے۔ اگرچہ بظاہر الفاظ مناسب نہیں‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کفر کو غلبہ حاصل تھا‘ کفار و مشرکین کے ہاتھ میں اختیار تھا‘ صحابہ کرامؓ کو اذیتیں دی جا رہی تھیں اور ان کی دادرسی کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس حالت میں تو دراصل مسلمان ایک جماعت تھے‘ جس کے امیر محمدٌ رسول اللہ ﷺ تھے۔ رسول ہونے کی حیثیت تو بلا شبہ تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ اسی لیے اس حیثیت کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے جو سب سے اعلیٰ‘ سب سے اہم اور سب سے بلند ہے۔ لیکن سیرت النبیؐ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر جگہ پر دیکھیے کہ حضور ﷺ کس حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کہیں آپؐ صرف منصف کی حیثیت سے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ رسول کی حیثیت سے تو آپؐ سے خطا کا کوئی امکان نہیں ہے‘ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ منصف کی حیثیت سے مجھ سے خطا ہو سکتی ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ لوگو! تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو‘ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق زیادہ چرب زبان ہے‘ اپنی بات کو دلیل کے ساتھ زیادہ زوردار انداز میں پیش کر سکتا ہے‘ جبکہ دوسرا بیچارہ اس پہلو سے عاجز ہے‘ تو وہ چرب زبان مجھ سے غلط فیصلہ کروا لیتا ہے۔ تو جان لو کہ میری عدالت سے بھی اگر تم کوئی غلط ڈگری لے گئے اور کسی زمین کے ٹکڑے کے بارے میں تم نے غلط فیصلہ حاصل کر لیا تو جان لو کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہو گا جو تم لے کر جاؤ گے۔ کس قدر واضح حدیث ہے کہ بحیثیت منصف خطا ہو سکتی ہے۔ وہ تو صرف رسول کی حیثیت ہے جو خطا سے پاک ہے‘ منزہ ہے‘ معصوم ہے۔

غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مقام بتایا کہ یہاں پڑاؤ کیا جائے۔ صحابہؓ نے کہا کہ حضورؐ! اگر تو یہ وحی کا فیصلہ ہے‘ یہ آپؐ کا بحیثیت رسول امر ہے تو سرِ تسلیم خم ہے‘ ہماری عقلیں وحی کے مقابلے میں عاجز ہیں‘ ناقابل التفات ہیں۔ لیکن اگر معاملہ یہ نہیں ہے تو اجازت دیجیے کہ ہم عرض کریں! جب اجازت مل گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! جنگی مہارت اور جنگی علم و فہم کے اعتبار سے ہم عرض کر رہے ہیں کہ یہ جگہ

مناسب نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے اسے تسلیم کر لیا اور پڑاؤ وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ ڈالا جہاں صحابہؓ نے مشورہ دیا تھا۔ تو اگر ان تمام حیثیتوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھا جاتا تو آدمی مغالطے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو یہاں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا﴾ ”اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو“۔ اب یہاں لفظ تنازُع آ گیا کہ جھگڑا مت کرو‘ کھینچ تان مت کرو۔ اگر یہ کرو گے تو کیا ہو گا؟ ﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ ”تو تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی“۔ ’فَشَلَ‘ کا مطلب ہے کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا۔ میں نے ”کسا ہوا نظم“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس کے مقابلے میں ”ڈھیلا نظم“ ہے۔ یعنی اب اس کا چاک و چوبند والا معاملہ نہیں رہا۔ بعض تراجم میں ”فَتَفْشَلُوْا“ کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ”تم نامرد ہو جاؤ گے“۔ اس لفظ کی اس حوالے سے بڑی مناسبت ہے۔ یہاں نظم کا ڈھیلا پڑنا مراد ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے کھینچ تان شروع کر دی‘ اگر یہ تمہاری عادتِ ثانیہ بن گئی تو تمہاری ہمت ختم ہو جائے گی‘ تم پر نامردی سوار ہو جائے گی اور تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔ اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ ﴿وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ ”اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی“۔ یعنی کفار و مشرکین پر سے تمہاری دھاک ختم ہو جائے گی‘ تمہارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نتیجہ نکل رہا ہے۔ یہ گویا کہ اب اس تنازُع کی منفی کیفیت ہے جس سے یہ نتائج رونما ہوں گے۔ اور یہ جان لو کہ اصل میں جماعتی نظم کا ڈھیلا پڑنا اس مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی تھی۔ جماعت تو کسی مقصد کے لیے قائم ہوتی ہے۔ جماعت بذاتہٖ تو مطلوب نہیں ہے۔ وہ فی نفسہٖ مطلوب شے نہیں ہے‘ کسی مقصد کے لیے ہے۔ تو تمہارا ڈھیلا پڑ جانا اور تمہاری ہوا کا اکھڑ جانا‘ اس کا نقصان اس مقصدِ عظیم کو پہنچے گا جس کے لیے تم نے وہ اجتماعیت اختیار کی اور اسے قائم کیا۔

آگے فرمایا: ﴿وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ”اور صبر کرو (ڈٹے رہو‘ جمے رہو) یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ اس میں صبر کا ایک پہلو اور بھی

ہے کہ اطاعت امر کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ ایک صبر ہے مخالفین کے مقابلے میں ڈٹے رہنا اور ایک صبر ہے ایذاء پر۔ لیکن **صبر علی الطاعة** اور **صبر عن المعصية** بھی تو صبر کی قسمیں ہیں۔ معصیت اور نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا بھی تو صبر ہے اور اطاعت پر کاربند رہنا بھی صبر ہے۔ اس **صبر علی الطاعة** اور **صبر عن المعصية** کے لیے بھی وہی chain ہوگی' یعنی اللہ کی اطاعت پر صبر اور اللہ کی معصیت سے صبر' رسول کی اطاعت پر صبر اور رسول کی نافرمانی سے صبر' اسی طرح اولی الامر کی اطاعت پر صبر اور اولی الامر کی نافرمانی سے صبر۔ ایک چیز سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے اور ایک چیز پر اپنے آپ کو جمانا صبر ہے۔ چنانچہ یہاں دراصل اطاعت پر صبر کا حکم ہے۔ اور اطاعت میں وہی تین کڑیاں پیش نظر رہیں گی: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی''۔ اگرچہ لفظ ''صبر'' عام ہے لیکن درحقیقت یہ اسی **صبر علی الطاعة** کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی کی منفی شکل ہے **صبر عن المعصية**۔ اطاعت اور معصیت پر صبر کا اوّلین استحقاق اللہ کا ہے' اس کے بعد رسول ﷺ کا اور پھر تیسرے درجے میں آتے ہیں وہ صاحب امر جو اہل ایمان میں سے ہوں۔

غزوۂ اُحد میں تنازُع فی الامر کا نتیجہ

اب اگر اس آیت کے ساتھ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۲ کو جوڑ لیا جائے تو مضمون نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ یوں سمجھئے کہ غزوۂ اُحد کا واقعہ مذکورہ بالا آیت کی ایک مثال ہے۔ یہ اس درس میں بہت اہم آیت ہے۔ یہاں غزوۂ اُحد کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی' شدید نقصان ہوا' ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے' حضور ﷺ خود مجروح ہوئے' آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' چہرۂ مبارک لہولہان ہوا۔ ''فَتَفْشَلُوْا'' والی بات بھی ہوئی اور ''وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ'' کا نقشہ بھی سامنے آیا۔ یہ سارے نتائج نکلے ہیں۔ لہٰذا ایک عملی مثال سے اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا جائے! اب اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہے ہیں کہ اے

مسلمانو! ذرا غور کرو' ذرا نگاہِ بازگشت ڈالو اور سوچو کہ ایسا کیوں ہوا۔ کیا ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ کیا ہمارا نصرت کا وعدہ غلط تھا؟ کیا ہمیں کافروں سے محبت ہو گئی تھی؟ کیا ہم نے تمہارے مقابلے میں اُن سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا؟ کیا تمہیں ہم نے وَداع کر دیا تھا؟ تم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا؟ 'وَداع' کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے اس کا تعلق سورۃ الضحیٰ سے ہے' جس میں آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝۳﴾ ''آپ کے ربّ نے نہ آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا''۔ وہ ابتدائی مکی دَور ہے' اس میں صیغۂ واحد میں گفتگو ہو رہی ہے۔ یہاں یہی سمجھئے کہ ''مَا وَدَّعَكُمْ رَبُّكُمْ'' کہ تمہارے ربّ نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے۔ تمہارا ربّ تم سے کنارہ کش نہیں ہوا۔ اس میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔ تو اب سمجھو کہ ہوا کیا ہے؟

فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ''اور اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب کہ تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے اللہ کے حکم سے''۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ذہن میں رہے کہ تم سے وعدہ خلافی نہیں ہوئی ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝۸۷﴾ (النساء) ''اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے؟'' اور: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ''اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہوگا؟'' تو وعدہ خلافی تو قطعاً نہیں ہوئی' بلکہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اہل ایمان کو پہلے ہی ریلے میں فتح حاصل ہو گئی تھی۔ کفار بڑے لاؤ لشکر اور سامان کے ساتھ آئے تھے۔ کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی نسبت پہلے ہی ایک اور تین کی تھی اور اب منافقین کے واپس چلے جانے کے بعد ایک اور چار کی ہو چکی تھی' اس کے باوجود اللہ کا وعدہ صد فیصد درست ثابت ہوا' لیکن یہ واضح فتح شکست میں کیوں بدلی' اس کو ذرا سمجھو! فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے نظم کو ڈھیلا کر دیا) اور تم نے امر میں جھگڑا کیا (کھینچ تان کی)''۔ اب دیکھئے سورۃ الانفال کی آیت ۴۶ والے الفاظ ہی یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ میں نے اسی لیے وضاحت میں ''نظم کو

ڈھیلا کرنا'' اور ''تنازُع'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں' تا کہ ایک شے کی حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ اسے فقہ اللغۃ کہتے ہیں کہ لغت کے اندر بصیرت کا حاصل ہو جانا۔ یعنی ایک لفظ کا مفہوم' اس کی مراد' اس کے مجازی معنی اور اس کے حقیقی معنی کو سمجھنا۔ ہر لفظ کا ایک باطن ہوتا ہے' اسے سمجھ لینے سے بصیرتِ باطنی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ اُحد سے پہلے نازل ہوئی ہے جس کی آیت ۴۶ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ وہاں مسلمانوں کو پیشگی حکم دیا گیا تھا کہ: ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو!'' اور پیشگی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی: ﴿فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ﴾ ''ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہوا کہ پیشگی متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ لیکن پھر تم نے (غزوۂ اُحد کے موقع پر) نظم کو ڈھیلا کیا اور امر میں جھگڑا کیا' کھینچ تان کی۔ یہ کس کا امر تھا جس میں جھگڑا ہوا اور کھینچ تان ہوئی؟ اسے بھی تنقیح کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ اصلاً تو امر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تھا جو اُس وقت سپہ سالارِ اعلیٰ ہیں۔ یہ کوئی نص کا معاملہ نہیں تھا' بلکہ تدبیر سے متعلق معاملہ تھا کہ اس درّے سے یہ پچاس تیر انداز ہرگز نہ ہٹیں۔ لیکن اپنی بات کی تاکید کے لیے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ ''خواہ تم یہ دیکھو کہ ہم سب شہید ہو گئے ہیں اور پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا''۔ یہ انتہائی تاکیدی الفاظ ہیں۔ اب وہاں پچاس افراد ہیں اور ان کا ایک کمانڈر ہے۔ اب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ وہاں موجود نہیں ہیں۔ اب صورت یہ ہوئی کہ فتح ہو گئی۔ اب تاویل کا اختلاف ہو گیا۔ اکثر تیر اندازوں نے کہا کہ اب تو فتح ہو گئی' کس لیے یہاں کھڑے ہو' چلو یہاں سے! جبکہ ان کا کمانڈر انہیں روک رہا ہے کہ دیکھو' رسول اللہ ﷺ کے حکم کو یاد کرو۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ وہ حکم تو اُس وقت تھا اگر شکست ہوتی' سب مارے جاتے' سب شہید ہو جاتے۔ اب تو فتح ہو گئی ہے' یہ حکم اب یہاں پر نافذ نہیں ہو رہا ہے۔ اب پہلے درجے میں یہ دیکھئے کہ یہ نص کا نہیں' بلکہ

تدبیر کا معاملہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تدبیر کے معاملے میں بھی معصیتِ صریحہ نہیں ہے' بلکہ تاویل ہے۔ اس تاویل کی وہ مثال بھی ذہن میں رکھئے گا کہ ''عصر کی نماز نہ پڑھنا جب تک بنوقریظہ کے ہاں نہ پہنچ جاؤ''۔ اس کی دونوں تاویلیں ہوئیں۔ ایک تاویل یہ ہوئی کہ عصر کی نماز سے پہلے پہلے بنوقریظہ تک پہنچنا لازمی ہے اور دوسری یہ کہ بنوقریظہ کے ہاں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ اور دونوں کو حضور ﷺ نے مساوی قرار دیا۔ تو یہ تاویل کی بات ہے۔ لیکن اب تیسرے درجے پر آئیے! اگر کمانڈر یہ تاویل قبول کر لیتا تو یہ تاویل کی بات ہو جاتی' لیکن کمانڈر نے قبول نہیں کی تو اب لازماً کمانڈر کا حکم چلے گا۔ یہاں معاملہ نظم کا ہے۔ جسے امیر بنایا گیا تھا تاویل تو اس کی چلنی تھی نہ کہ مأمورین کی۔ لہٰذا معصیت ہوئی تو اس کمانڈر کی۔

یہاں میں نے معاملے کو کتنا dilute کر دیا۔ یہاں معاذ اللہ' اللہ کے حکم کی یا رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ یہاں معاملہ نصوص کا نہیں' تدبیر کا ہے اور تدبیر میں بھی کھلم کھلا سرتابی نہیں ہے' بلکہ تاویل ہے۔ تاویل اگر کمانڈر کی ہوتی تو یہ غلطی نظر انداز ہو جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نظر انداز فرما دیتا۔ لیکن وہاں نظم ٹوٹا ہے' کمانڈر کا حکم نہیں مانا گیا اور ۳۵ تیر انداز وہاں سے چلے گئے' ۱۵ رہ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اصلاً مطلوب یہ ہے کہ اس کا تجزیہ کر کے' تنقیح کر کے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

مؤمن کا نصب العین۔ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی

آگے فرمایا: ﴿وَعَصَیۡتُمۡ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی''۔ میں صراحت کر چکا ہوں کہ نافرمانی اللہ اور اس کے رسول کی نہیں' بلکہ کمانڈر کی ہوئی ہے جس پر گرفت کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ بیعت میں یہ بھی کہا گیا ہے: اَنۡ لَّا نُنَازِعَ الۡاَمۡرَ اَہۡلَہٗ ''کہ ہم اصحاب امر سے نہیں جھگڑیں گے (کھینچ تان نہیں کریں گے)'' اب گویا تم نے اس میں معصیت کی ﴿مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ﴾ ''اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں پسند ہے''۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اس

سے مراد مالِ غنیمت ہے۔ یہ مالِ غنیمت والی بات تو بالکل ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ مالِ غنیمت کا مسئلہ اُس وقت تو ہو سکتا تھا اگر غزوۂ بدر کی بات ہوتی' جبکہ ابھی مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون نہیں آیا تھا۔ اُس وقت تک یہ روایت تھی کہ جو بھی شخص جتنا مال بھی جمع کر لے گا وہ اسی کا ہے۔ تو ہر شخص کے اندر خود بخود ایک طلب (urge) پیدا ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے۔ اس صورتِ حال میں کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ ہم یہاں کھڑے رہ گئے تو ہمارے ہاتھ پلّے کچھ پڑے گا نہیں۔ لیکن سورۃ الانفال میں مالِ غنیمت کا حکم تو بیان ہو چکا تھا اور حضورﷺ اس پر عمل کر چکے تھے۔ مالِ غنیمت کے بارے میں حکم یہ تھا کہ سارا مال جمع ہو گا' اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہو گا اور بقیہ سارا مال مجاہدین میں مساوی تقسیم کیا جائے گا۔ اور اس تقسیم میں بھی فرق یہ ہو گا کہ پیدل کے لیے اکہرا اور سوار کے لیے دوہرا حصہ ہو گا' چاہے کوئی پہرے پر ہی کھڑا رہا ہو اور اس نے تلوار اٹھائی ہی نہ ہو۔ بلکہ حضورﷺ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ لگایا اگرچہ وہ وہاں شریک بھی نہیں تھے' کیونکہ وہ حضورﷺ کے حکم سے مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کو بھی اس غزوہ میں شریک فرض کیا گیا۔

تو جب یہ قانون آ چکا تھا تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ وہاں جاتا کہ مال جمع کرے؟ اس خیالِ خام کو ذہن سے نکال دیجیے۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بڑا سوءِ ظن پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تو ابھی سن ۳ ہجری کا واقعہ ہے اور اس میں تمام سابقون الاوّلون شریک ہیں۔ اس میں تو منافقین شریک بھی نہیں ہوئے تھے' بلکہ عبداللہ بن اُبی کے ساتھ میدان چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ سن ۱۰ یا ۱۱ کی بات ہوتی تو کسی قدر قابلِ التفات ہوتی کہ اب تو بہت کچے پکے لوگ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ جبکہ یہ تو خالص لوگ تھے۔ ان سے یہ سوءِ ظن بہت بڑی غلطی ہے جن لوگوں کے ذریعے سے بھی پھیلی ہے۔ اصل بات کیا تھی؟ سورۃ الصّف کی آیت ۱۳ سے یہ بات کھل رہی ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ﴾ ''ایک اور چیز جو تمہیں پسند ہے' (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور فتح جو قریب ہے''۔ یہ

فتح کی طلب اور فتح کی قدر و قیمت ہے جس سے تم ڈھیلے پڑتے ہو۔ حالانکہ ع

''شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر!''

اصل کامیابی تو یہ ہے کہ تم بس اللہ کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دو۔ جہاں تمہارے اندر جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کی طلب پیدا ہو جائے گی' یا تم عجلت پسندی کا شکار ہو جاؤ گے' یا کوئی راہِ یسیر (شارٹ کٹ) تلاش کرو گے' ٹیڑھی انگلیوں سے مکھن نکالنے کی کوشش کرو گے تو نتیجتاً اصل منزل سے ہٹ جاؤ گے۔ یہ ساری حماقتیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ دُنیوی فتح محبوب ہے۔ دنیاوی سطح پر کامیاب ہو جانا' اس کی نگاہ کے اندر اہمیت پیدا ہو گئی ہے اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ غزوۂ اُحد میں بھی غلطی اسی بنیاد پر ہوئی۔ یہ بات بالکل نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ جب آپ طے کرتے ہیں کہ آپ کو سو (۱۰۰) میل جانا ہے تو آپ شاید ۸۰ یا ۹۰ میل پر جا کر کچھ ڈھیلے پڑیں کہ اب تو منزل قریب آ گئی ہے۔ اور اگر آپ نے اپنی منزل ہی ۲۰ میل پر متعین کر لی ہے تو یہی کیفیت ۱۷'۱۸ میل پر پیدا ہو جائے گی۔ کسی شخص کی اپنے کام کے لیے جتنی مطابقت (adjustment) ہوتی ہے اس کے اندر اتنے ہی عرصہ کے لیے چاک و چوبند ہونے اور آمادۂ عمل رہنے کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ اور منزل پر پہنچ کر تو آدمی ڈھیلا پڑتا ہی ہے۔ اس کے بعد تو اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں' آدمی کپڑے اتارتا ہے اور پُرسکون (relax) ہو جاتا ہے کہ اب پہنچ گئے۔ تو یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اس relaxation کے تحت نظم کو ڈھیلا کیا ہے۔ جس انداز سے میں نے یہ آیت سمجھائی ہے اس طرح حقیقت کے اعتبار سے ہمیں جو سبق لینا ہے وہ ہمیں پورا مل جائے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سوءِ ظن بھی نہیں رہے گا۔

اسی آیت میں آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ ''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے''۔ اب اس کی تاویل بھی ہم اسی طور سے کریں گے کہ تم میں وہ بھی ہیں جو دنیا میں فتح کے طالب ہیں اور وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔ جبکہ اصل کامیابی تو

آخرت کی کامیابی ہے۔ جیسے سورۃ التغابن میں آیا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ (آیت ۹) ’’جس دن (اللہ) تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن وہ ہوگا اصل ہار اور جیت کے فیصلے کا دن‘‘۔ ہار اور جیت کا فیصلہ تو وہاں ہوگا‘ یہاں کی ہار ہار نہیں‘ یہاں کی جیت جیت نہیں۔ کتنے ہیں جو جیت کر ہارتے ہیں اور کتنے ہیں جو ہار کر جیتتے ہیں۔ سورۃ التغابن کے یہ الفاظ اپنے دل پر نقش کر لیجیے۔ یہاں کی فتح کا تصور ہی نہ رکھو۔ اس دنیا کی کامیابی کی کوئی غرض ہی نہ رکھو! بلکہ احساسِ فرض کے تحت حرکت کرو۔ دنیا میں کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے اور کتنے فیصد نہیں ہے‘ یہ حساب کتاب اس راستے پر نہیں چلے گا۔ صد فیصد ناکامی کا یقین ہو پھر بھی انسان اس راہ پر چلے گا اگر اس کا مطلوب صرف آخرت ہو۔ یہی بات تھی کہ جنگ موتہ کے موقع پر صرف تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ سے ٹکرا گیا تھا۔ اور وہ کسی ایک شخص کا فیصلہ بھی نہیں تھا‘ بلکہ اس ضمن میں باقاعدہ مشورہ ہوا ہے‘ باقاعدہ تقریریں ہوئی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ یہ معاملہ درست نہیں ہے‘ کیونکہ نسبت تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے‘ ایک اور تینتیس کی نسبت ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا‘ اور ان کی رائے مانی گئی‘ کہ ہمارا مطلوب ومقصود فتح کب ہے؟ ہمارا مطلوب ومقصود تو شہادت ہے!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

لہٰذا وہاں افہام وتفہیم سے بات طے ہوئی‘ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی سرزنش نہیں کی گئی‘ بلکہ مسلمانوں نے اس بات پر سرزنش کی کہ یہ لوٹ کر کیوں آئے؟ لوگوں نے ہاتھوں میں ریت اٹھا کر لوٹنے والوں کے چہروں پر پھینکی۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کا دفاع کیا اور فرمایا کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کی‘ بلکہ ان کا معاملہ ’’مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَـةٍ‘‘ والا ہے‘ یعنی اپنی اصل قوت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ ہے‘ تاکہ پھر سے طاقت لے کر آئیں اور حملہ کریں‘ یہ فرار نہیں ہے۔

بہرحال اس فرق کو ذہن میں رکھیے! اسی لیے ہم اتنی وضاحت سے بحث کرتے ہیں کہ ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح ہے۔ نصب العین انقلاب یا اقامت دین اور دین کا غلبہ نہیں ہے۔ جہاں یہ چیزیں نصب العین کے درجہ میں آئیں گی وہاں حماقتیں لازماً ہوں گی‘ غلطیاں لامحالہ ہوں گی۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ﴾ ’’پھر اللہ نے تمہیں پھیر دیا اُن سے‘ تاکہ تمہیں آزمائے‘‘۔ دیکھئے عجیب انداز ہے کہ ’’تمہیں پھیر دیا اُن سے‘‘۔ مطلب یہ کہ تم دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ اب ہوا یہ کہ تم جس کی قوت سے یہ سب کچھ کر رہے تھے اب اس قوت نے گویا تمہارا رُخ پھیر دیا۔ کفار نے تمہارا رُخ نہیں پھیرا‘ یہ رُخ اس نے پھیرا ہے‘ تاکہ تمہیں جانچے‘ پرکھے‘ تمہیں ابتلاء میں ڈالے‘ تاکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور تم آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر سکو۔ تمہاری اس غلطی سے درگزر بھی کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں اُس وقت کوئی سزا نہ دی جاتی‘ لیکن پھر یہ غلطی تمہارے اندر راسخ ہو جاتی۔ پھر تمہارا ڈھیلا پن مستقل ہو جاتا۔ تمہیں سبق سکھانا مقصود تھا‘ تمہاری تربیت پیشِ نظر تھی‘ تمہاری اصلاح مقصود تھی۔ سرزنش اس لیے ضروری تھی تاکہ ایک دفعہ بات واضح ہو جائے کہ نظم کسے کہتے ہیں‘ ڈسپلن کے کیا معنی ہیں‘ اطاعتِ امر کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے۔ یہاں ’’لِيَبْتَلِيَكُمْ‘‘ کا لفظ آیا ہے کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے۔ بَلَا‘ يَبْلُوْ آزمائش کے لیے آتا ہے۔ اسی سے ابتلاء بنا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک: ۲) ’’اللہ نے موت اور حیات کو پیدا فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والا ہے‘‘۔

اہل ایمان کی تسلی کے لیے آگے فرمادیا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ ’’اور واقعی وہ تمہیں معاف فرما چکا‘‘۔ اب تمہارے لیے آخرت کی کوئی سزا نہیں ہے‘ جو بھی سرزنش تھی یہاں ہوگئی۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور اللہ اہل ایمان پر بہت بڑے فضل والا ہے‘‘۔

''اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ'' کا مفہوم

سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۵۴ میں الفاظ ہیں: ﴿يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ﴾ ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی امر میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' یعنی ہماری بھی کوئی بات مانی جائے گی یا نہیں؟ کوئی ہماری بھی رائے چلے گی یا نہیں؟ یہ انسان کی طبعی و فطری کمزوری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھی اختیار ہو‘ میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ یہی وہ sense of participation ہے جسے ملحوظ رکھنا حکومت اور ریاست کی سطح پر بہت ضروری ہے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے‘ ہم اس میں شرکت (participate) کر رہے ہیں‘ ہماری رائے سے فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی سطح پر‘ اُس نظم میں جو بیعتِ سمع و طاعت پر قائم ہو‘ یہی چیز سب سے بڑی مہلک شے بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی اس بات کا کہ ''اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' جو جواب دیا گیا وہ بڑا عجیب ہے: ﴿قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ یقیناً امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اس جواب پر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو رسول کے حکم سے اختلاف کیا تھا‘ اللہ کے حکم سے کب کیا تھا؟ یہ تو رسول کا اجتہادی حکم تھا۔

اس کا پس منظر ذہن میں رکھئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ۳۰۰ ساتھی کیوں واپس گئے تھے؟ اس لیے کہ اُس نے یہ رائے دی تھی کہ مدینہ میں محصور رہ کر دفاع کیا جائے۔ جیسے کہ دو سال بعد غزوۂ احزاب میں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے بارہ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی‘ لیکن آپؐ نے صحابہ کرام ؓ کے جوشِ ایمان اور ذوقِ شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی رائے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اب دیکھئے۔ اوّلاً یہ اللہ کا حکم نہیں تھا‘ ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ رائے نہیں تھی۔ ہاں‘ رسولؐ نے جو فیصلہ کر دیا یہ اس کی مخالفت ہے۔ اگرچہ رسولؐ نے اپنی رائے کو پس پشت رکھ کر اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا‘ لیکن اب اس سے اختلاف رسول

اللہ ﷺ کے فیصلے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو واضح کر دیا گیا کہ چاہے یہ اتنا سا معاملہ ہے‘ لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی معصیت ہے‘ یہ اللہ کے اختیار کو چیلنج کرنا ہے۔ ایک سپاہی جب یونیفارم میں ہے تو وہ حکومت کا نمائندہ ہے‘ اس کی توہین حکومت کی توہین ہے اور اس کی اطاعت حکومت کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک حکومتی نظم کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اگر وہ وردی میں نہیں تو عام انسان ہے‘ اس کے ساتھ آپ کا جھگڑا ذاتی سطح پر شمار ہوگا‘ لیکن اگر وہ وردی اور پیٹی میں ہے تو اسے چیلنج کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ لہٰذا یہ نظم کا معاملہ ہے۔ اور جب یہ اس سطح پر آئے گا تو بات اللہ تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ امر کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ ہم ابھی سورۃ النساء کی آیت میں ''اُولِی الۡاَمۡرِ'' کے الفاظ پڑھ کر آئے ہیں‘ یعنی تم میں سے جو اصحابِ امر ہیں۔ بظاہر تو یہاں تضاد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرما دیا: ﴿قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ امر کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے!'' تو اس تضاد کو جو بظاہر پیدا ہو رہا ہے‘ رفع کر لیجیے۔ درحقیقت اس chain کے ساتھ اگر کوئی امر آ رہا ہے تو وہ حقیقتاً اللہ کا ہے‘ وہ علیحدہ نہیں رہا۔ اللہ کا رسول حکم دے رہا ہے تو اللہ کا حکم ہے۔ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے نیچے جو نظمِ جماعت بنا ہے اس کا حکم بھی اللہ کا حکم ہے ؏

''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!''

آیۂ استخلاف کے مضامین کا اجمالی جائزہ

آج کے درس کے ضمن میں آخری مقام سورۃ النور کی تین آیات (۵۴ تا ۵۶) پر مشتمل ہے۔ اس میں سے اکثر حصے کا مفہوم تو ہمارے سامنے آ چکا ہے‘ صرف ایک نکتہ ہے جس کی وضاحت درکار ہے‘ باقی ہم صرف ترجمہ کریں گے۔ فرمایا: ﴿قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی''۔ اب یہاں ہر جگہ پر مقدر (understood) مانیے: ﴿وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ آگے فرمایا: ﴿فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيۡكُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ﴾ ''پھر اگر وہ روگردانی کریں (پیٹھ موڑ لیں) تو

جان لو کہ رسولؐ پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ اس پر ڈالا گیا ہے اور تم پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ تم پر ڈالا گیا''۔ صاحب امر بھی اللہ کے ہاں مسئول ہے اور تم بھی اللہ کے ہاں مسئول ہو۔ رسول کے ذمہ ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا ہے اور تمہارے ذمہ اسے قبول کرنا ہے۔ اگر بالفرض ابلاغ میں کمی رہی تو رسول پکڑے جائیں گے اور اگر انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تو رسول بری ہو جائیں گے اور اب ساری پُرسش تمہاری ہوگی۔ اسی طرح امراء کے ذمے جو بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ ان کے مسئول ہیں' انہوں نے جلد بازی میں فیصلہ کر لیا تو اپنی جواب دہی اللہ کے یہاں کریں گے' انہوں نے تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا تو وہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے' لیکن اگر مأمورین نے اپنے فرائض ادا نہ کیے تو اُن کی پُرسش ہوگی۔ دنیا میں کوئی چیز یک طرفہ تو ہوتی نہیں۔ اگر مأمورین کے کچھ فرائض ہیں تو امراء کے بھی فرائض ہیں اور امراء کے حقوق ہیں تو مأمورین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ کو مرتکز کرے' اپنے حقوق کی طلب پر توجہ کا ارتکاز نہ کرے۔ اگر کوئی حق مارا گیا تو دنیاوی اعتبار سے تو نقصان ہے' مگر اُخروی اعتبار سے نفع ہے۔ ذمہ داری تو اس پر ہے جس نے آپ کا حق مارا ہے۔ آخرت میں جا کر لین دین ہو جائے گا' حساب کتاب ہو جائے گا۔ وہاں تم کچھ حاصل ہی کرو گے' ہاتھ سے کچھ دینا نہ پڑے گا۔ اگر اصل ''یوم التغابن'' آخرت ہے تو تمہارے لیے یہ نفع کا سودا ہے' نقصان کا تو نہیں۔

یہاں سورۃ الاعراف کی یہ آیت بھی پیشِ نظر رکھئے جو تصورِ شہادت علی الناس کے ضمن میں بہت اہم ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۶﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی''۔ رسول بھی تو مسئول ہے' وہ بھی بندہ ہے (وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) پھر ان کے نیچے جو بھی نظمِ جماعت کے صاحبِ امر ہوں گے وہ بھی غیر معصوم انسان ہیں' ان سے بھی خطا اور نسیان کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ لہٰذا

سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ تم اپنی ذمہ داری کو دیکھو کہ کیا ہے' اس میں تو کوئی کمی نہیں کر رہے؟ اس کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔

﴿وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ﴾ ''اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے''۔ ﴿وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۵۴﴾ ''اور رسول کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف پہنچا دینا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے......'' میں نے ''یعنی'' کے ساتھ ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ یہاں ''مِنْ'' تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ اس وعدہ کے اوّلین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے کہ بعض کے ساتھ یہ وعدہ ہو اور بعض کے ساتھ نہ ہو' بلکہ مِنْ بیانیہ ہے کہ تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں۔ البتہ ان کے بعد سب کے لیے یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو بھی جماعت قائم ہو جائے اور جو لوگ بھی اس کام کے لیے کمر کس لیں اُن سے یہ وعدہ ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ اللہ کا وعدہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ مشروط ہوگا۔ حتمی اور قطعی وعدہ اور بشارت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تھی۔ بعد کا معاملہ مشروط رہے گا۔ جو جس درجہ میں ان تقاضوں کو پورا کرے گا اسی درجہ میں وہ اس وعدہ کا مصداق بننے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اور پھر بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جماعت اپنے تئیں یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر رہی ہے' لیکن ابھی اس کا اقتدار اللہ کی حکمت اور مصلحت میں نہ ہو۔ ابھی کوئی کمی ہے جسے اللہ جانتا ہے۔ تم تو اپنے آپ کو کامل سمجھ رہے ہو مگر اللہ جانتا ہے کہ تم کتنے کچھ کامل ہو اور کتنے کچھ نہیں ہو۔ ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲﴾ (النجم) ''اپنے آپ کو نفس مزکی نہ سمجھا کرو' وہ جانتا ہے اس کو جو واقعی متقی ہے''۔ بہرحال اللہ کا یہ وعدہ اُن لوگوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر دیں گے۔ یہاں اپنے ذہن میں سورۃ العصر کے مضامین تازہ کیجیے اور

پھر پورا منتخب نصاب ذہن میں لے آیئے۔ عمل صالح سے مراد صرف نماز، روزہ اور نوافل نہیں، بلکہ عمل کا پورا ایک جامع تصور ہے۔ ایمان بھی صرف زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ اس کے عملی تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ نے ان سے کیا وعدہ کیا ہے: ﴿لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪﴾ ''وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی''۔ یہ آیت مبارکہ خاص طور پر یہاں شامل کی گئی ہے، ورنہ پہلی آیت پر ہمارا یہ درس مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت اہم آیت ہے اور یہ خلافت راشدہ کی حقانیت پر اہل تشیع کے خلاف برہانِ قاطع ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ جن حضرات سے پورا ہوا کیا وہ ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین معیار پر نہیں ہوں گے؟ یا پھر (معاذ اللہ) اللہ کا وعدہ جھوٹا ہے اور اللہ منافقوں کے ساتھ یہ وعدہ کر رہا ہے؟ یہ خلافت بالفعل قائم ہوئی یا نہیں ہوئی؟ یہ تو تاریخی واقعہ ہے، اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ تو کن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا؟ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ یہ آیت ان کے غلط فلسفے اور گمراہ کن نظریات کے پورے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دینے والی ہے۔

اس وعدۂ استخلاف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ﴾ ''اور وہ لازماً تمکن عطا فرمائے گا (زمین میں جما دے گا) اُن کے لیے اُن کے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرما لیا ہے''۔ یہ الفاظِ مبارکہ خلافت راشدہ کے لیے بھی سند ہیں اور خلفاء راشدین کے لیے بھی۔ ﴿وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ﴾ ''اور لازماً بدل دے گا اُن کے خوف کی اس کیفیت کے بعد اُس کو امن کی ایک حالت سے''۔ ان الفاظ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جن حضرات کی رائے میں حضرت علی ؓ کا عہدِ خلافت، خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں ہے، ان کے موقف کے لیے بھی دلیل موجود ہے۔ اس لیے کہ اس پورے عرصے میں امن نہیں تھا، یہ جنگ و جدال کا دَور تھا، تلواریں ایک دوسرے کے خلاف چلتی

رہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہت منطقی انسان تھے۔ انہوں نے دو باتوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا کہ ایک شخص کا اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہونا اور ہے، جبکہ اس کے عہد خلافت کا خلافت راشدہ میں شامل ہونا اور ہے۔ چنانچہ حضرت علی ؓ اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہیں، خلافت راشدہ کے تمام معیارات ان کی ذات کی حد تک پورے ہیں، لیکن ان کا عہد حکومت اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ ایک تو اس عرصے میں افتراق رہا اور اس دَور میں عالمِ اسلام ایک وحدت نہیں رہا۔ دوسرے یہاں امن کی کیفیت نہیں تھی۔

آگے فرمایا: ﴿یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِكُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ؕ﴾ ''وہ میری ہی بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گے''۔ یہ بہت بڑی بڑی بشارتیں ہیں اور دورِ خلافت راشدہ کے چوبیس برس اس کا مصداقِ اَتم اور مصداقِ کامل ہیں۔ بعد میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ عمارت یک دم بالکل ہی زمین بوس ہوگئی ہو، بلکہ درجہ بدرجہ نیچے آئی ہے۔ لیکن ایک آئیڈیل اور ہر اعتبار سے دورِ نبوت کا عکسِ کامل یہ چوبیس یا ساڑھے چوبیس برس تھے۔ ﴿وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور جو اِس کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہی لوگ درحقیقت فاسق ہیں''۔ یہاں ''بَعۡدَ ذٰلِكَ'' سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس وعدے کے بعد بھی! اللہ کا اتنا پختہ وعدہ، اللہ کی طرف سے اتنی موثّق توثیق اور پھر بھی کوئی کفر کرے! اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب دین اس طرح غالب ہو چکا ہو اور امن قائم ہو چکا ہو، فتنہ باقی نہ رہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی غلط راستے پر چلتا ہے تو وہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس میں خیر کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔

آخری آیت میں فرمایا: ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ......﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو......''۔ ہمارے آج کے درس کے خاتمے کے لیے یہ نہایت جامع اور نہایت موزوں الفاظ آ گئے ہیں۔ یہاں سورۃ الحج کی آخری دو آیات ذہن میں تازہ کیجیے، جن میں ایمان کے منطقی تقاضے بیان کیے گئے ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ۷۷﴾ وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ...... الخ﴾ دین کے عملی تقاضوں کی آخری سیڑھی

جہاد فی سبیل اللہ ہے جسے آنحضور ﷺ نے دین کا ''ذروۃ السنام'' قرار دیا ہے' لیکن عمل کے زینے کی پہلی سیڑھی فرائض دینی کی بجا آوری اور ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے فرمایا: ''رکوع کرو اور سجدہ کرو''۔ پہلی سیڑھی پر قدم جماؤ گے تو دوسری پر چڑھنے کا امکان ہوگا۔ اگر یہیں پر قدم لرز رہے ہیں اور آپ کو استقامت حاصل نہیں تو اگلی کا کیا سوال؟ اسی لیے وہاں آخر میں پھر فرمایا: ﴿فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ؕ ہُوَ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ ﴿۷۸﴾﴾ ''پس قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑو اللہ (کی رسی) کو' وہ تمہارا مالک ہے' سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار''۔ یعنی اگر یہ سارا تصورِ دین سمجھ آ گیا اور تین منزلیں ذہن میں جم گئیں تو بسم اللہ کرو۔ کہاں سے کرو گے؟ قائم کرو نماز 'ادا کرو زکوٰۃ! پہلی سیڑھی تو وہی ہوگی۔ ستون ڈالو گے تو چھت کا امکان ہے۔ پہلی منزل بنے گی تو دوسری کا امکان ہے اور دوسری بنے گی تو تیسری کا امکان ہے۔ لہٰذا وہاں (سورۃ الحج میں) جو ترتیب تھی وہی یہاں (سورۃ النور میں) ہے: ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ واضح رہے کہ یہاں رسولؐ کی اطاعت صرف رسول کی حیثیت میں مراد نہیں ہے' بلکہ امیر کی حیثیت میں بھی' سپہ سالار کی حیثیت میں بھی' چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں بھی اور چیف جسٹس کی حیثیت میں بھی مراد ہے۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں: ﴿وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے!''

اللھم ربنا اجعلنا منھم' اللھم اغفرلنا وارحمنا واھدنا وعافنا وارزقنا' انت ولینا فی الدنیا والآخرۃ' توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین برحمتك یا ارحم الراحمین OO

درس ۸

جماعتی زندگی کے مہلک ترین مرض

نجویٰ

کی حقیقت اور اللہ کی جانب سے اس کی شدید مذمت

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَلَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نُہُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ وَیَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَمَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوۡکَ حَیَّوۡکَ بِمَا لَمۡ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ وَیَقُوۡلُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ لَوۡلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُہُمۡ جَہَنَّمُ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۸﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَنَاجَیۡتُمۡ فَلَا تَتَنَاجَوۡا بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَمَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ وَتَنَاجَوۡا بِالۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا النَّجۡوٰی مِنَ الشَّیۡطٰنِ لِیَحۡزُنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیۡسَ بِضَآرِّہِمۡ شَیۡئًا اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَکُمۡ تَفَسَّحُوۡا فِی الۡمَجٰلِسِ فَافۡسَحُوۡا یَفۡسَحِ اللّٰہُ لَکُمۡ ۚ وَاِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿11﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ
فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ
لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿12﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ
نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿13﴾ ﴾ (المُجادلة)...... صدق اللّٰہ العظیم

دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے خلاف شیطان کے ہتھکنڈے

دینی مقاصد اور بالخصوص اقامت دین کے لیے جو بھی ہیئتِ اجتماعیہ وجود میں آتی ہے وہ یقیناً شیطان کی دشمنی کے لیے اور اسے للکارنے کے لیے ہی وجود میں آتی ہے' لہٰذا شیطان کے حملے کا سب سے بڑا نشانہ اور ہدف بھی وہ اجتماعیت ہی بنتی ہے۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو شیطان کے حملہ آور ہونے کے مختلف راستے ہیں۔ اوّلاً اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس ہیئتِ اجتماعیہ میں شریک ہر فرد کے دل میں وسوسہ اندازی کرے اور اس کے نفسانی داعیات اور محرکات کو مشتعل کرے۔ یہ کوشش تو شیطان ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے کرتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ ایسے اشخاص کے لیے جو کسی ایسی اجتماعیت میں شریک ہوں جو شیطان کو للکارنے کے لیے وجود میں آئی ہو' اس کی یہ کوششیں دوچند ہو جائیں گی۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ ایسے اشخاص کے باہمی رشتے کو کمزور کرنے' ان کی جمعیت میں رخنے ڈالنے' ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں کدورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' تاکہ یہ بنیانِ مرصوص نہ بن سکیں' ان کے مابین ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں پیدا ہوں اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت پیدا ہو جائے۔ یہ شیطان کی دوسری کوشش ہے۔ تیسری کوشش اس کی خاص طور پر یہ ہوتی ہے کہ اس اجتماعیت کے نظم کو بگاڑے اور اس نظم میں امیر اور مأمورین کے مابین جو ربط و تعلق

ہے' اسے خراب کرے۔ اصل میں تو امیر اور مأمورین کے مابین یہ تعلق ہی ہے جو کسی نظم کے مؤثر ہونے میں سب سے زیادہ مفید ہے اور یہی چیز فیصلہ کن بھی ہے۔ تو اس اعتبار سے اس کا تیسرا حملہ اس تعلق کو کمزور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تو ہمارے اصل منتخب نصاب کے مختلف اسباق اور حصوں میں زیر بحث آتی ہے' دوسرا معاملہ بھی بالخصوص سورۃ الحجرات میں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے ضمن میں جو مثبت احکام دیے گئے اور جن چیزوں سے روکا گیا ان کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ میں عام طور پر درس کے دوران یہ واضح کیا کرتا ہوں کہ اس کی کیا اہمیت ہے' مسلمانوں کی یہ شیرازہ بندی کیوں مطلوب ہے' اس میں پیدا ہونے والے رخنوں کا سدّباب اتنا اہم کیوں ہے کہ اس کے لیے قرآن حکیم میں اس قدر اہتمام سے احکام دیے گئے ہیں؟ سورۃ الحجرات میں دو بڑے احکام نازل ہوئے ہیں اور ساتھ ہی دو آیات (۱۱'۱۲) میں چھ نواہی نازل ہوئے ہیں۔ جن چھ کاموں سے خاص طور پر روکا گیا ہے وہ یہ ہیں: تمسخر و استہزاء' عیب جوئی کرنا' ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارنا' سوءِ ظن پیدا کرنا' کسی کی برائی تلاش کرنے کے لیے اس کی ٹوہ میں لگے رہنا اور غیبت کرنا۔ اس لیے کہ ایک دوسرے کے مابین بدگمانی پیدا کرنا' دلوں کو پھاڑ دینا' کدورتیں پیدا کرنا' حسنِ ظن ختم کر کے سوءِ ظن کے بیج بو دینا' یہ تمام چیزیں خطرناک ہیں۔ درحقیقت ان کی اصل اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ کسی بھی فصیل کی مضبوطی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر اینٹ اپنی جگہ پختہ ہو اور دوسرے ان اینٹوں کو جوڑنے والا مواد یعنی سیمنٹ مضبوط ہو۔ اینٹوں کا پختہ ہونا انفرادی سیرت و کردار کی پختگی کا پروگرام ہے جو ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کا موضوع ہے۔ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے' مضبوط کرنے اور ان میں کسی رخنے کو راہ نہ پانے دینے کے ضمن میں احکامات سورۃ الحجرات میں آ گئے کہ اس اجتماعیت میں شریک افراد کے مابین اگر کہیں اختلاف ہو تو اسے فوراً رفع کرنے کی کوشش کرو' افتراق کی روش درست نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کی افواہوں پر اعتماد نہ کرو' بلکہ

افواہوں کی روک تھام کرو۔

یہ دو حکم تو بڑے ہیں۔ ان کے علاوہ جو چھ نواہی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کا استہزاء نہ کرو' تمسخر نہ کرو۔ بسا اوقات آدمی اپنے کسی دوست اور رفیق سے یوں ہی لائٹ موڈ میں کوئی بات کرتا ہے اور اس سے اس کا دل دکھانا مقصود نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ممکن ہے وہ دوست اس سے قبل دس بار وہ بات ہنس کر ٹال چکا ہو' لیکن عین ممکن ہے کہ گیارہویں مرتبہ وہ بات تیر کی طرح سیدھی اس کے دل پر جا لگے اور اس کا دل زخمی ہو جائے۔ اب نتیجتاً اس سے محبت کا تعلق کمزور پڑے گا اور اس کے دل کی کیفیت کھردری سطح کی مانند ہو جائے گی جس پر اب میل جمنا شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ استہزاء سے بچو۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ﴾ (الحجرات:۱۱) ''اے ایمان والو! (تم میں سے) کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے' ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہوسکتا ہے وہ ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں''۔ یہ تو ایسا حکم ہے جو مَردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے لیے بھی دہرا کر لایا گیا ہے۔ اگلی بات یہ فرمائی کہ: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو (تہمتیں نہ لگاؤ)'' اگر کسی کا واقعی کوئی ایسا معاملہ ہے تو خواہ مخواہ اسے جتلانا درست نہیں ہے' اس سے بھی اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جو باہمی رشتۂ اُلفت کو ختم کر دیتی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ ''اور ایک دوسرے کو (بُرے) ناموں سے نہ پکارو''۔ وہ نام کہ جو خواہ مخواہ کسی کو چھیڑنے کے لیے ہوں ان سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ سوءِ ظن سے بچو! اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو! یقیناً بعض گمان گناہ ہیں''۔ اس سے آگے ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور تجسّس نہ کرو''۔ اگر کوئی ناخوشگوار چیز سامنے

آ بھی گئی ہے تو پردہ پوشی کرو' نہ یہ کہ خود پردے اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرو۔

غیبت = جماعتی زندگی میں رخنہ اندازی کا ایک بڑا ذریعہ

اس سلسلۂ نواہی میں مزید ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''اور تم میں کا ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرے''۔ اس لیے کہ غیبت تو سب سے ثقیل اور قبیح حرکت ہے۔ غیبت یہ ہے کہ اپنے کسی بھائی کی کسی برائی یا عیب کا ذکر اس کی عدم موجودگی میں کرنا۔ ویسے تو یہ باتیں ہمارے عام مجلسی اور معاشرتی آداب میں شامل ہیں' لہٰذا ہر مسلمان کے ساتھ یہی معاملہ کرنا ہے' لیکن اقامتِ دین جیسے عظیم مقصد کے لیے قائم کی گئی جماعت کے رفقاء کے لیے ان احکامات کی ضرورت واہمیت سوگنا بڑھ جاتی ہے اور انہیں ان تمام چیزوں کا سوگنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے' اس لیے کہ یہاں شیطان سوگنا زیادہ زور لگائے گا۔

جماعتی نظم کے حوالے سے غیبت خاص طور پر قابلِ وضاحت ہے۔ جان لیجیے کہ ایک تو تنقید ہوتی ہے کہ کسی کو اس کی کسی کمزوری' کوتاہی اور کسی عیب وغیرہ پر متنبہ اور مطلع کرنا۔ یہ تو اصلاح کے لیے اجتماعیت کی ایک اہم اور ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن اس کے کچھ آداب ہیں۔ اوّلاً یہ کہ آپ اپنے کسی بھائی میں کوئی کمزوری دیکھیں تو خود اُس سے اُس معاملے میں بات کریں' اسے تنہائی میں سمجھائیں اور مطلع کریں' سب کے رُوبرو اُس کا تذکرہ نہ کریں۔ ثانیاً آپ کے انداز میں اس حد تک دل سوزی ہو کہ وہ خود محسوس کرے کہ میرے سامنے یہ بات کر کے اسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی' یہ کوئی لذت نہیں لے رہا' کوئی اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کر رہا اور میری عزتِ نفس کو مجروح کرنا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے' بلکہ یہ فی الواقع دل سے میری اصلاح کا خواہاں اور کوشاں ہے۔ یہ دو شرطیں اگر پوری نہ ہوں تو تنقید مہلک اور مضر ثابت ہوتی ہے اور اپنی افادیت کا پہلو کھو دیتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے تنظیم اسلامی میں یہ بات طے ہے کہ اس سے کسی رفیق کے اخراج کا معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔ کسی شخص کا معاملہ ایسا ہو جس سے تنظیم کی بدنامی کا اندیشہ ہو جائے تو

اس کا اخراج عمل میں آ سکتا ہے۔ کسی ساتھی نے اپنے اس بھائی کی اصلاح کی انفرادی سطح پر پوری کوشش کر لی‘ اس سے بار ہا ملا اور تنہائی میں دل سوزی اور خلوص و اخلاص کے ساتھ گفتگو کی‘ لیکن وہ سمجھ رہا ہے کہ اصلاح کی طرف اس کا کوئی رجحان نہیں ہے اور اس چیز کی اطلاع اصحابِ امر تک پہنچا دینا جماعتی مصلحت کے لیے ضروری ہے اور اس سے مقصود اجتماعیت کو اس کے مضر اور منفی اثرات سے بچانا ہے تو عام رفیق کا کام یہ ہے کہ صاحب نظم کو اس سے مطلع کر کے خاموش ہو جائے۔ دوسرے ساتھیوں میں اس کی برائی کا چرچا کرنا اور لذت لے لے کر اس کا ذکر کرنا انتہائی مہلک شے ہے۔ یہ ہے وہ غیبت جس کے لیے قرآن کریم میں سخت ترین الفاظ آئے ہیں: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾ ’’کیا تم میں سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ اپنے کسی مُردہ بھائی کا گوشت (اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر) کھائے؟ یہ تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے‘‘۔ لیکن تم غیبت کرتے ہو ھَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا‘ خوب لذتیں لے لے کر اور چٹخاروں کے ساتھ۔ تو جماعتی زندگی میں اس چیز کو channelize کرنا ضروری ہے۔ کسی مقامی تنظیم کا امیر اگر اپنے کسی ساتھی میں کوئی کمزوری دیکھتا ہے اور اس نے اپنے اُس ساتھی کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش بھی کر لی ہے مگر وہ اصلاح پر مائل نہیں ہو رہا‘ تو اب اس مقامی امیر کو پہلے تو یہ judgement کرنی ہوگی کہ یہ عام کمزوری اور خامی ہے یا اس نوعیت کی ہے کہ اس سے جماعت کی نیک نامی پر حرف آ سکتا ہے۔ اگر صورت دوسری ہے تو وہ بھی اپنے سے بالاتر اصحابِ امر تک اطلاع پہنچائے اور یوں سمجھے کہ اس کی ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب یہ معاملہ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور وہ اسے کس طور سے نمٹاتے ہیں یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

مرض ’’نجویٰ‘‘ کے اسباب و علامات

پہلی بات تو یہ ہے جو اجمالاً آپ کے سامنے آ گئی کہ اس ہیئتِ اجتماعیہ میں اگر proper channels کا اہتمام نہیں ہوگا تو شیطان کو دلوں کے پھاڑنے اور نفرتوں اور کدورتوں کی فصلیں اگانے کا بڑا موقع ملے گا۔ لیکن یہی مسئلہ جب رفقاء کی جانب

سے امراء کے ساتھ پیش آتا ہے تو اس کا نام ’’نجویٰ‘‘ بنتا ہے۔ اب یہ غیبت سے کئی گنا زیادہ قبیح شے بن جاتی ہے۔ اب تک تو میں نے سورۃ الحجرات میں وارد معاشرتی احکام اور نواہی کا اعادہ کیا ہے کہ ایک مسلمان معاشرے اور مسلمانوں کی ہیئتِ ملّی میں ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اقامت دین کے عظیم مقصد کے لیے قائم اجتماعیت کے لیے اس کی اہمیت سو گنا بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب غیبت کا معاملہ اصحابِ امر کے ساتھ آئے گا تو یہ چیز اس سے بھی سو گنا زیادہ قبیح اور مہلک ہو جائے گی۔ اس کا کیا سبب ہے؟ پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے۔ دراصل امیر اور مأمورین کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں گاہے بگاہے مأمورین کی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا امکان فطری طور پر موجود ہے۔ اوّل تو کسی کا حکم ماننا انسانی طبیعت بالعموم گوارا نہیں کرتی‘ پسند نہیں کرتی۔ انسان کا نفس اسے یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ اصحابِ امر کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں‘ یہ کون سے آسمان سے نازل ہوئے ہیں کہ مجھے حکم دیں‘ میں ان سے کس پہلو میں کمتر ہوں!

میں یہاں تک عرض کر رہا ہوں کہ حضور ﷺ کا معاملہ ہمارے اعتبار سے تو بہت مختلف ہے اور اُس وقت جو لوگ موجود تھے ان کا معاملہ بھی ہم سے بہت مختلف تھا۔ ہمارے لیے تو حضور ﷺ کی حیثیت اب ایک ادارے (institution) کی ہے‘ حضور ﷺ بنفسِ نفیس‘ گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان کی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں‘ اور اللہ تو ویسے بھی ہمارے سامنے نہیں ہے‘ لہٰذا ہمارے لیے اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت‘ یہ دونوں درحقیقت ادارے ہیں۔ اس وقت ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے مابین صرف اُمتی اور رسول کی نسبت ہے‘ جبکہ اس وقت کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ ایک تو رسول ﷺ ان کے سامنے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کی صورت میں موجود تھے‘ عام انسانوں کی طرح وہ بھی کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ پھر یہ کہ حضور ﷺ کے ساتھ ان کی اور بھی بہت ساری نسبتیں موجود تھیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عباس اور حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہما) حضور ﷺ کے

چچا ہیں‘ لہٰذا آپؐ تو بھتیجے ہونے کے اعتبار سے ان سے چھوٹے تھے۔ صحابیات (رضی اللہ عنہن) میں وہ بھی ہیں جو حضورﷺ کی ازواجِ مطہرات ہیں۔ ان کے اور آنحضورﷺ کے مابین نسبت صرف رسول اور اُمتی کی نہیں ہے‘ شوہر اور بیوی کی بھی ہے۔ اسی طرح آپ قیاس کرتے چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں نسبتیں بھی بہت سی تھیں۔ اس پہلو سے اس وقت آپﷺ کی اطاعت کا معاملہ آج کی نسبت زیادہ مشکل تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت ایک تو نگاہوں کے سامنے موجود ایک گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کی اطاعت مطلوب تھی اور دوسرے یہ کہ ان کے ساتھ اور بھی کافی نسبتیں تھیں جو کہ ہماری نہیں ہیں۔ ہمارے لیے حضورﷺ کی اطاعت بہت آسان ہے‘ جبکہ ان لوگوں کے لیے اس معاملے میں بڑی اضافی دقتیں اور پیچیدگیاں تھیں۔ چنانچہ انہیں یہ وسوسے پیش آ سکتے تھے کہ ان کی ہر بات ماننے کی کیا ضرورت ہے! یہ ہم تک اللہ کا جو حکم پہنچاتے ہیں ہم اسے مان لیتے ہیں‘ لیکن ان کی ہر بات کیوں مانیں! اسی موقف کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾﴾ (النساء)

’’نہیں (اے محمدﷺ!) آپ کے ربّ کی قسم! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہر اختلافی معاملے میں جو اِن کے مابین اٹھ کھڑا ہو‘ آپ کو آخری حَکم تسلیم نہ کریں‘ اور جو فیصلہ بھی آپ کریں (نہ صرف یہ کہ اسے بے چون و چرا قبول کریں‘ بلکہ) اپنے دل میں بھی اس کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں‘ اور (آپ کی) فرمانبرداری قبول کرلیں جیسا کہ اس کا حق ہے‘‘۔

اس طرزِ تخاطب میں جو زور ہے وہ اس پس منظر میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص مشورہ دے اور اس کا مشورہ قبول نہ کیا جائے‘ تو اس کے دل پر اس کا ایک ردّعمل لازماً ہوگا کہ انہوں نے میری بات کو اہمیت نہیں دی‘ مجھے کم تر سمجھا‘ کسی اور کی بات کو زیادہ اہمیت دی۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی اجتماعی ضرورت کے تحت محسوس ہو کہ شاید صاحب امر کا التفات کسی اور کی طرف

زیادہ ہے اور میری طرف کم ہے۔ اس سے بھی نفس کے اندر لازماً ایک ردّعمل پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا لازماً ہوتا ہے‘ کوئی نظم اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اور کبھی کسی کوتاہی پر سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جس سے انسان کے اندر شدید ردّعمل پیدا ہوسکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی جگہ پر صحیح ہو لیکن کسی مغالطے کی بنا پر اس کو خواہ مخواہ ڈانٹ دیا جائے۔ اس کا بھی بہرحال امکان موجود ہے۔ نبی اکرمﷺ کی ذات اس طرح کے مغالطے سے بَری ہے‘ کوئی اور تو اس سے بَری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اصحابِ امر تک کوئی غلط اطلاع پہنچی ہو‘ یا ان کے اپنے مشاہدے میں یا اپنی سوچ میں کوئی غلطی ہو۔ اب اس میں مزید دس گنا زیادہ امکان پیدا ہوگا کہ طبیعت میں ردّعمل اور آزردگی (resentment) پیدا ہو جائے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جن سے امیر اور مأمور کا رشتہ بہت نازک ہو جاتا ہے۔ اگر اس میل کو انسان شعوری طور پر صاف نہ کرتا رہے اور وہاں کھردری سطح برقرار رہے تو وہاں میل جمع ہوتا رہے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی زبان سے کبھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ نکل جائے گا‘ کبھی آپ کوئی استہزائیہ کلمہ کہہ دیں گے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی نے محسوس کیا کہ کوئی اور بھی ہے جس کے دل میں ایسے جذبات ہیں تو اب ایک انسیت محسوس ہوگی اور وہ جا کر اس سے دکھ درد بیان کرے گا کہ دیکھئے اس جماعت میں آنے کی ہماری کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے‘ فلاں صاحب ہم سے کوئی برتر نہیں ہیں کہ ہم سے اس طرح کا معاملہ ہو رہا ہے۔ اب وہ دو سے تین‘ پھر تین سے چار ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ ایک جتھے کی شکل اختیار کرلیں گے اور ان کے مابین ایک دوسرے کے لیے قرب اور دلوں کی نرمی پیدا ہو جائے گی۔ اب صورتِ حال یہ ہوگی کہ کسی اجتماع میں جہاں بیٹھے ہیں یکجا بیٹھے ہیں۔ اب امیر اگر کچھ کہہ رہا ہے تو اس پر آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر رہے ہیں کہ دیکھا‘ یہ بات نکل آئی نا جو ہم سوچتے تھے‘ ہمارا خیال صحیح ہوا کہ نہیں! اس طرح آنکھوں آنکھوں میں تبادلۂ خیال ہوتا ہے‘ پھر فقرے چست کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ

اجتماع میں مل جل کر بیٹھیں' آس پاس صرف وہی لوگ ہوں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا احساس ہے اور کسی اور کو قریب نہ آنے دیں' تا کہ اگر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو کوئی سن کر آگے نہ پہنچا دے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہائی میں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ غیبت جو بہت لذیذ شے ہے' جب یہ امیر کے خلاف ہو گی تو بہت ہی لذیذ ہو جائے گی۔ اس میں یہ اضافی عوامل شامل ہو جائیں گے۔ جب بھی طبیعت کے اندر کسی وجہ سے منفی ردّعمل پیدا ہو گا تو اس سے جب کھیتی لہلہائے گی تو بہت بہار دے گی۔ اب کونوں کھدروں میں' علیحدگی میں گفتگو ہو رہی ہے' آپس میں بظاہر بہت دردمندانہ مشورے ہو رہے ہیں کہ دیکھئے' تنظیم میں ہمیں تو اس کی مصلحت مطلوب ہے' یہ غلط رُخ پر چلے گئے ہیں' ان کا انداز غلط ہے' اس سے تنظیم کو نقصان پہنچ رہا ہے' ہم تو اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں' ہم تو اصل میں بھلائی کے لیے یہ سارے مشورے کر رہے ہیں' ہمیں کسی سے کوئی ذاتی نفرت اور کدورت نہیں ہے۔

اس حوالے سے وہ الفاظ ذہن میں رکھئے جو سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں آئے ہیں : ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ (رخنہ اندازی نہ کرو' اس نظم کو کمزور نہ کرو' اس میں فتنے نہ اٹھاؤ) تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں''۔ ہم تو اصلاح کے لیے کوشاں ہیں' ہمارے مشورے تو اصلاح اور بہتری کے لیے ہیں۔ یہ تمام کیفیات ایک complex مرض کی علامات ہیں جو بہت سے امراض کا مرکب ہے۔ اس پورے مرض کے کیا اسباب ہیں؟ میڈیکل سائنس میں کسی مرض کی etymology کے دو حصے ہوتے ہیں: اوّلاً predisposing factors جن کی وجہ سے مرض کے حملہ آور ہونے کے لیے فضا ہموار ہوتی ہے' میدان ہموار ہو جاتا ہے۔ ثانیاً exciting cause جو مرض کے اُبھرنے کے لیے کوئی فوری سبب بن جاتا ہے۔ یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ مرض کیسے وجود میں آتا ہے۔

اس انداز سے جو جتھے بندی وجود میں آتی ہے اس کا نام ''مظاہرہ'' ہے۔ یہ

مظاہرہ' جسے ہم اسلامی انقلاب کے ضمن میں باطل کے خلاف اقدام کا ایک عنوان تجویز کر رہے ہیں' اگر اس اجتماعیت کے اندر ہونا شروع ہو جائے تو ع ''وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی'' کے مصداق وہ اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ گویا دیمک ہے جو اندر سے چٹ کر رہی ہے۔ اس طرح اس کی ساری اجتماعیت اور اجتماعی قوت ختم ہو جائے گی۔ تو یہ مظاہرہ کسی اجتماعیت کے اندر نہ ہو۔

''نجویٰ'' کی حقیقت وشناعت۔ قرآن حکیم کی روشنی میں

اب ان آیاتِ مبارکہ کو سمجھ لینا چاہیے جس میں یہ وضاحت ہے کہ اس پوری بیماری کی' جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا ہے' کیا علامات ہیں' اس کا کیسے ظہور ہوتا ہے اور یہ کیسے آگے بڑھتی ہے؟ اس کے لیے ایک عنوان ہے ''نجویٰ''۔ پہلے اس لفظ کی اصل کو سمجھ لیا جائے۔ عربی زبان میں ''نَجْوَۃٌ'' بلندی کو کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ نجات بنا ہے جس کے معنی بچ جانے کے ہیں۔ کسی بلند مقام پر پہنچ جانا دشمن کے نرغے سے نکل کر نجات پا جانے کی ایک صورت ہے۔ اس کے لیے بہترین مثال غزوۂ اُحد کی ہے کہ جس وقت صحابہ کرام ؓ نرغے میں آ گئے اور ستر صحابہ شہید بھی ہو گئے اُس وقت نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اُحد پہاڑ پر چڑھ جاؤ! چنانچہ بلندی پر چڑھ جانا اُس وقت بچاؤ کی شکل بن گیا۔ تو بلندی پر پہنچ جانا ایک طرح سے بچاؤ' دفاع اور نجات کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ پھر یہ کہ بلندی پر کوئی جاتا ہے تو تنہا ہوتا ہے۔ اور یہاں بلندی پر جب تنہائی ہو گی تو وہاں ایک دو جو پہنچ گئے ہیں وہ سرگوشیاں کریں گے جو دوسرے نہیں سنیں گے۔ تو علیحدگی میں خفیہ سرگوشیوں کے لیے یہ لفظ ''نجویٰ'' ہے۔ واضح رہے کہ نجات کا اصل مادہ بھی ''ن ج و'' ہے اور نجویٰ کا مادّہ بھی یہی ہے۔

نجویٰ کے ضمن میں ایک آیت سورۃ النساء میں بھی موجود ہے۔ اور میرا گمان ہے کہ سورۃ النساء پہلے اور سورۃ المجادلۃ بعد میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ (آیت ۱۱۴) ''ان کی سرگوشیوں میں سے اکثر میں کوئی خیر نہیں ہے''۔ یعنی یوں سمجھئے کہ اکثر و بیشتر سرگوشی

خرابی کی جڑ بنتی ہے۔ وہی بات بہتر ہوتی ہے جو کھل کر سامنے کی جائے۔ اگر کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ غیبت ہے۔ جیسے اگر کوئی حملہ آور ہونا بھی چاہتا ہے تو بھی سامنے سے حملہ کرے، پیچھے سے حملہ کرنا تو بزدلی ہے۔ اگر سامنے سے حملہ کیا جائے گا تو وہ بھی مدافعت کر سکتا ہے۔ اگر عوام کے اندر اس کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو اس کو موقع تو ہوگا کہ وہ وضاحت کر کے اپنا دفاع کر سکے کہ یہ بات یوں نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ معاملہ پیچھے سے کیا جائے تو اب وہ مدافعت کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا بات تو وہی ہوتی ہے جو ڈنکے کی چوٹ پر سامنے کی جائے، اِلاّ یہ کہ آپ اس طرح اس کے استہزاء کا ذریعہ بن جائیں گے تو اس کی اصلاح کا امکان کم ہو جائے گا، بلکہ اصلاح کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یہ مصلحت کی بات ہے۔ ہر چیز کے اندر استثناء تو ہوتا ہے، لیکن قاعدہ قانون یہی ہے کہ ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ ''ان کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے''۔ البتہ اس کی کچھ مستثنیات ہیں جو اسی آیت میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہیں:

i) ﴿اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی (کسی کو) صدقہ کرنے کو کہے''۔ آپ نے کسی کو جا کر مشورہ دیا کہ بھائی فلاں شخص احتیاج میں ہے اور میری اِس وقت ایسی حالت نہیں ہے کہ میں اس کی مدد کر سکوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت کو پورا کیجیے۔

ii) ﴿اَوْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''یا کوئی نیک کام (کرنے کو کہے)''۔ یعنی کسی اور نیک کام کا کسی کو علیحدگی میں مشورہ دینا۔ محسوس ہو کہ اس کی ہمت کمزور پڑ رہی ہے تو اس کی ہمت بندھانا۔

iii) ﴿اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ ''یا لوگوں کو آپس میں صلح کا مشورہ دے''۔ یہ ''اصلاح ذات البین'' ہے کہ لوگوں کے مابین مصالحت کرانا۔ اس کے لیے یہ کرنا پڑے گا کہ آپ علیحدگی میں ایک فریق کی بات سنیں، پھر دوسرے فریق کا موقف سنیں۔ اگر وہ آمنے سامنے ہوں گے تو آپس میں الجھ پڑیں گے، فوراً مشتعل ہو جائیں گے۔

اب آپ علیحدگی میں ایک کی بات سن کر اسے سمجھائیں اور ٹھنڈا کریں۔ پھر دوسرے فریق سے جا کر بات کریں۔ اس معاملے میں یہاں تک اجازت ہے کہ فرض کریں پہلے فریق نے غیظ وغضب کی حالت میں دوسرے فریق کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے تو اسے چھپا لیں، اس میں توریہ کی حد تک گنجائش ہے، بلکہ اصلاحِ ذات البین کے لیے اس طرح کی کوئی بات اپنی طرف سے بھی کہی جا سکتی ہے کہ تمہارے لیے اُس کے دل میں محبت ہے، یہ تو وقتی طور پر تمہارے مابین غلط فہمی ہو گئی ہے، کچھ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے مابین عداوت کے بیج بو دیے ہیں۔ دین میں اس کے لیے انتہائی تاکیدی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد بہتری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ صرف اہلِ ایمان کے لیے نہیں ہے، بلکہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ کہ لوگوں کے مابین اصلاح، عام انسانوں کے مابین مصالحت کی کوشش۔ سورۃ الحجرات میں تو الفاظ ہیں: ﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (آیت 9) ''اور اگر مؤمنوں کے دو گروہ باہم جھگڑا کریں تو ان کے مابین صلح کراؤ''۔ لیکن یہاں الفاظ صرف مؤمنین کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ''اصلاح بین النّاس'' کے الفاظ ہیں۔ اس کے لیے سنن ابی داؤد، سنن ترمذی اور مسند احمد میں تاکیدی حدیث موجود ہے کہ یہ کام نماز و روزہ سے افضل ہے کہ لوگوں کے مابین مصالحت کراؤ اور ان کے بگڑے ہوئے تعلقات کو سدھارنے اور سنوارنے کی کوشش کرو۔ تو ان تین کاموں کے لیے علیحدگی میں جا کر سرگوشی کرنا خیر کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کام کے لیے سرگوشی ہوگی تو اس میں خیر نہیں ہے، چاہے آدمی خود کو کتنا ہی دھوکہ دے کہ میں یہ کام نیک نیتی سے کر رہا ہوں، بھلائی کے لیے کر رہا ہوں، لیکن حقیقتاً وہ خیر سے خالی ہوگا۔ آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ ''اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے گا تو ہم اسے عنقریب اجر عظیم سے نوازیں گے''۔

اب آئیے اس پس منظر میں سورۃ المجادلۃ کی آیات پر غور کر لیا جائے۔ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ''کیا تم نے نہیں دیکھا

کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟'' یہ درحقیقت جانی پہچانی اور تمہاری مانی ہوئی حقیقت ہے جس سے تمہیں اِس وقت ذہول ہو رہا ہے' اِس وقت تم اس کو بھلا رہے ہو۔ یہ تمہید ہے کہ کس سے چھپ کر کانا پھوسی کر رہے ہو؟ ایک کان تو ہمیشہ ہر جگہ سننے والا موجود ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تمہاری ان باتوں کو سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ تو سن رہا ہے۔

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ ''نہیں ہوتا (ان میں سے) کسی بھی تین افراد کا باہم سرگوشی کرنا مگر یہ کہ اللہ اُن کا چوتھا ہوتا ہے'' ﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ''اور نہ پانچ کا (نجویٰ ہوتا ہے) مگر یہ کہ اللہ اُن کا چھٹا ہوتا ہے'' ﴿وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ﴾ ''اور نہ اس سے کم''۔ دو بھی باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں تو بھی تیسرا اللہ موجود ہے۔ دو سے کم تو نہیں ہو سکتے' کیونکہ ایک آدمی تو بیٹھ کر سوچ ہی سکتا ہے۔ ﴿وَلَا اَكْثَرَ﴾ ''نہ اس سے زائد'' ﴿اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ﴾ ''مگر یہ کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوتے ہیں''۔ وہ چاہے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ہوں' یا کھوہ میں چھپ کر مشورے کر رہے ہوں' یا کہیں زمین کے پیٹ میں گھس کر یا فضا کی پہنائیوں میں کر رہے ہوں' خواہ کہیں بھی ہوں گے اللہ ان کے ساتھ ہے۔ ﴿ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''پھر اللہ انہیں قیامت کے دن جتلا دے گا جو وہ کرتے رہے ہوں گے''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ یہاں نَبَّاَ' یُنَبِّیُٔ کا لفظ ہے۔ اس کے علاوہ نَبَّہَ یُنَبِّہُ کا لفظ آتا ہے جو تنبیہہ کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ متنبہ کرنا۔ جبکہ یہ ''نبأ'' سے ہے جس کا مطلب ہے ایک ایک کر کے جتلا دینا کہ تم نے فلاں تاریخ' فلاں وقت یہ مشورے کیے' یہ ہے تمہارا نجویٰ۔

آگے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾(۱) ''کیا تم نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہیں نجویٰ سے روکا گیا تھا؟ پھر

(۱) اس آیت سے بھی میرا گمان ہے کہ سورۃ النساء' سورۃ المجادلہ سے پہلے نازل ہوئی ہے' کیونکہ اس مقام کے علاوہ قرآن مجید میں نجویٰ کے بارے میں صرف سورۃ النساء کی ایک آیت ہے۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اُس آیت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا''۔ دیکھئے وہ روکنے کا بہترین اور لطیف ترین انداز تھا۔ اس میں ڈانٹ ڈپٹ' سختی اور گرفت کا انداز نہیں تھا' بالکل ایسے جیسے کوئی کائناتی حقیقت بیان کی جا رہی ہو کہ: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۭ﴾ یعنی جان لو اِن تین کاموں کے سوا جو کچھ ہے اس میں خیر نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے جن کے دلوں میں اصلاح پذیری کا مادہ تھا وہ اگر غیر شعوری طور پر یہ کام کر رہے تھے تو اب شعوری طور پر رُک گئے' ٹھٹک گئے' انہوں نے اپنی باگیں کھینچ لیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ یا مرض ہوتا ہے تو ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ کے مصداق اُن کا روگ تو مسلسل بڑھتا ہے۔ اب یہاں اُن کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ یہ اُس معاشرے میں وہ لوگ تھے جنہیں آج ہم منافقین کہتے ہیں۔ لیکن ان کی پیشانیوں پر لکھا ہوا نہیں تھا کہ یہ منافق ہیں' بلکہ وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے تھے۔ حضور ﷺ کے علم میں تھا کہ کون منافقین ہیں' لیکن حضور ﷺ نے اسے ایک راز ہی رکھا ہے۔ اپنے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو اگر چند خاص منافقین کا نام بتا بھی دیا تھا تو انہیں بھی آگے بیان کرنے سے سختی سے روک دیا تھا کہ یہ ایک راز ہے۔ لہٰذا وہ مسلمانوں میں گڈمڈ تھے۔ اس اعتبار سے یہ نہ سمجھئے کہ اس کا ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اصل میں تو قرآن مجید میں جو بھی منافقین کا بیان ہے ہم اس سے اس وجہ سے محروم رہتے ہیں کہ ہم انہیں ایک علیحدہ category قرار دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تو یہ سمجھئے کہ یہ درحقیقت ہمیشہ مسلمانوں میں گڈمڈ ہوتے ہیں۔ یہ بہتر سے بہتر جماعت میں موجود تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سے تو بہتر جماعت نہیں ہو سکتی' اس میں یہ ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ غور کیجیے کہ تا بہ دیگراں چہ رسد؟ کون سی جماعت یہ سمجھ سکتی ہے کہ ہم اس سے بالاتر ہیں' منزّہ اور پاک ہیں!

﴿وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ﴾ ''اور یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں''۔ یعنی

مندرجہ بالا تین چیزوں کے مقابلے میں یہ جو نجویٰ کرتے ہیں، سرگوشیاں اور کھسر پھسر کرتے ہیں، وہ ایک تو گناہ کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ ''اِثْم'' کا ترجمہ ہم ''گناہ'' کرتے ہیں اور ''عُدوان'' کا ترجمہ ''زیادتی''۔ اصل میں گناہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہے کوتاہی، یعنی آپ اپنا فرض ادا نہیں کر رہے۔ اور دوسرا ہے زیادتی، کہ کسی کے حق پر دست درازی کرنا، حملہ آور ہونا۔ یہ دو پہلو علیحدہ ہیں۔ لہٰذا اگر آپ ایمان کا تقاضا پورا نہیں کر رہے تو یہ 'اِثْم' ہے۔ اہل عرب اس اونٹنی کو ''آثِمَۃٌ'' کہتے ہیں جو قافلے سے پیچھے رہ گئی ہو۔ اگر کوئی اونٹنی قافلے میں موجود تمام اونٹوں اور اونٹنیوں کے ساتھ ساتھ چلے گی تب ہی وہ قافلہ بنے گی، ورنہ تو وہ قافلے سے پیچھے رہ جائے گی اور اب وہ 'آثمۃ' کہلائے گی۔

اب یوں سمجھئے کہ جن فرائض کی ادائیگی کے لیے کوئی اجتماعی نظام قائم ہوا ہے، جو لوگ ان فرائض کو بحسن وخوبی ادا کر رہے ہوں وہ تو گویا قافلے کے ساتھ چل رہے ہیں، جبکہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پیچھے ہوتے ہیں اور اپنے ان تقاضوں کو پورا نہیں کر پا رہے ہوتے۔ تو یہ 'اِثْم' ہے۔ ایسے آدمی کی عزتِ نفس اسے ابھارتی ہے کہ دیکھو ایسا دُم کٹا کوئی اور بھی ہے یا نہیں! تو جن کے اندر کسل ہوتا ہے ان کے مابین یگانگت (affinity) پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پیچھے رہ جانے والے خود بخود ایک دوسرے کی طرف ایک میلان محسوس کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے جواز فراہم کرتے ہیں۔ تو اس کا پہلا عنوان ہے ﴿یَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ﴾۔ 'اِثم' کے معنی روکنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی خیر خواہی کے انداز میں کہتے ہیں کہ بے وقوف نہ بنو، یہ تو پاگل ہیں، لیکن ہمیں تو دیکھ کر چلنا ہے اور انہیں بھی سمجھانا ہے۔ جیسے اُس دَور کے منافقین کہا کرتے تھے: ﴿اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۳) ''کیا ہم ایمان لے آئیں ان بے وقوفوں کی طرح؟'' انہیں تو کسی خیر وشر اور نفع ونقصان کی فکر نہیں ہے۔ یہ تو دیوانے (fanatics) ہو گئے ہیں۔ تو اب اس طرح کی گفتگو ہو گی۔ ﴿وَالْعُدْوَانِ﴾ ''اور زیادتی کے لیے (سرگوشیاں کرتے ہیں)''۔ یہ دوسرا رُخ ہے کہ کسی کی عزت پر حملہ

کرنا، کسی کے حقوق پر دست درازی۔

﴿وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ ز﴾ ''اور رسولؐ کی نافرمانی کے لیے (سرگوشیاں کرتے ہیں)''۔ یہاں رسول کی حیثیت ذہن میں رکھئے! رسول کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ رسول کی ایک حیثیت اس جماعت کے امیر کی بھی ہے اور رسول کی ایک حیثیت اس ریاست کے سربراہ کی بھی ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو زیادہ کٹھن گزرتا ہے۔ میرے نزدیک نفاق کے موضوع پر سورۃ النساء قرآن مجید میں اصولی طور پر اہم ترین سورت ہے۔ اب جو چیزیں نفاق کا اصل سبب بنتی تھیں ان میں سے ایک اہم چیز ''رسول کی اطاعت'' تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہیں۔ بس ان پر وحی اترتی ہے جسے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ باقی تو یہ ہمارے جیسے انسان ہیں، ہم کیسے ان کے آگے سر جھکائیں! کیا ان سے خطا نہیں ہو سکتی؟ کیا ہماری بات بہتر نہیں ہو سکتی؟ ہمیں تجربہ حاصل ہے، ہم جانتے ہیں، ہم معاملات کو چلاتے رہے ہیں۔ انہیں تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہی جاتی تھیں۔ یہ ہے معصیت رسول، رسول کے حکم سے سرتابی۔ منافقین کی علامتیں اور ان کے مشاغل قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہیں۔ انہیں حضور ﷺ سے جو کد ہو گئی تھی اس کا ظہور مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔

آگے فرمایا: ﴿وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِهِ اللّٰهُ﴾ ''اور جب یہ آپؐ کی خدمت میں آتے ہیں تو آپ کو وہ دعا دیتے ہیں جو اللہ نے آپ کو نہیں دی''۔ عربوں کا ایک عام دعائیہ کلمہ ''حَیَّاکَ اللّٰهُ'' ہے جس کے معنی ہیں ''اللہ تمہاری عمر دراز کرے''۔ یہیں سے لفظ ''تَحِیَّۃ'' بنا ہے جو اپنے نیک جذبات کا اظہار ہے۔ اسے آپ greetings کہتے ہیں۔ اصل سلام تو ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' ہے، لیکن منافقین ''السَّام علیکم'' کہتے تھے، جس کے معنی ہیں ''تم پر موت آئے''۔ (معاذ اللہ۔ نقل کفر کفر نباشد!) اگر کوئی پکڑ لیتا تو کہنے لگتے کہ ہم نے تو السلام علیکم کہا ہے، شاید آپ کو ٹھیک سنائی نہیں دیا، ذرا اپنے کان کی میل نکلوایئے اور اس میں تیل ڈلوایئے! الٹا

اسے شرمندہ کر دیتے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ﴾ ”اور وہ اپنے جی میں کہتے اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا اُس پر جو ہم کہتے ہیں“۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں مثال آئی ہے کہ ”رَاعِنَا“ کے بجائے ”رَاعِيْنَا“ کہتے‘ یعنی ”اے ہمارے چرواہے!“ ”رَاعِنَا“ ایک مجلسی کلمہ تھا کہ ہماری طرف ذرا متوجہ ہوں‘ ہمارا لحاظ کیجیے‘ ہم بات سمجھ نہیں سکے۔ جیسے ”pardon“ کا لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے کہ معاف کیجیے گا۔ لیکن وہ ”رَاعِينا“ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ اور شیطان کا وسوسہ دیکھئے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ﴾ ”اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟“ یعنی شیطان اب اور پٹی پڑھا رہا ہے کہ دیکھو‘ تم نے رسول (ﷺ) سے گستاخی کی۔ اگر یہ رسول ہوتے تو اللہ تمہاری زبان گدی سے کھینچ لیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شک وشبہ صحیح ہے۔ یہ ہے وہ برائی کا چکر (wicious circle) یعنی ایک برائی دوسری برائی کو جنم دیتی ہے اور دوسری پہلی برائی کو مزید تقویت دیتی ہے کہ دیکھو بھائی میں نے تو اُس وقت اتنا کلام کر دیا‘ اب اگر فی الواقع یہ رسول ہوتے تو کیا اللہ اس کو گوارا کرتا! کیوں نہیں اللہ اس پر ہمیں عذاب دیتا جو ہم کہہ رہے ہیں! اس کا مطلب صاف ہے کہ یہ رسول نہیں ہیں اور ہمارا شبہ صحیح ہے۔ فرمایا: ﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ﴾ ”ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں یہ پہنچ کر رہیں گے (جھونکے جائیں گے)“ ﴿فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸﴾ ”اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے“۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ”اے اہل ایمان! جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہ کرو“۔ یعنی اگر تمہیں نجویٰ کرنا ہی ہے‘ تنہائی میں گفتگو کرنی ہی ہے‘ کوئی مل بیٹھنے کا موقع آ ہی گیا ہے تو ان تین چیزوں سے بچو: (i) اثم‘ (ii) عدوان‘ (iii) معصیت رسول۔ ﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ﴾ ”اور باہم تنہائی

میں نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو“۔ اگر نجویٰ کرنا ہی ہے تو نیکی اور تقویٰ کے لیے کرو‘ خیر اور بھلائی کے لیے کرو‘ ایک دوسرے کو نیکی پر آمادہ کرو‘ ایک دوسرے کی طبیعت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے تو اس کو دور کرو‘ دوسرے کی ہمت اگر پست ہو رہی ہے تو اسے ہمت دلاؤ۔ لیکن اثم‘ عدوان اور معصیت رسول سے بچو۔ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹﴾ ”اور تقویٰ اختیار کرو اس اللہ کا جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے“۔

﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ﴾ ”جان لو کہ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے“۔ آج میں نے وہیں سے بات شروع کی ہے کہ جو اجتماعیت دین کا بول بالا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے تو شیطان کو سب سے بڑھ کر تکلیف لازماً اسی سے ہو گی‘ چنانچہ وہ اپنی توجہات سب سے زیادہ اسی پر مرکوز کرے گا۔ ﴿لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "(اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے) تاکہ اہل ایمان کو غم ہو‘ اندوہ ہو‘ رنج وصدمہ ہو‘ ان کی یکسوئی اور یک جہتی مجروح ہو‘ ان کے دلوں میں خلجان پیدا ہو جائے۔ یہ ہے جس کے لیے شیطان نجویٰ کا جال بچھاتا ہے اور اس کے اندر اس نے بڑی خوش نمائی پیدا کر دی ہے۔ ﴿وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْـــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ”حالانکہ اِذنِ خدا کے بغیر وہ (نجویٰ) انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا“۔ اب یہ اہل ایمان کو اطمینان دلانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ مطمئن رہو‘ تمہیں اللہ کے اِذن کے بغیر کوئی کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ جیسے ہم کہتے ہیں: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ شیطان کو ہرگز کوئی اختیار حاصل نہیں ہے‘ اگر اس کا کوئی وار کارگر ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اذنِ ربّ سے ہوتا ہے‘ اس میں بھی اللہ کی طرف سے کوئی خیر ہوتا ہے‘ کوئی تمہاری تربیت یا اصلاح مقصود ہوتی ہے‘ اللہ اسے تمہاری اصلاح کا بہانہ بناتا ہے۔ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰﴾ ”اور اہل ایمان کو تو اللہ پر اپنا پورا توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے“۔ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس میں زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ حتی الامکان سدّ باب کرو‘ لیکن جس شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ صاف ہے اسے ان چیزوں سے زیادہ دل گیر اور دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ ان تمام مفاسد سے اس ہیئت اجتماعیہ کو پاک کرنے کی

کوشش کرنا بالکل دوسری بات ہے۔

چونکہ میں نے پس منظر بیان کر دیا ہے اس لیے آپ کو یہ بات سمجھنے میں کافی سہولت ہو جائے گی۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اے اہل ایمان! جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کشادگی پیدا کرو تو کھل کر بیٹھا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا''۔ بڑا پیارا ربط ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جو تین چار آدمی علیحدگی میں آپس میں ملاقاتیں کرتے ہیں اور باہم سرگوشیاں کرتے ہیں وہ جب کسی اجتماع میں آئیں گے تو بھی اکٹھے بیٹھیں گے اور علیحدگی میں کھسر پھسر اور سرگوشیاں کریں گے' کن انکھیوں میں تبادلۂ خیال کریں گے جو بہت خطرناک ہے۔ تب ہی تو کہا جا رہا ہے کہ جب تم سے کھل کر بیٹھنے کو کہا جائے تو کھل کر بیٹھ جایا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا۔ یوں سمجھئے اس نجویٰ کا ظہور اب مسلمانوں کے اجتماعات کے اندر ہونے لگا تھا جس کے لیے کہا جاتا تھا کہ کھل کر بیٹھو' تاکہ آپ کے مابین جگہ ہو اور کوئی اور آنے والا بیٹھ سکے۔ منافقین اس طریقے سے جتھہ بندی کرتے تھے کہ ان کے مابین کوئی تیسرا آدمی نہ بیٹھ جائے' کیونکہ اگر ان میں کوئی باہر کا آدمی شامل ہو گیا تو وہ ان کی رپورٹ کرے گا اور یوں ان کی باتیں دوسروں کے علم میں آ جائیں گی۔ لہٰذا کہا جا رہا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا اور تنگیوں سے جو فساد پیدا ہو رہا ہے اس کی روک تھام کی جا سکے گی۔

﴿وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ ''اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو''۔ یہ اب ان کے نجویٰ کی تیسری شکل ہوتی ہے۔ اجتماع اختتام پذیر ہو جائے اور کہہ دیا جائے کہ اب آپ تشریف لے جائیے تو ان لوگوں کا نجویٰ فوراً وہیں شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں' تاکہ دورانِ اجتماع اگر کوئی تبصرے نہیں ہو سکے تو تبادلۂ خیال کر لیں اور ایک دوسرے کو فقرے بازیوں پر داد دے لیں۔ لہٰذا وہ وہاں سے فوراً روانہ نہیں ہوتے۔ اس لیے اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ

اگر تمہیں کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔

﴿یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''تم میں سے جو لوگ واقعی اہل ایمان ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے' اللہ ان کے درجات بلند کرے گا''۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر صنعتِ لفظی کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ یہ بھی کلام کا ایک حسن ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اے اہل ایمان! جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو' اللہ تمہیں اونچا کرے گا۔ اگر تم خلوص و اخلاص کے ساتھ احکام مانو گے تو اللہ تمہیں رفعت عطا فرمائے گا۔

اس ضمن میں بعض حضرات نے بڑی عمدہ بات کہی ہے۔ بعض اوقات کسی اجتماع میں یہ صورت پیش آتی ہے کہ دو حضرات آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ یہاں سے اُٹھ کر وہاں بیٹھئے تو اس میں آدمی اُس وقت اپنی توہین محسوس کرتا ہے' حالانکہ سوچنا چاہیے کہ کوئی شخص ہے جو اِس اجتماع کو conduct کر رہا ہے اور اس کی نگاہ میں یہ بات آ گئی ہے' لہٰذا وہ اس اجتماع کی تاثیر کو ختم کرنے والی شے کو رفع کرنا چاہتا ہے تو اس میں انسان اپنی توہین محسوس نہ کرے۔ اس لیے کہ جو صاحبِ امر اور ذمہ دار ہے اسے اس کا نظم چلانا ہے' اسے اس اجتماع کو بہتر سے بہتر نتیجے تک منتج کرنا ہے' نتیجہ خیز اور بارآور بنانا ہے' لہٰذا اگر کہہ دیا جائے کہ اٹھ جائیے یا یہ کہ فلاں جگہ پر تشریف لے جائیے تو اس پر برا نہیں ماننا چاہیے۔ بہرحال جو صاحب علم ہو گا اور جس کے دل میں ایمان کی رمق ہو گی وہ اسے خیر سمجھے گا اور اس ہدایت پر عمل اپنی توہین نہیں سمجھے گا' تو اللہ اس کے درجات بلند کرے گا' لیکن جس کے دل میں روگ ہو وہ اسے برا مانے گا کہ اسے نمایاں کر کے سب کے سامنے ذلیل کر دیا گیا ہے' جبکہ یہ کام اس کے بجائے کوئی دوسرا کر رہا تھا اور دوسرے کا وبال اس پر آ گیا ہے۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہا تھا اور غلطی سے اسے اٹھ جانے کو کہہ دیا گیا ہے تو کون سی قیامت آ گئی ہے! اگر اس کام کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت انداز میں سوچا جائے پھر تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ ٹھیک ہے وہ صاحبِ نظم ہے'

اس سے غلطی ہو بھی گئی ہے تب بھی کسی کی کوئی توہین نہیں ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ حساسیت انہی لوگوں کو ہوتی ہے جن کے دل میں کچھ کبر اور فساد ہوتا ہے۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ورنہ انسان سوچے گا کہ اگر میرا قصور نہیں بھی تھا' بلکہ کچھ زیادتی ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کا کوئی نہ کوئی اجر عطا فرمائے گا' تلافی (compensate) کرے گا' اگر صاحب امر نے زیادتی کی ہے تو اس کی کوئی نیکی مجھے مل جائے گی' لہٰذا مجھے تو کوئی نقصان نہیں ہے' میرے لیے تو بس حصول ہی حصول ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب ایمان اور خلوص و اخلاص ہو' اور اس اجتماعیت سے مخلصانہ تعلق ہو۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

اس میں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ جو شخص کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک نہیں ہے تو قرآن مجید کی یہ باتیں اسے کس طرح سمجھ میں آئیں گی! ان کا محض ترجمہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اِن کی اہمیت و عظمت اسی صورت میں سمجھ آ سکتی ہے جب کسی اجتماعیت میں شریک ہوا جائے' ورنہ تو لوگ سمجھیں گے کہ ٹھیک ہے یہ اللہ کا کلام ہے اور ہم نے اسے پڑھ کر ثواب حاصل کر لیا ہے۔ لیکن یہ کہ ان باتوں میں کیا حکمتیں ہیں اور ان میں ہمارے لیے کیا ہدایات مضمر ہیں' یہ حقیقت اسی وقت ابھر کر اور نکھر کر سامنے آئے گی جب مقصد زندگی اقامت دین معین ہو چکا ہو' جس کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ (الحدید:۲۵)

''تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں' اور ہم نے لوہا اتارا جس میں لڑائی کی سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فوائد بھی ہیں' اور (اس لیے بھی) تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے اس کو جو مدد کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی غیب میں رہتے ہوئے۔''

اقامتِ دین کے لیے جو اجتماعیت قائم ہوئی ہے اس کی مصلحتیں اور اس کا تحفظ اللہ کی نگاہ میں کتنا عزیز ہے' یہ وہ بات ہے جو سمجھ میں آئے گی تو ہی اس کی اہمیت و عظمت

منکشف ہوگی۔

ایک اور مسئلہ بھی ہے جو اجتماعی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے' ہر صاحبِ امر کو اِس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اوّل تو ہر شخص فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اسے صاحب امر سے قرب ہو' اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے' یہ فطری اور اچھی بات ہے' اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک منفی رُخ بھی ہے' کہ کچھ لوگ کام میں تو پیچھے ہوتے ہیں' لیکن اپنی دولت یا وجاہت دُنیوی کی وجہ سے کچھ نمایاں ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس دُنیوی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے صاحبِ امر کے قریب ہو کر بیٹھتے ہیں اور کان میں گفتگو کرتے ہیں' تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ ان سے بہت قریب ہیں' امیر ان کی بڑی رعایت کرتے ہیں اور بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ اس کے لیے اپنی حیثیت کو ذریعہ بناتے ہیں۔ سوچیے کہ امیر کے پاس تو وقت محدود ہے اور اجتماعیت کے حقوق بھی اس پر ہیں' تو جب اس کے وقت میں اس طرح سے دخل اندازی ہوتی ہے تو اس کا اجتماعیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس بات کی قباحت کو تین درجات میں سمجھ لیجیے۔ یہ فطری خواہش ہوتی ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن مفسدین اسی چیز سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن اُبی خاص طور پر ایسا کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ قبیلۂ خزرج کا سردار تھا' رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اس کی بادشاہت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب حضور ﷺ کو خطبہ ارشاد فرمانا ہوتا تو پہلے وہ کھڑا ہوتا تھا اور لوگوں سے کہتا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں' ان کی بات پوری توجہ سے سنیے۔ اصل مقصد اپنی حیثیت اور سرداری کو نمایاں کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص امیر سے کہتا ہے کہ مجھے آپ سے تخلیے میں گفتگو کرنی ہے تو لوگوں کے سامنے آئے گا کہ یہ امیر سے بہت قریب ہیں اور ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے' تبھی تو جب دیکھو یہ علیحدگی میں بات کرنے کے لیے وقت مانگ رہے ہوتے ہیں اور انہیں وقت دیا جاتا ہے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت اجتماعی مصالح اور بہبود پر صرف ہونا ہو وہ

اس طریقے سے ضائع ہو جاتا ہے۔ آخر انسان کی صلاحیت اور قوتِ کار محدود ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپؐ شرافت اور مروّت کا پیکرِ مجسم تھے‘ سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی آپ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں آیا ہے کہ حضور ﷺ اہل ایمان کو کھانے کی دعوت دیتے تو کچھ لوگ بہت پہلے پہنچ جاتے‘ اب دھرنا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں‘ جبکہ ابھی کھانا پکنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے۔ اس میں دونوں طرح کی باتیں ہوسکتی ہیں۔ اس میں مخلصین کے لیے تو یہ پہلو تھا کہ حضور ﷺ سے قرب کا موقع مل جاتا۔ اور جو حضور ﷺ کو تنگ کرنے والے تھے وہ اس کے ذریعے سے حضور ﷺ کو تنگ کرتے تھے‘ آپؐ کی privacy میں مخل ہوتے تھے اور جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ نہ پہلے آ جایا کرو اور نہ بعد میں بیٹھے رہا کرو۔ ﴿مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ﴾ کے الفاظ ہیں کہ کھانے کے بعد باتوں میں نہ مشغول ہو جایا کرو۔ یہ چیز نبی اکرم ﷺ کو تکلیف دیتی ہے‘ لیکن وہ چونکہ حیا کا پیکر ہیں اس لیے وہ تم سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ذکر قرآن میں ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں کوئی تخلیے میں بات کرنے کے لیے وقت مانگ رہا ہے‘ تو اب وہ کس کس کو وقت دیں! جبکہ وہ انکار کسی کو نہیں کر رہے۔ اس کا تیسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی کے پاس واقعی کوئی اہم بات ہو تو وہ رہ جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں عملی ہیں۔ اور یہ باتیں اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان پر بیتتی ہے اور ان کا تجربہ ہوتا ہے‘ ورنہ تو معلوم ہوگا کہ‘ معاذ اللہ‘ اس کی کوئی خاص عملی اہمیت نہیں ہے۔

اس چیز کی روک تھام کے لیے اب فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ ”اے اہل ایمان! جب تم رسول سے علیحدگی میں کوئی بات کرو (تمہیں تخلیے میں کوئی بات کرنی ہو) تو اس سے پہلے (اللہ کے راستے میں) کچھ صدقہ دے دیا کرو“۔ یہ گویا فیس لگا دی گئی ہے۔ اور یہ فیس حضور ﷺ کو نہیں ملے گی (معاذ اللہ)‘ بلکہ یہ صدقہ ہے‘ تاکہ کچھ تو بریک لگے۔ منافقین کو تو مال بہت مرغوب اور محبوب تھا‘ اور وہی نفاق کی جڑ ہے‘ تو یہ ایک چھلنی تو لگ جائے

گی کہ کوئی صدقہ دے کر پھر علیحدگی میں کوئی بات کرے۔ ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ﴾ ”یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور پاکیزگی کے اعتبار سے بڑھ کر ہے“۔ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ”پھر اگر کچھ بھی نہ پاؤ تو یقیناً اللہ غفور ہے رحیم ہے“۔ اگر کوئی نادار ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ان ناداروں میں تو وہ منافقین تھے ہی نہیں۔ حضور ﷺ سے جو خصوصی کھسر پھسر کرنا چاہتے تھے وہ تو وہاں کے سردار اور صاحب ثروت و وجاہت لوگ تھے۔ لہٰذا مساکین اور غرباء کے لیے راستہ کھلا رکھا گیا کہ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں۔ اصل مقصد تو اس غلط طرزِ عمل کی روک تھام تھا‘ جس کے لیے یہ چھلنی لگائی گئی ہے۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ﴾ ”کیا تم اس سے ڈر گئے ہو کہ تم (اپنے رسولؐ سے) تخلیہ میں گفتگو سے پہلے صدقات دیا کرو؟“ گھبرا گئے ہو اس سے؟ ﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا﴾ ”تو اب جبکہ تم نے یہ نہیں کیا“۔ یہ مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ یہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حکم پر عمل کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہی تھا‘ مجھے حضور ﷺ سے علیحدگی میں کوئی بات کرنا تھی تو میں نے پہلے صدقہ دیا پھر گفتگو کی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ حکم صرف چند گھنٹے کے لیے تھا‘ اس کے بعد یہ آیت جو اَب ہم پڑھ رہے ہیں‘ نازل ہوگئی تھی۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی‘ بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ وقت لگا ہوگا۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں ہیں کہ بسا اوقات ناسخ و منسوخ دونوں ساتھ ساتھ رکھ دیے گئے ہیں۔ سورۃ المزمل میں اس کی سب سے بڑی مثال موجود ہے کہ آخری آیت جس پر دوسرا رکوع مشتمل ہے‘ وہ کچھ عرصہ کے بعد نازل ہوئی۔ ہمارے یہاں اس بارے میں اختلافِ روایات ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک سال بعد نازل ہوئی اور بعض حضرات اسے مدنی بھی مانتے ہیں۔ گویا کہ پہلے اور دوسرے رکوع کے مابین دس سے بارہ سال کا فصل ہے‘ لیکن مصحف میں وہ ساتھ ساتھ

ہیں۔ یہی صورت حال سورۃ البقرۃ کے رکوع ۲۳ میں روزہ کے حکم کے بارے میں ہے‘ جسے اکثر لوگوں نے چونکہ اس پس منظر میں نہیں سمجھا اس لیے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ کچھ نہ کچھ فصل تو اس میں یقیناً ہوگا۔

یہاں ﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا﴾ میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اب اس غلط حرکت سے باز آ گئے ہو اور جو اِس عارضی حکم کا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا۔ بہر حال اس کا ایک ترجمہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ تم نے صدقہ نہیں دیا اور ڈر کر حضورﷺ سے خلوت میں بات کرنا چھوڑ دی۔ اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جبکہ تم نے اس بے احتیاطی کو ترک کر دیا تو جو ضرورت تھی وہ ختم ہوگئی‘ لہٰذا اب ہم اپنے اس حکم کو منسوخ کر رہے ہیں۔ ﴿وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ”اور اللہ نے (عنایت کے ساتھ) تم پر توجہ فرمائی۔“ یعنی نظر عنایت کی۔ اللہ کی توبہ بندوں پر شفقت و رحمت کی نگاہ کرنا ہے۔ اللہ نے تم پر رحم فرمایا‘ مہربانی کی۔ ﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ”تو نماز قائم کرو‘ زکوٰۃ ادا کرو اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسولؐ کی“۔ یعنی جو مطلوب شے ہے وہ یہ ہے کہ اس نظم کو مضبوط کرو۔ اس کے لیے نماز اللہ کے ساتھ تمہارے تعلق کو مضبوط کرنے والی شے ہے۔ اب تم اس نظم اور ڈسپلن کو مضبوط رکھو۔ یہ ڈسپلن فی ذاتہٖ مطلوب نہیں ہے‘ یہ ایک عظیم مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اور جسے وہ مقصد عزیز ہوگا وہ اس نظم کی امکانی حد تک حفاظت کرے گا‘ اسے مضبوط رکھے گا‘ اس میں رخنوں کو روکنے کی امکانی کوشش کرے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے“۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم

درس ۹

نظمِ جماعت کی پابندی
اور
اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ

نحمدهٗ ونصلّی علٰی رسولهِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓي اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاۗءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۭ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾﴾ (النور)

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا
الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰـكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ
اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَـكُمْ يَبْغُوْنَـكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ
مَّنْ يَّـقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِى الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ
لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ (التوبة)...... صدق اللہ العظیم

ہمارے اس منتخب نصاب (۲) میں جو امور زیر بحث آئے ہیں ان سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ایک اسلامی نظمِ جماعت میں مأمورین کو امراء کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ان میں آداب اور قواعد وضوابط بھی ہیں اور اصلاً اس اجتماعیت کی روحِ رواں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں تک رخصتوں اور معذرتوں کا معاملہ ہے' اس ضمن میں سورۃ النور کی آخری آیات (۶۲ تا ۶۴) اور سورۃ التوبۃ کی آیات (۴۳ تا ۴۹) میں بظاہر ایک تضاد سامنے آتا ہے۔ اس تضاد کو رفع کرنا اور ان دونوں میں تطبیق کا جاننا ضروری ہے۔

سورۃ النور کی آخری تین آیات (۶۲ تا ۶۴) کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر باریک بینی سے ان امور کی طرف رہنمائی کی جارہی ہے جن پر کسی اجتماعیت میں ایک عمدہ ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رہ سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' اور جب وہ ان (ﷺ) کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے ہرگز

نہیں جاتے یہاں تک کہ اُنؐ سے اجازت حاصل کرلیں''۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ''اِنَّمَا'' کلمۂ حصر ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کا اسلوب بھی یہی ہے اور وہاں بھی ایمانِ حقیقی کی دو شرائط یا دو لوازم بیان ہوئے ہیں۔ ایک اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور دوسرے اللہ کی راہ میں مال اور جان کے ذریعے جہاد۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہیں پڑے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ وہی لوگ ہیں سچے۔''

ان دو اجزاء میں سے ایک یہاں (سورۃ النور میں) بھی جوں کا توں موجود ہے' یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ دوسرا جزو وہاں جہاد فی سبیل اللہ بالمال والنفس ہے' جبکہ یہاں اس کی جگہ اس کے لازمی تقاضے کے طور پر اجتماعیت کا ایک وصف لایا گیا ہے' کیونکہ جہاد ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ایک اجتماعیت موجود نہ ہو۔ یہاں یہ ذہن میں رکھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہاں کون سی حیثیت مراد ہے؟ امیر یا سپہ سالار ہونے کی حیثیت! کیونکہ اگر آپؐ مدینہ میں ہیں تو سربراہِ مملکت ہیں' اگر کسی غزوہ پر تشریف لے گئے ہیں تو آپؐ کی حیثیت سپہ سالار کی ہے۔ جب تک آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے آپؐ ایک جماعت کے امیر تھے۔ آپ ﷺ کی ان تمام حیثیتوں سے بالاتر اور عظیم ترین حیثیت یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ باقی تمام حیثیتیں اس کے تابع ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس حیثیت کو علیحدہ سمجھ لینا چاہیے جس حیثیت کا ذکر اُس خاص مقام پر ہو رہا ہو۔ یہاں اجتماعی نظم کا معاملہ زیر بحث ہے۔ اگر انسان اجتماعی نظم کے معاملے میں بے پروا ہو جائے کہ اسے جو حکم ملا ہے اس کے مطابق کام کر لیا تب بھی ٹھیک ہے اور نہیں کیا تب بھی کوئی حرج نہیں' کہیں ساتھ گئے ہوئے ہیں اور کسی ڈیوٹی پر معین کیے گئے ہیں' اب جی میں آیا تو کھڑے رہے جی میں نہیں آیا تو وہاں سے چل دیے' تو ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل اجتماعیت کی نفی ہے۔ اس قسم کے لوگ کتنی ہی کثیر تعداد میں جمع ہو

جائیں وہ کبھی بھی جماعت نہیں کہلائیں گے' بلکہ وہ ایک ہجوم اور انبوہ ہوگا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

ہجوم تو بہت بڑا جمع ہوسکتا ہے لیکن دنیا میں کوئی کام ہجوم (mob) سے نہیں ہوا۔ یہ صرف کوئی منفی کام ہی کرسکتا ہے' لیکن کوئی مثبت اور تعمیری کام کرنے کے لیے ایک منظّم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے' جن کے مراتب (cadres) معین ہوں کہ کون کس کا حکم سنے گا اور مانے گا' اس نظم میں کون کس سے بالاتر ہے' اس کی تعیین ہو اور اس میں سمع و طاعت کا نظام چل رہا ہو' جو کہ حضورﷺ کے بعد لامحالہ سمع و طاعت فی المعروف ہے' لیکن اس میں سمع و طاعت کی روح برقرار ہو۔ یہ نہیں کہ جی میں آیا تو مان لیا جی میں نہیں آیا تو نہیں مانا۔ کسی اجتماع میں بلایا گیا ہے تو اگر طبیعت آمادہ ہوئی تو پہنچ گئے' اگر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی تو نہیں آئے۔ چھوٹے چھوٹے عذرات اور معمولی مشغولیتیں اور مصروفیتیں آڑے آئیں۔ معاشرے کی عام رسومات کو اس کام میں آڑے آنے دینے سے درحقیقت یہ اندازہ ہوتا ہے گویا اس کام کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔

تو فرمایا کہ مؤمن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور اُن میں سمع و طاعت کی یہ کیفیت پیدا ہو چکی ہے کہ جب بھی وہ رسولؐ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں ہوتے ہیں تو جب تک اجازت حاصل نہ کرلیں وہاں سے نہیں جاتے۔

آگے اسی بات کو اس کے دوسرے رخ کے حوالے سے بیان کردیا کہ: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''(اے نبیؐ!) بے شک جو لوگ آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں''۔ یعنی جو لوگ آپؐ سے اجازت حاصل کرکے رخصت ہوتے ہیں' یا کسی کام پر طلب کیا گیا ہو تو اگر کسی وجہ سے نہیں آسکتے تو پہلے سے عذر پیش کرکے آپؐ سے اِذن حاصل کرلیتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول

پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں احساس ہے کہ ہمیں اس کام میں شامل ہونا چاہیے تھا' حضورﷺ جس مہم پر بھیج رہے ہیں اس میں بہ دل و جان شریک ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے ایمان کا تقاضا یہی تھا کہ جب ہم ایک اجتماعی کام کے سلسلے میں حضورﷺ کے ساتھ ہیں تو وہاں سے نہ ہلیں جب تک کہ آپؐ سے اجازت طلب نہ کرلیں۔ ان کا یہ احساس بہت مبارک ہے' اور یہ درحقیقت ان کے ایمان کی علامت ہے' یہ احساس درحقیقت ان کے احساسِ فرض اور ان کے تصورِ نظم جماعت کا مظہر ہے۔ یہاں ایک طرح سے ان کی تعریف کی جارہی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ ''پس جب وہ آپؐ سے اپنے کسی کام کی وجہ سے اجازت طلب کریں تو آپؐ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں''۔ یعنی جب وہ اپنے کسی معاملے کی وجہ سے آپؐ کے سامنے معذرت پیش کریں یا بیماری یا کسی اور اہم مصروفیت کی بنا پر آپؐ سے اجازت طلب کریں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں۔ نوٹ کیجیے' فرمایا جارہا ہے کہ جسے آپ چاہیں اجازت دیں۔ یہ قابل غور بات ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر کسی نے معذرت کرلی ہے تو اب وہ یہ سمجھے کہ یہ آخری کام تھا جو میں نے کرلیا' اب مجھ سے اور کیا مطلوب ہے؟ میں نے نظمِ جماعت کا تقاضا تو پورا کرلیا' اب صاحبِ امر پر لازم ہے کہ وہ معذرت قبول کرے۔ یہ طرزِ عمل بھی اجتماعیت کی نفی ہے۔ اجتماعیت کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ نے اپنا معاملہ صاحبِ امر کے حوالے کردیا ہے' اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے عذر کو قابلِ قبول سمجھتا ہے یا نہیں۔ اس میں منطقی طور پر یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ضروری نہیں ہوتا کہ کسی کام کی پوری اہمیت سب کو بتادی جائے۔ وہ صاحبِ امر ہی جانتا ہے کہ اِس وقت کیا کام درپیش ہے' اس موقع کی کیا نزاکت واہمیت ہے اور اس کے نتائج کتنے دُوررس واقع ہو سکتے ہیں' یہ لمحہ اس جماعت' تحریک اور دعوت کے لیے کتنا فیصلہ کن ہوسکتا ہے۔ اب وہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرے گا کہ اس کے مقابلے میں میرے ساتھی

کے عذر کی کیا نوعیت و اہمیت ہے' اس نظم کو اس سے کتنا نقصان واقع ہونے کا اندیشہ ہے' اور اس کی معذرت قبول نہ ہونے کی صورت میں اس کو کتنی تکلیف پہنچے گی۔ ظاہر ہے ہر معاملے میں توازن رکھنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات لوگوں کے سامنے بھی ہو' لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کے سامنے ہو۔ بلکہ اس بارے میں حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے: ((اِسْتَعِیْنُوْا عَلَی الْحَوَائِجِ بِالْکِتْمَانِ)) ''اپنے مقاصد کے حصول میں اخفاء سے مدد لو''۔ اپنے تمام کارڈز ٹیبل پر نہیں رکھ دیے جاتے' اپنے تمام منصوبوں کا اعلان نہیں کیا جاتا' بلکہ بسا اوقات ایک تحریک میں اور خصوصاً کسی انقلابی تحریک میں ایسے مراحل ناگزیر ہیں کہ آپ کرنا کچھ چاہتے ہوں اور آپ تأثر کچھ اور دیں۔ آپ نے جانا مشرق کو ہے لیکن کچھ ایسے احوال پیدا کر دیے جائیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ایک ایک چیز علیحدہ کر کے بتا دی جائے۔ جس شخص پر امارت کی ذمہ داری ہے وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے' لہٰذا اگر آپ اس نظم سے منسلک ہیں تو آپ کی روش یہ ہونی چاہیے کہ آپ نے ایک عذر پیش کر دیا' اب ذہناً تسلیم کریں کہ صاحب امر کا اختیار ہے' اگر وہ میرے عذر کو قابلِ قبول سمجھتا ہے تو ٹھیک ہے' نہیں سمجھتا تو دنیا کی کوئی مجبوری و رکاوٹ اور کوئی مشغولیت اس کام سے بڑھ کر اہم نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ترجیحات کی تعیین نہ ہوئی تو کام آگے نہیں چلے گا اور قدم قدم پر رکاوٹ پیش آئے گی۔ چنانچہ اس راہ میں پہلی شرطِ لازم یہی ہے کہ آدمی طے کر لے کہ یہ کام مقدم ہے اور باقی سب کچھ مؤخر ہے ؏ شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

ہر تحریک میں ہر مرحلہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ فیصلہ کن ہی ہو' لہٰذا اس موقع کے اعتبار سے اگر آپ نے کوئی عذر پیش کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن نظم کا تقاضا یہ ہو گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ عذر کا پیش کر دینا ہی بس آخری تقاضا تھا جو پورا ہو گیا' بلکہ انسان کو ذہناً تیار ہونا چاہیے کہ اگر عذر قبول ہو گا تو ٹھیک ہے' ورنہ مجھے ہر دوسرے کام پر اِس کام کو ترجیح دینی ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ان کے لیے اللہ سے استغفار بھی کیجیے''۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ انہوں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ استغفار کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تو اجازت طلب کی ہے' وہ بغیر اِذن کے نہیں گئے ہیں اور ان کو اللہ پہلے سے سند دے چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کسی دنیاوی مصروفیت کو اتنا اہم سمجھا کہ دین کے کام سے رخصت چاہی اور فی نفسہٖ یہ شے ایک کمزوری کی علامت ہے۔ ؏ ''نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی!'' کے مصداق میں یہ بات کبھی اس انداز سے بھی سمجھایا کرتا ہوں کہ فرض کیجیے اگر کوئی بیمار ہے تو کیا شفا آپ کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس کی زندگی اور موت کا دار و مدار آپ کی موجودگی پر ہے؟ اگر کسی کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا آپ کے وہاں جائے بغیر تدفین نہیں ہو گی؟ یا فرض کیجیے کہ کوئی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے تو کیا آپ جا کر حضرت عزرائیل کو روک لیں گے؟ اسی بات کا دوسرا رخ دیکھئے! کیا اللہ ہر چیز پر قادر نہیں ہے؟ کیا وہ وہاں آپؐ کے بغیر اس ضرورت کو پورا نہیں فرما سکتا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ))(۱) ''اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کے کسی کام میں لگا ہوا ہو تو اللہ اس کے کام کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے''۔ یہ تو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے' آپ اپنے کسی بھائی یا رفیق یا کسی عزیز کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو اللہ آپ کے کام میں لگ جاتا ہے' تو آپ سوچئے کہ اگر آپ اللہ کے کام میں لگے ہوئے ہوں تو کیا اللہ آپ کے کام میں نہیں لگے گا؟ بقول شاعر

کار سازِ ما بہ فکر کارِ ما
فکر ما در کارِ ما آزارِ ما!

یعنی میرا کارساز میرے کام کی فکر میں ہے اور اپنے کام کی خود فکر کرنا میرے لیے آزار کا موجب بن جاتا ہے۔ انسان کی فکر محدود ہے' علم محدود ہے اور عقل محدود ہے' تو جب وہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب المظالم والغضب' باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

خود فکر کرے گا، خود تدبیر کرے گا تو لازماً ٹھوکر کھائے گا اور اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لے گا۔ تو کیا ''تفویض الامر الی اللہ'' آسان ترین نسخہ نہیں ہے کہ ''اپنے کام کو اللہ کے حوالے کر دو''۔ اور کسی کام کا اللہ کے حوالے کر دینے کا انتہائی یقینی طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے کام میں لگ جائیں۔ ویسے تو آپ خود تدبیر کرتے ہوئے بھی اللہ سے دعا مانگ سکتے ہیں لیکن اگر آپ اللہ کی نصرت کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ لازماً آپ کی نصرت کرے گا۔ اس لیے کہ کسی شریف اور بامروّت انسان سے بھی یہ بات بعید ہے کہ آپ اس کے دست و بازو بنیں اور وہ آپ کو تن تنہا چھوڑ دے، تو اللہ کے بارے میں کیسے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے! اور دین کا کام ایک طرح سے اللہ کی نصرت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾ (الصّف:۱۴) ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کے معاملے میں؟'' ایک اور جگہ فرمایا: ﴿وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ﴾ (الحدید:۲۵) ''اور اللہ جاننا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اُس کی اور اُس کے رسول کی مدد کرتے ہیں غیب میں ہونے کے باوجود''۔ یعنی فی الاصل تو یہ ایک کمزوری ہے، البتہ جنہوں نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرنے کی پروا ہی نہیں کی، جنہیں نظم کا سرے سے احساس ہی نہیں ہے، ان سے تو یقیناً بہتر ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنا عذر پیش کیا، معذرت کی اور اجازت طلب کی۔ لیکن فی الاصل یہ ایک کمزوری کی بات ہے۔ دین کے اس کام میں تو ایسا ہونا چاہیے کہ ''ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' کہ جو کچھ بھی ہو، ہم تو اب دریا میں اپنی کشتی ڈال چکے ہیں اور ہم نے اپنے تمام معاملات بہ تسلیم و رضا اللہ کے حوالے کر دیے ہیں۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

اس ضمن میں سورۃ التغابن کے درس میں جو چیزیں آتی ہیں، یعنی تفویض الامر اور تسلیم و رضا، ان تمام کیفیات کو یہاں اپنے ذہن میں لے آیئے۔ تو فرمایا: ﴿فَاۡذَنۡ لِّمَنۡ شِئۡتَ مِنۡہُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَہُمُ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۶۲﴾﴾ ''تو آپ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیں اور ان کے لیے اللہ سے معافی طلب کریں، یقیناً اللہ غفور ہے، رحیم ہے''۔ اور اسی کا ایک عکس، جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا، تمہیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے امراء کے لیے کیا ہدایات ہیں یہ بات اگلے درس میں آئے گی، لیکن یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کا طرزِ عمل یہی تھا کہ آپ سے جو بھی آ کر عذر پیش کرتا آپ جرح کیے بغیر اُس کا عذر قبول کر لیتے اور رخصت عطا کر دیتے تھے۔ اس لیے کہ خواہ مخواہ کسی کے لیے ایک ایسی آزمائش پیدا کر دینا یا اس کے لیے فوری طور پر کوئی بڑا امتحان لے آنا خلافِ مصلحت ہے۔ اس کی حقیقت آگے چل کر کھلے گی۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر محسوس بھی ہو کہ میرے کسی ساتھی نے اس وقت کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے تب بھی اس کے لیے استغفار کریں اور خود بھی اسے معاف کریں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی تو غفور ہے، رحیم ہے۔ سورۃ التغابن کی یہ آیت ذہن میں تازہ کیجیے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَاَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہو، اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو یقیناً اللہ غفور ہے، رحیم ہے۔''

یعنی اپنے اہل و عیال کی تربیت کے اعتبار سے جو روش اَنسب ہے وہی اختیار کرنی چاہیے اور وہی روش امراء کو اپنے مأمورین کے ساتھ اختیار کرنی چاہیے۔ اب یہاں بظاہر خطاب تو حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں بالواسطہ طور پر خطاب کا رُخ لوگوں کی طرف ہے کہ تم اپنی جگہ پر یہ سمجھ لو کہ دین کے اس کام سے عذر پیش کرنا اور رخصت

طلب کرنا فی الاصل ایک کمزوری ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یا تو اللہ پر توکل میں کمی ہے یا آپ ابھی مطمئن نہیں ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں خامی اور کمی ہے۔ع نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی!

اب آگے چلیے۔ فرمایا: ﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ﴾ ''مت ٹھہراؤ رسول کے بلانے کو اپنے مابین اس طرح جیسے تمہارا ایک دوسرے کو بلا لینا''۔ یہاں لفظ دعا (پکارنا' بلانا) محتمل المعنیین ہے اور اس کے دونوں مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ یہاں ''رسولؐ کو بلانا'' بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آپ رسولؐ کو بلا رہے ہوں اور ''رسولؐ کا بلانا'' بھی ہو سکتا ہے کہ رسولؐ آپ کو بلا رہے ہوں۔ یہ پکارنا دو طرفہ مفہوم کا حامل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ رسول ﷺ سے گفتگو کرنے کو تم ایسا نہ سمجھ لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو۔ آپ ﷺ کا ادب و احترام اور اُن کی تعظیم ملحوظ نہیں رکھو گے تو اس اجتماعیت کو نقصان پہنچے گا جس کی شیرازہ بندی رسول کی مرکزی شخصیت کے گرد ہو رہی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحجرات میں پورے شرح و بسط کے ساتھ آ چکا ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝۳﴾

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور ان سے اس طرح بلند آہنگی سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' مبادا تمہارے سب اعمال غارت ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ حقیقت میں تو وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو رسول کے سامنے پست رکھتے ہیں وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے''۔

وہاں واقعات کے پس منظر میں ہدایات بھی آ گئیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ۝۴ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡہِمۡ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝۵﴾

''یقیناً جو لوگ پکارتے ہیں آپؐ کو حجروں کے باہر سے اُن میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکل آتے تو یہ اُن کے حق میں بہتر تھا' اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

تو یہ رُخ بھی یہاں مراد ہو سکتا ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحجرات میں آ گیا ہے۔ یہاں ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ اسی ادب و احترام کا ایک عکس اپنے امراء کے لیے ہونا چاہیے۔ بیعت ارشاد میں بھی یہی آداب تلقین کیے جاتے ہیں کہ جس مرشد کے ساتھ آپ نے اپنا ایک تعلق قائم کیا ہے' آپ اس سے ایک رہنمائی چاہ رہے ہیں' اس کی ہمت سے آپ اپنی ہمت کی تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اگر اس کا ادب و احترام نہیں ہو گا تو آپ ہی کو کچھ حاصل نہیں ہو گا' ان کا کیا بگڑے گا! جیسے کہا جاتا ہے: با ادب با نصیب' بے ادب بے نصیب۔ یہاں پر وہ معاملہ درجہ بدرجہ اس نظمِ جماعت میں بھی ہے کہ ہر شخص اپنے سے بالاتر کے ساتھ یہی انداز اختیار کرے۔ اسی کی انتہائی شکل آپ کو ملٹری ڈسپلن میں ملتی ہے۔ اپنے سے بالاتر کو سلیوٹ کرنا اسی حوالے سے ہے۔ اگر یہ نہیں کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نظم اور ڈسپلن کا مظاہرہ نہیں ہو رہا۔ لہٰذا اپنے امراء کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ نہ صرف بالفعل موجود ہو بلکہ ظاہر بھی ہو رہا ہو' اس کی ایک فضا طاری ہو جائے۔ ان آداب کے اعتبار سے یہ تو ایک پہلو ہو گیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ کو رسول ﷺ نے بلایا اور طلب کیا ہے تو اسے کسی دوسرے کے طلب کرنے کے برابر نہ ٹھہرا لو۔ کسی اور کی طلبی پر آپ حاضر ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ اسے تھوڑی سی شکایت ہو جائے گی' وہ کچھ گلہ و شکوہ کر لے گا لیکن رسولؐ کے بلانے کو اس پر قیاس نہ کر لینا۔ اس کو بھی ذہن میں رکھئے کہ ایک تو بحیثیت رسول ان کا بلند ترین مقام ہے' لیکن اسی میں ہمارے لیے رہنمائی اور تعلیم

مضمر ہے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں امیر کا طلب کرنا اپنے کسی دوست، کسی بھائی یا کسی عزیز کا طلب کرنا نہیں ہے۔ اس نظمِ جماعت کی طرف سے جب طلب کیا جائے تو نقشہ وہی ہونا چاہیے جو اِن اشعار میں بیان ہوا ہے۔

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہ دو اشعار بہت عمدہ ہیں اور یہ تحریکی مزاج کے عکاس ہیں کہ کسی انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کا کیا انداز ہونا چاہیے۔ یہ کہ جیسے ہی گھنٹی بجی اور اس جرس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی، تو آواز تنہا واپس نہیں گئی، ہم اس کے ساتھ ہی گئے۔ اس راستے میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں، خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں، ان میں سے کوئی چیز بھی راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔

بہرحال جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عذر پیش کرنا فی الاصل کمزوری کا اظہار ہے۔ کیوں نہیں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کرتے؟ کیوں نہیں اپنے معاملات سے بے فکر ہو کر اس کام میں لگ جاتے؟

آگے فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ﴾ ''اللہ اُن کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں''۔
''قَدْ'' کے آنے سے بات میں ایک قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر فعل ماضی پر آتا ہے اور اس کو ''فعل حال مکمل'' (Present Perfect Tense) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں یہ مضارع پر آ رہا ہے اور اس سے مراد ہے کہ یہ معاملہ ایک ہی واقعہ سے متعلق نہ سمجھنا، بلکہ اللہ کا یہ معاملہ دائمی ہے، جاری و ساری ہے اور اس میں قطعیت اور حتمیت ہے۔ یہاں لفظ ''يَتَسَلَّلُوْنَ'' استعمال ہوا ہے۔ سَلَّ۔ يَسُلُّ کا مطلب ہے نیام سے تلوار کھینچ لینا، تلوار سونت لینا۔ باب تفعل میں تَسَلَّلَ۔ يَتَسَلَّلُ

کا مطلب ہوگا کھنچ جانا، خود نکل جانا۔ بہترین ترجمہ ہوگا کھسک جانا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں تم میں سے وہ لوگ جو کھسک جاتے ہیں ایک دوسرے کی اوٹ لے کر۔ حضور ﷺ نے طلب کیا ہے تو جمع تو ہو گئے۔ لیکن اب ڈر رہے ہیں کہ معلوم نہیں مسئلہ کیا ہے۔ شاید کوئی عام بات ہو، یا ویسے ہی مشورہ ہو، یا کوئی سماجی قسم کا معاملہ ہو، اس مغالطے میں پہنچ تو گئے۔ آگے جا کر معلوم ہوا کہ کوئی جیش بھیجنا ہے، لشکر کی روانگی کا فیصلہ ہے۔ حضور ﷺ نے مطالبہ رکھا ہے کہ ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ ''نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل''۔ لہٰذا اب جان پر بنی ہوئی ہے کہ کسی طریقے سے نظر بچا کر کھسک جائیں۔ ان الفاظ میں ایک پوری ذہنیت کا نقشہ موجود ہے کہ جو جان کترا کر نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ اہل ایمان کا معاملہ تو اس کے برعکس یہ ہوتا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

ایک اور مقام پر اس ذہنیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾﴾ (الحج)

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے کنارے، پس اگر اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اسے کوئی آزمائش پہنچتی ہے (کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے) تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ''۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾﴾ ''تو ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو رسولؐ کے معاملے کی مخالفت کر رہے ہیں مبادا اُن پر کوئی بہت بڑا فتنہ مسلط ہو جائے یا اللہ کی طرف سے اُن پر کوئی دردناک عذاب مسلط کر دیا جائے''۔

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''خبردار رہو! آسمانوں اور زمین

میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے''۔ لِلّٰہِ کے شروع میں جو لام ہے یہ لامِ تملیک بھی ہے اور ''لامِ استحقاق'' بھی۔ یہ قدرت کے لیے بھی ہے' یعنی جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے' اللہ ہی کے دستِ قدرت میں ہے' کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں' کوئی چیز اُس کے اختیار سے آزاد نہیں۔ تمام عناصرِ فطرت اُس کے حیطۂ قدرت میں ہیں۔ تمام سلسلۂ اسباب وعلل اُس مسبّب الاسباب کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ تم چلے جاؤ گے تو یہ ہو جائے گا اور تم گھر میں نہیں رہو گے تو یہ ہو جائے گا۔ ہو گا وہی جو اِذنِ ربّ ہو گا۔ اور اگر تم اس کے ساتھ اپنے معاملے کو درست رکھو تو وہ تمہارے معاملے کو درست کرے گا۔ ﴿قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ ط﴾ ''تم جس روش پر ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے''۔ بامحاورہ ترجمہ ہو گا کہ تم جتنے پانی میں ہو اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ جس روش پر تم ہو وہ اس کے علم میں ہے۔ ایمان کتنا کچھ ہے' اس میں نفاق کس حد تک سرایت کر گیا ہے' اس میں کس حد تک واقعتاً آخرت کی ترجیح ہے اور کس حد تک دنیا طلبی شامل ہو گئی ہے' اللہ خوب جانتا ہے۔ ﴿وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْہِ فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا ط﴾ ''اور جس دن وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ ان کو (اپنے علمِ کامل کی بنا پر) جتلا دے گا (بتا دے گا) جو کچھ کہ انہوں نے عمل کیا تھا''۔ ﴿وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۶۴﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔

اب آیئے دوسرے مقام کی طرف۔ یہ سورۃ التوبۃ کی آیات ۴۳ تا ۴۹ پر مشتمل ہے۔ یہاں پس منظر میں غزوۂ تبوک اور اس کے لیے نفیرِ عام ہے' لہٰذا یہاں جو ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے اگر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے تو دونوں مقامات کے مابین جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے اس کو رفع کرنے میں مدد ملے گی۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران جتنی بھی جنگیں اور غزوات ہوئے اور آپؐ نے جتنے بھی سرایہ بھیجے' کبھی بھی آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں ہر مسلمان کا شریک ہونا لازمی ہے' بلکہ سارا دار و مدار ترغیب وتشویق پر ہوتا تھا کہ لوگو! نکلو اللہ کی راہ میں اور جنت حاصل کرو۔ ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کے

مصداق ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیرِ عام ہوئی اور سب کے لیے نکلنا لازم قرار دیا گیا' اِلّا یہ کہ کوئی شخص عذر پیش کر کے اجازت حاصل کرے۔ تو اس طرح کا لزوم صرف غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ وہاں منافقین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ ۹ھ تھا اور اُس وقت تک یہ شجرۂ خبیثہ پورے طور پر برگ و بار لا چکا تھا۔ اب وہ آ رہے ہیں اور جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر اللہ کے رسول ﷺ سے اجازت طلب کر رہے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی مروّت کا یہ عالَم تھا کہ آپؐ نے کبھی کسی جھوٹے کو اس کے مُنہ پر جھوٹا نہیں کہا۔ یہ نہ سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حالات سے بے خبر تھے۔ یہ تو ہر صاحب بصیرت شخص اندازہ کر لیتا ہے کہ فلاں شخص اِس وقت جھوٹ بول رہا ہے اور اس شخص کی اصل کیفیت کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو عام اہل ایمان کے بارے میں فرمایا: ((اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ))[1] ''مؤمن کی فراست سے ڈرو' اس لیے کہ وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''۔ تو آپ غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی فراست کا عالم کیا ہو گا! لیکن رسول اللہ ﷺ اچھی طرح جاننے کے باوجود اُن کے عذر تسلیم کر لیتے تھے اور انہیں رخصت دے دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ وہ جری ہو کر استہزاء کے انداز میں کہا کرتے تھے کہ ''ھُوَ اُذُنٌ'' کہ یہ تو صرف کان ہی کان ہیں۔ گویا اِن کے دماغ میں (معاذ اللہ) بھیجا نہیں ہے' ہم جھوٹ بولتے ہیں اور یہ مان لیتے ہیں' ہم جا کر بالکل بغیر کسی حقیقت کے کوئی بناوٹی عذر پیش کرتے ہیں اور وہ تسلیم کر لیتے ہیں' جو چاہو اِن کے کان میں اُتار دو یہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ عادت کس قدر راسخ تھی کہ جس نے عذر پیش کیا آپؐ نے قبول کر لیا۔ اس میں یقیناً مصلحت یقیناً تھی' جو آگے بیان ہو جائے گی۔ جو بھی چیز اخلاقِ عالیہ و فاضلہ کے مطابق ہو گی اس میں مصلحت یقیناً ہو گی' لیکن اگر کسی وقت بالفعل کوئی مصلحت نظر نہ آئے تو بھی کوئی حرج نہیں' آدمی اس پر اپنے اخلاق کے تقاضے کے اعتبار سے

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ الحجر۔

عمل کرتا ہے۔

یہاں ذرا گرفت کا انداز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو کچھ ٹوکا گیا ہے کہ ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ﴾ یہ ''انشائیہ'' کلمہ بھی ہوسکتا ہے اور خبریہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے ''رضی اللہ عنہم'' خبریہ کلمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''اللہ اُن سے راضی ہو گیا'' اور دعائیہ کلمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''اللہ اُن سے راضی ہو جائے''۔ تو یہاں بھی دو ترجمے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ''اللہ نے آپؐ کو معاف فرما دیا''۔ یہ کلام خبریہ ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ''اللہ آپؐ کو معاف فرمائے''۔ یہ کلام انشائیہ ہے۔ لیکن کس بات پر؟ فرمایا: ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ ''آپؐ نے ان کو اجازت کیوں دی (آپ نے ان کا عذر کیوں قبول کیا)؟ یہاں تک کہ آپ پر واضح ہو جاتا کہ کون ہیں جو (اپنے ان عذرات میں) سچے ہیں اور آپ جان لیتے کہ کون ہیں جو جھوٹے ہیں''۔

نوٹ کیجیے کہ یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جیسے سورۃ العنکبوت کے آغاز میں آئے ہیں۔ وہاں فرمایا: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ﴾ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''پس اللہ لازماً جان کر رہے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور لازماً جان کر رہے گا ان کو بھی جو جھوٹے ہیں''۔ لیکن چونکہ اللہ تو جانتا ہے، اس کا علم تو کامل ہے، لہٰذا ہم ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''پس اللہ لازماً ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں''۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر پھر یہ بات آئی کہ: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ ''اور اللہ لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون مؤمن صادق ہیں اور لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون منافق ہیں''۔ تو یہاں پر بھی وہی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی آزمائش ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا ہے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ جب آپ نے عذر قبول کر لیا تو آزمائش ختم ہوگئی اور ان کے نفاق پر پردہ پڑا رہ گیا۔ اگر آپ تحقیق کرتے اور پھر آپ کہتے کہ نہیں یہ عذر تو اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے، ذرا دیکھئے تو سلطنتِ روما سے ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے، کتنا نازک وقت ہے جو اسلام اور عالمِ اسلام پر آ گیا ہے

اور آپ لوگ اپنے ان عذرات کو پیش کر رہے ہیں، آپ کا عذر قبول نہیں ہے۔ اگر آپؐ یہ کہہ دیتے تو اب ان کے لیے امتحان ہو جاتا۔ جانا تو انہوں نے پھر بھی نہیں تھا، لیکن واضح تو ہو جاتا کہ ان کے اندر سرکشی ہے، تمرّد ہے، معصیت اور نافرمانی ہے۔ جب آپؐ نے اجازت دے دی، معذرت قبول کر لی تو اُن کے نفاق کا پردہ چاک نہیں ہوا۔

آگے فرمایا: ﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ﴾ ''یقیناً جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپؐ سے یہ رخصت نہیں چاہ سکتے (معذرت نہیں کر سکتے) کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اپنے جان اور مال سے''۔ وہ کبھی عذر پیش کر کے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ انہیں دل و جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ یہ تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے، لہٰذا اہل ایمان اس سے کیسے رخصت طلب کریں گے؟

یہ ہے وہ ظاہری تضاد جو ان دو مقامات پر نظر آتا ہے۔ وہاں (سورۃ النور میں) الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''(اے نبی!) یقیناً جو لوگ آپؐ سے اِذن طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر''۔ جبکہ یہاں فرمایا کہ ''جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو اِذن طلب نہیں کرتے''۔ یہ بظاہر ایک دوسرے کے برعکس باتیں ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ایک تو اس کی تاویل خاص ہے کہ سورۃ التوبہ کی آیات غزوۂ تبوک کے پس منظر میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اس سے قطع نظر عام حالات میں بھی اس کی تطبیق یوں کی جا سکتی ہے کہ اگر تین سیڑھیاں ہوں جیسے منبر کی ہوتی ہیں، تو ظاہر ہے کہ پہلی سیڑھی سے دوسری بلند تر ہے، لیکن تیسری کے مقابلے میں یہ پست تر ہے۔ چنانچہ بلندی اور پستی اضافی (relative) چیزیں ہیں۔ یہ بات اگر سامنے رکھی جائے کہ کون سی شے کس کے حوالے سے پست ہے اور کس کے حوالے سے بلند ہے تو پھر اس کے تین درجے ہوں گے۔ اصل درجہ جو مطلوب ہے وہ یہ کہ رخصت

طلب ہی نہ کی جائے' اس لیے کہ اگر آپ کو اللہ کی قدرت پر اور اس کے مسبّبُ الاسباب ہونے پر یقین ہے' آپ مانتے ہیں کہ اللہ آپ کی ضروریات کو آپ سے بہتر جانتا ہے اور وہ آپ کے مسئلے کو خود آپ کے انداز سے کہیں بہتر طور سے حل کر سکتا ہے تو پھر عذر کی گنجائش کہاں سے نکلے گی؟ تو جو کوئی بھی واقعتاً ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے وہ تو عذر پیش نہیں کرے گا' رخصت نہیں چاہے گا۔ لیکن اس سے نیچے آیئے تو معلوم ہو گا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چپکے سے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور اجتماعی معاملات میں شریک ہی نہیں ہوتے' یا وہاں سے خاموشی سے کھسک جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ عذر پیش کرتے ہیں اور نہ رخصت طلب کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مقابلے میں عذر پیش کرنے والے صاحبِ ایمان قرار پائے کہ اِن کے مقابلے میں اُن کے ایمان کی نفی ہو جائے گی جو عذر بھی پیش نہیں کرتے۔ لیکن جو معیارِ مطلوب اور مقامِ مقصود ہے اس کے اعتبار سے معذرت اور رخصت طلب کرنا گویا ایمان کی نفی کے مترادف ہے۔ چنانچہ یہ درحقیقت relative معاملہ ہے۔

اس میں دوسرا پہلو تأویلِ خاص کا ہے کہ جب نفیرِ عام نہ ہو تو عذر کا طلب کیا جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے' اور جب اس شدت کے ساتھ حکم دیا گیا ہو کہ اب ہر ایک کو نکلنا ہے تو اس سے موقع کی جو نزاکت سامنے آتی ہے اس کے اعتبار سے عذر طلب کرنا کوئی اور معنی رکھے گا۔ تو ان دونوں پہلوؤں سے ان کے مابین تطبیق کو جان لینا چاہیے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور اللہ جانتا ہے ان کو کہ جن کے دلوں میں تقویٰ ہے''۔ جن میں ایمان ہے' خشیت ہے' انابت ہے۔ وہ اللہ کی رضا جوئی میں سرگرداں اور سرگرم ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَسۡتَاۡذِنُكَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ ''یقیناً (اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے (اس موقع پر بھی) اجازت طلب کرتے ہیں یہ تو وہی ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے'' ﴿وَارۡتَابَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ فَهُمۡ فِىۡ رَيۡبِهِمۡ يَتَرَدَّدُوۡنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور ان کے دل (ریب اور) شک کے اندر مبتلا ہو چکے ہیں (ان کے

دلوں میں شکوک و شبہات نے ڈیرے جما لیے ہیں) تو وہ اپنے اس شک کی وجہ سے متردّد ہو کر رہ گئے ہیں''۔ رَدَّ۔ یَرُدُّ کا مطلب ہے ''لوٹا دینا'' اور بابِ تفعل میں اس کا مطلب ہوتا ہے ''خود لوٹنا''۔ جبکہ مُتَرَدِّدٌ ہو گا ''خود لوٹنے والا''۔ تو گویا یہ متردّد ہو کر رہ گئے ہیں کہ آگے بڑھیں نہ بڑھیں! چلیں نہ چلیں! اسی کو تَرَبُّص کہا گیا ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَهٗ عُدَّةً﴾ ''اور اگر ان کا واقعی (اللہ کی راہ میں) نکلنے کا ارادہ ہوتا تو انہوں نے اس کے لیے تیاری کی ہوتی (اہتمام کیا ہوتا' سامان جمع کیا ہوتا)''۔ ان کا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ ان کی نیت خراب تھی' عین وقت پر آ کر کہہ دیا کہ میری یہ مجبوری ہے' جبکہ اس کے لیے اہتمام سرے سے کیا ہی نہیں۔ انہوں نے اپنے مسائل کے حل کے لیے کوئی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ ان کا اصل ارادہ تو اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر ان کا واقعی نکلنے کا ارادہ ہوتا تو کچھ تیاری تو کرتے۔ ﴿وَلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ﴾ ''اور لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہیں تھا''۔ اب یہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ شروع ہو رہا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی کوئی اندھی' بہری کائنات نہیں ہے' اس میں ایک ایسی ہستی کا ارادہ کارفرما ہے جو سمیع اور بصیر ہے' حیّ اور قیوم ہے' علیم اور خبیر ہے۔ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہے کہ ان کو توفیق نہ ملے۔ یہ اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں' اللہ ہی نے ان کا نکلنا پسند نہیں کیا۔ ﴿فَثَبَّطَهُمۡ﴾ ''پس انہیں جما دیا''۔ زمین میں ان کو گاڑ دیا۔ ان کے پاؤں منوں کے ہو گئے' وہ نکل نہیں پائے۔ ﴿وَقِيۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِيۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (انہیں) کہا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ''۔ اصل میں توفیق اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کا بھی اس نے قاعدہ بنایا ہے کہ جس کا ارادہ ہو گا اسی کو توفیق ملے گی' جس کا ارادہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسے زبردستی توفیق دے تو کائنات کا سارا نظم ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ تو امتحان گاہ ہے۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک: ۲) ''اس نے موت اور حیات کو تخلیق کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے عمل کے اعتبار سے اچھا''۔ وہ لشکر کے ساتھ کسی کو

زبردستی نکال دیا کرے تو نکلنے والوں کا کوئی کریڈٹ نہیں رہے گا اور نہ نکلنے والے قصوروار قرار نہیں پائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ سابقہ اور حکمتِ تخلیق کے مطابق ہے کہ جن کا ارادہ نہیں ہوتا انہیں اللہ بھی دفع کرتا ہے۔ جیسے سورۃ التوبۃ میں کہا گیا ہے: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ (آیت ۲۴) ”تو جاؤ (دفع ہو جاؤ) انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا آخری فیصلہ سنا دے“۔ لہٰذا اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں اس کی راہ میں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے کیوں نہیں چاہا؟ یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ فرمایا: ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ ”اگر یہ تمہارے ساتھ نکلتے (اس مہم میں تمہارے مابین ہوتے) تو نہ اضافہ کرتے تمہارے لیے مگر برائی کا“۔ یہ حقیقت ہے کہ شکوہ سنج اور ناراض افراد (disgruntled element) سے کوئی خیر وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ بے دلی سے کام کرنے والا کام بنائے گا کم اور بگاڑے گا زیادہ۔ وہ بدگمانیاں پیدا کرے گا، طرح طرح کے شوشے چھوڑے گا اور لوگوں میں انتشار پیدا کرے گا۔ تو ایسے لوگوں کا اس جمعیت میں ہونا تو درحقیقت ایک بالقوہ کمزوری (potential weakness) ہے۔ تعداد زیادہ ہونا ہر حال میں مفید نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ اس قسم کے تھڑدلے، خام ارادے رکھنے والے اور دنیا پرست لوگ تمہاری صفوں میں ہوں۔ ﴿وَلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ﴾ ”اور تمہارے مابین فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے“۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ اسی میں ہوتی کہ وہ تمہارے لیے فتنوں کی تلاش میں کہیں سے کوئی بات اُچک کر دوسری جگہ جا کر اسے ہوا دیں اور بے اطمینانی پیدا کریں۔ کہیں اَوس اور خزرج کے مابین پرانی عصبیتوں اور حمیتوں کی چنگاری بھڑکا کر انہیں آپس میں ٹکرانے کی کوشش کریں۔ اس طرح تو بہت اچھا ہوا کہ تمہاری جمعیت جو نکلی وہ خالص جمعیت تھی اور وہ ان عناصر سے پاک رہی۔

آگے فرمایا: ﴿وَفِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ﴾ اس کے بھی دونوں ترجمے مراد ہیں اور

دونوں ہی نہایت حکیمانہ ترجمے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا: ”تم میں ہیں وہ لوگ جو بہت سننے والے ہیں ان کے لیے“۔ اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تمہاری صفوں میں وہ لوگ موجود ہیں جو اُن کی باتیں بڑے دھیان سے، کان لگا کر اور دلی آمادگی سے سنتے ہیں۔ پرنالہ وہیں گرتا ہے جہاں نشیب ہو۔ تو وہ نشیب ان کے اندر موجود ہے لہٰذا پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے مابین ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کے لیے سنتے ہیں، یعنی تمہاری خبریں وہاں پہنچانے کے لیے تمہارے درمیان موجود ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں جاسوسی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں، درحقیقت ان کی حیثیت آلاتِ ترسیل (transmitters) کی ہے۔ یہ لوگ تمہاری باتیں خوب کان لگا کر سنتے ہیں کہ کوئی خبر رہ نہ جائے، کیونکہ انہوں نے فتنے کی آگ بھڑکانے کے لیے یہ باتیں ان تک پہنچانی ہوتی ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۴۷﴾ ”اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے“۔ اللہ کی نگاہوں سے وہ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰی جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸﴾ ”اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں، یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے رہے“۔

اب یہ وہ تاریخی پس منظر ہے کہ اے نبیؐ! یہ آپ کے لیے پہلے سے بہت سے فتنے اٹھا چکے ہیں، بہت سے مواقع پر انہوں نے فتنوں کی آگ بھڑکائی ہے اور آپؐ کے لیے معاملات کو تلپٹ کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ قَلَّبَ، یُقَلِّبُ، تَقْلِیْبًا کا مطلب ہے بدل دینا، کسی شے کو الٹ دینا۔ جیسے ارشاد ہوا: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام:۱۱۱) ”اور ہم پلٹ دیں گے ان کے دلوں اور نگاہوں کو اسی طرح جس طرح یہ پہلی مرتبہ (حق کا انکشاف ہونے کے باوجود) اس (کتاب) پر ایمان نہیں لائے تھے“۔ تو

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ آپ کے لیے معاملات کو تلپٹ کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے ہیں‘ یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا امر ظاہر ہو گیا۔ یہ جو حق آیا ہے یہ انہیں پسند نہیں ہے۔ ان کو تو بڑی ناگواری ہے۔ لیکن ان کی ناپسند اور ناگواری کے علی الرغم اللہ کا فیصلہ آ گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس وقت تک جزیرہ نمائے عرب میں تو رسول اللہ ﷺ کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ غزوۂ تبوک ۹ ھ کا معاملہ ہے جبکہ ۸ ھ میں مکہ فتح ہو چکا تھا‘ ۸ ھ ہی کے شوال میں غزوۂ حنین بھی ہو چکا تھا اور یوں سمجھئے کہ سرزمین عرب میں آخری معرکہ وہی تھا‘ تو عرب پر تو غلبہ ہو چکا تھا اور لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ سب کچھ جو ہوا ہے یہ بھی ان کی ناپسندیدگی کے علی الرغم ہوا ہے۔ اب بیرونِ ملک عرب‘ بین الاقوامی سطح پر انقلابِ محمدیؐ اور غلبۂ دینِ حق کا جو مرحلہ شروع ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بھی انہیں پسند نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اگر آپؐ کے ساتھ جاتے تو کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرتے‘ وہاں بھی کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتے۔ تو ایک اعتبار سے یہ بہتر ہی ہوا کہ یہ نہیں گئے۔

اب دیکھئے‘ ایک ہی بات کے کتنے رُخ ہیں۔ ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ ''آپؐ نے انہیں کیوں اجازت دی؟'' یہ علیحدہ بات ہے۔ آپ کو اجازت نہیں دینی چاہیے تھی‘ تاکہ ان کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی اور ان کی پردہ دری ہوتی کہ یہ کیا ہیں اور کتنے پانی میں ہیں‘ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہی بہتر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ اس بات کو ہم اپنے معاملات پر منطبق کریں تو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امیر جماعت کو ذہناً اس طرزِ عمل پر مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ اجتماعی معاملات میں ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کرے‘ لیکن اگر کوئی پیچھے رہتا ہے تو اس کے لیے زیادہ متفکر نہ ہو‘ اس کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے پیچھے رہ جانے ہی میں بھلائی ہو۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ تبوک میں بیس دن قیام پذیر رہے لیکن لڑائی نہیں ہوئی تو یہ ایک طرح سے اہل ایمان کی بہت اعلیٰ درجے کی پکنک تھی کہ حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور گفتگو ہو رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مدینہ میں رہتے

ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ گفتگو کے مواقع تو سب کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ بیرونِ مدینہ سے بھی لوگ اس لشکر میں موجود تھے۔ ۳۰ ہزار کے لشکر میں جانے کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوں گے! اور یہاں صبح و شام سب اہل ایمان آپؐ کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ تو وہاں پر ذکر ہو جاتا تھا کہ فلاں صاحب کیوں نہیں آئے؟ تو نبی اکرم ﷺ اس تذکرے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کا قولِ مبارک ہوتا تھا کہ ((دَعْهُ)) کہ چھوڑو اس کے ذکر کو۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو اللہ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر اس میں شر ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے شر سے نجات دی‘ اسی میں بہتری ہے۔ تو دراصل یہ انداز ہونا چاہیے۔ یہ بھی طے نہ کیجیے کہ لازماً شر ہے۔ اس لیے کہ آپ کے پاس تو علم کامل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عین وقت پر کوئی مجبوری پیش آ گئی ہو‘ زیادہ سے زیادہ خیر اور حسنِ ظن کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کریں‘ لیکن تشویش کو روکنے کے لیے اصولاً اس بات کو جان لیں کہ ہر شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہر شخص اپنا بنا رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے‘ اپنے لیے کمائی کر رہا ہے یا اپنے لیے وبال جمع کر رہا ہے‘ لہٰذا اس معاملے میں ہم کیوں خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا ہوں۔ اگر خیر ہے تو وہ ظاہر ہو جائے گی۔ کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تلافی کا معاملہ پیدا کر دے گا اور اگر شر ہے تو شر کا تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ﴾ ''اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے!'' اس قول کی ایک خاص تأویل بھی ہے اور عام تأویل بھی۔ دونوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے تو اجازت دے ہی دیجیے‘ مجھے آزمائش میں مت ڈالیے! یعنی اجازت نہیں دیں گے تو جانا تو میں نے پھر بھی نہیں‘ لیکن خواہ مخواہ میرے نفاق کا پردہ چاک ہو جائے گا! کیونکہ دل میں یہ فیصلہ پہلے سے موجود ہے۔ اگر آپ اجازت دے دیں گے تو میرا پردہ پڑا رہ جائے گا۔ مجھے خواہ مخواہ اس امتحان میں نہ ڈالیے۔ مجھے اس ابتلاء اور فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیجیے۔ فرمایا: ﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ

سَقَطُوْا ط﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ فتنہ میں تو وہ پڑ چکے‘‘۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ جب انہوں نے اللہ کی پکار پر‘ اللہ کے رسولؐ کے فرمان پر‘ اس جماعت کے کسی نظم کے تقاضے پر جو اقامتِ دین کے لیے قائم ہوئی تھی‘ اپنی کسی ضرورت‘ مصروفیت یا کسی مصلحت کو مقدم رکھا تو فتنے میں تو وہ پڑ چکے‘ اور امتحان کس شے کا نام ہے؟ اور ناکامی کس بلا کا نام ہے؟ ناکام تو وہ ہو چکے! سَقَطَ ۔ یَسْقُطُ کسی شے کے وقوع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا ایک مفہوم گر پڑنے کا بھی ہے۔ یعنی یہ تو گر چکے‘ ناکام ہو چکے‘ اب اور کس آزمائش سے بچنے کی فکر ہے؟ ﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (٤٩)﴾ ’’اور یقیناً جہنم ان کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے‘‘۔ اس سے بچ کر کہاں جائیں گے؟

اس قول کے بارے میں ایک خاص واقعہ بھی آتا ہے کہ جد ابن قیس (ایک منافق) نے آ کر بڑے گستاخانہ اور استہزائیہ انداز میں کہا کہ حضورؐ! مجھے تو آپ اس آزمائش میں نہ ڈالیے۔ میں ذرا حسن پرست انسان ہوں اور جس علاقے میں آپؐ یہ لشکر لے کر جا رہے ہیں وہاں کی رومی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں‘ معلوم نہیں میں اپنے اوپر قابو رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں‘ تو مجھے تو آپ اس امتحان میں نہ ڈالیے۔ مفسرین نے یہاں خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تأویلِ خاص ہو گی‘ لیکن تأویلِ عام اس واقعہ کی محتاج نہیں ہے‘ بلکہ وہ خود اپنی جگہ پوری طرح واضح ہے کہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار کے جواب میں عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا ایک کمزوری کی علامت ہے‘ اور خاص طور پر جنہوں نے نفیرِ عام کے اس موقع پر رخصت چاہی وہ تو گویا اپنی ناکامی پر مہر تصدیق پہلے ہی ثبت کروا چکے۔ اللہ تعالیٰ ان کیفیات سے ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ آمین!

بارك اللّٰه لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

درس ۱۰

اُمراء کا اپنے رُفقاء کے ساتھ طرزِ عمل
اور اُسوۂ رسول ﷺ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (٢١٤) وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٢١٥) فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (٢١٦) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (٢١٧)﴾ (الشُّعراء)

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (٨٨)﴾ (الحجر)

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ج تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (٢٨)﴾ (الکہف)

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ط مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (٥٢) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ط اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (٥٣) وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لا اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥٤)﴾ (الانعام)

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ (آل عمران)

اس درس کے تین حصے ہیں اور ہر حصے میں قرآن حکیم کے دو دو مقامات شامل ہیں اور اس کے لیے قرآن مجید کے چھ مختلف مقامات سے آیات منتخب کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس درس کے مضامین کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱) نرمی‘ شفقت اور احترام کا برتاؤ

سورۃ الشعراء اور سورۃ الحجر کی آیات میں حضور ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے بازو ان لوگوں کے لیے جھکا کر رکھیے جو اہل ایمان میں سے آپؐ کا اتباع کر رہے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾﴾ ’’اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے ان لوگوں کے لیے جو آپؐ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان میں سے‘‘۔ اور سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ’’اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھے جھکا کر رکھیے اہل ایمان کے لیے‘‘۔ ان آیات میں مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی‘ صرف یہی کہا گیا ہے کہ ’’اہل ایمان کے لیے اپنے شانوں کو جھکا کر رکھیے!‘‘

سورۃ الشعراء میں جو ’’مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ‘‘ آیا ہے تو یہ مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانیہ بھی۔ مِنْ تبعیضیہ ہونے کی صورت میں اس سے مراد یہ ہوگی کہ اگرچہ کہنے کو تو سبھی مسلمان ہیں‘ لیکن آپؐ کو جو اِس طرزِ عمل کا حکم دیا جا رہا ہے وہ صرف ان کے لیے ہے جو آپؐ کے بالفعل متبعین ہیں۔ یہاں گویا تخصیص ہو جائے گی کہ قانونی طور پر تو منافقین بھی مسلمان ہیں‘ لیکن ان کے لیے یہ طرزِ عمل مطلوب نہیں‘ بلکہ ان کے لیے برعکس طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو سورۃ التوبۃ اور سورۃ التحریم میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾

(التوبۃ: ۷۳ و التحریم: ۹) ’’اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کیجیے (کشمکش کیجیے) اور اُن پر سختی کیجیے!‘‘ یعنی منافقین کے ساتھ تو وہ معاملہ ہونا چاہیے جو کفار کے ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ بھی کشمکش کیجیے‘ جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے۔ جیسے کفار کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبۃ: ۱۲۳) ’’اور ہونا یہ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر (اپنے لیے) سختی پائیں‘‘۔ لہٰذا اس حوالے سے ’’مِنْ‘‘ تبعیضیہ ہے۔ اور یہ ’’مِنْ‘‘ بیانیہ بھی ہو سکتا ہے‘ یعنی اہل ایمان جو آپؐ کی اتباع کریں۔

اب چاہے اسے مِنْ تبعیضیہ مانا جائے یا مِنْ بیانیہ‘ نتیجے کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اصل حکم ان کے لیے نرمی‘ شفقت اور احترام کا ہے۔ انہیں اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ نے انہیں میری نصرت و اعانت کے لیے پسند کیا اور چن لیا ہے۔ کسی بھی داعی اور امیر کا اپنے تمام رفقاء اور ماتحتوں کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ ہونا چاہیے! ہر صاحب امر اور ذمہ داری کے منصب پر فائز ہر انسان کو اپنے ماتحت معاونین اور ساتھیوں کے ساتھ یہی رویہ رکھنا چاہیے‘ تاکہ انہیں بھی محسوس ہو کہ ان کے دلوں میں ان کی وقعت ہے‘ یہ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان پر شفقت کرتے ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں وہی الفاظ آئے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے ساتھ طرزِ عمل کے ضمن میں آئے ہیں کہ: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور جھکا دو اُن دونوں (والدین) کے لیے تواضع و انکسار کے شانے رحمت سے اور دعا کرو کہ اے میرے ربّ! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے میری بچپن میں پرورش کی‘‘۔ اس سے متصلاً قبل فرمایا: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾﴾ ’’پس انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو‘ اور ان سے بات کرو تعظیم کے ساتھ‘‘۔ اب وہی طرزِ عمل ’’خفضِ جناح‘‘ کے الفاظ میں یہاں پر ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا جو بھی کسی چھوٹی یا بڑی جمعیت کا ذمہ دار شخص ہو‘ جو بھی اجتماعیت پر امیر ہو‘ خواہ بڑی تعداد میں لوگ اس کی تحویل میں ہوں یا تھوڑی تعداد میں‘ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل اس طرح کا ہونا چاہیے۔

آگے فرمایا: ﴿فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾﴾ ''پھر اگر یہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے کہ میں تو اس سے بَری ہوں جو طرزِ عمل تم اختیار کر رہے ہو۔ اور آپؐ اُس ذات پر توکل کیجیے جو عزیز بھی ہے رحیم بھی ہے''۔ یعنی مأمورین اگر کوئی نافرمانی کرتے ہیں تو بھی انسان ان سے اپنا اظہارِ براءت تو ضرور کر دے کہ میں تمہارے اس عمل سے بری ہوں' لیکن اس سے کوئی تشویش نہ ہو۔ اس لیے کہ معاملہ توکّل کا کُل اللہ کے حوالے ہے' البتہ اپنا توکل اللہ پر رکھو' اپنی گنتی پر نہ رکھو' اپنے ساتھیوں سے زیادہ امیدیں وابستہ ہی نہ کرو' امید وابستہ کرو تو صرف اللہ کی ذات سے۔ جیسے اقبال نے کہا؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

جس شخص کی امید انسانوں سے وابستہ ہو جاتی ہے جب ان کی طرف سے اس کی امید کے برعکس رویہ ظاہر ہوتا ہے تو اس پر ردِّعمل کے طور پر مایوسی طاری ہوتی ہے اور اس کے قویٰ جواب دے دیتے ہیں' اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی ساری امید اللہ ہی کی ذات کے ساتھ ہو اُس صورتِ حال میں اس کا طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے غلط طرزِ عمل سے وقتی طور پر افسوس ہونا تو بالکل فطری بات ہے' لیکن اس پر کوئی مستقل منفی اثرات مترتب نہیں ہوں گے' اس لیے کہ اس کا توکّل کُل کا کُل اللہ پر ہے' اپنے ساتھیوں پر نہیں۔

یہ مضمون چونکہ آگے آ رہا ہے اس لیے اِس وقت میں نے آیت کے صرف اس حصے کو بیان کیا ہے کہ: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢١٥﴾﴾ اس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امراء سے اپنے مأمورین کے حق میں جو روش درکار رہے اس کا ایک وصفِ لازم ''خفضِ جَنَاح'' ہے' یعنی ان کے سامنے اپنے کندھے رحمت اور شفقت سے جھکا کر رکھنا' ان کے سامنے تواضع اختیار کرنا' تحکمانہ لہجہ اور انداز اختیار نہ کرنا۔

۲) کم حیثیت ساتھیوں کی دلجوئی

امراء کے لیے دوسرا مطلوبہ وصف خاص طور پر اُن ساتھیوں کی دلجوئی ہے جن کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقات سے ہو۔ یہ کسی اجتماعیت کے اندر ایک بڑا عملی مسئلہ ہوتا ہے جس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف تصوریت (idealism) ہے اور دوسری طرف حقیقت پسندی (realism)' ان دونوں چیزوں کو بیک وقت تھام کر رکھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور اس کے لیے جو بھی قانون اللہ نے بنا رکھا ہے اس کے اعتبار سے کسی بھی انقلابی جدوجہد میں صاحبِ حیثیت لوگ آئیں گے تو گاڑی چلے گی' صاحبِ ثروت لوگ آئیں گے تو وسائل جمع ہوں گے' صاحبِ وجاہت لوگ آئیں گے تو کچھ لوگ ان کے اثرات کی وجہ سے کھنچ کر آ جائیں گے۔ یہ حقیقت پسندی (realism) ہے' اور اسے نظر انداز کرنا غلطی ہوگی' یہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے خاص طور پر دعا کی کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے ایک کو تو ضرور میری جھولی میں ڈال دے۔ آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ ان حضرات کی معاشرے میں ایک حیثیت تھی' ایک مقام تھا۔ پھر یہ کہ ان کا ایک کردار تھا' ایک دفعہ جو بات تسلیم کر لیتے اس پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ ایسے باہمت اور باعزیمت لوگ آگے آئیں تو تحریک یا اجتماعیت کی گاڑی چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بلند ترین تصوریت کے آسمان پر پہنچ جائے اور وہاں سے نیچے ہی نہ اترے اسے تو یہ بات قابلِ اعتراض نظر آئے گی کہ اللہ کے رسول ﷺ طائف گئے اور وہاں صرف تین سرداروں سے ملے۔ کیا صرف ان کو دوزخ کی آگ سے بچانا مطلوب تھا؟ کیا وہاں کی عوام کا حق نہیں تھا؟ نبی کی دعوت تو عام ہونی چاہیے' اسے تو ایک ایک انسان کو جہنم کی آگ سے بچانا مطلوب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا: ((لَأَنْ يَهْدِيَ

اللّٰہُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ))[1] ''اگر ایک انسان کو بھی اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر دولت ہے''۔ کیا طائف میں اور انسان نہیں تھے؟ یہ وہ واقعیت پسندی اور حقیقت پسندی (realism) ہے جسے میں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میں نے یہ انداز اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ یہ چیزیں عملی طور پر ہوتی ہیں۔

انقلابی دعوت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اوّلاً اعلیٰ طبقات کو اپنا ہدف بناتی ہے' لیکن اس میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ نچلے طبقات سے لوگ آتے ہیں' یعنی غرباء' فقراء' غلام' مسکین' اس لیے کہ ان کے پاؤں کی بیڑیاں اتنی بھاری نہیں ہوتیں جتنی سرمایہ داروں اور سرداروں کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اگر اس دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کی دولت' حیثیت اور وجاہت متاثر ہوتی ہے' سرمایہ جاتا ہے' سرداری جاتی ہے' چودھراہٹ جاتی ہے۔ آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کا جملہ سنا ہوگا کہ ''اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر سکتا ہے لیکن کوئی دولت مند انسان آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا''۔ یہ اگرچہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے' لیکن یہ ایک عظیم حقیقت ضرور ہے۔ تو ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھیے۔ اعلیٰ طبقات سے جو لوگ آتے ہیں ان میں سے ایک ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ حضراتِ ابوبکر' عثمان' طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف' سعید بن زید رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جو مقام ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں آپ عشرۂ مبشرہ کہتے ہیں۔ بعد میں ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ایمان لا کر شامل ہوئے۔ لیکن یہ تو چھٹے سال کی بات ہے' جبکہ مقدم الذکر وہ لوگ ہیں جو شروع میں ایمان لائے اور ان میں سے ہر ایک کا جو مقام ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن جو فقراء وغرباء رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لائے ان میں ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ کی عنایت مجھ پر ہو اور ہم

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ' باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔
وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

آپ ﷺ کی توجہ کا مرکز بنیں' جبکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس تحریک کی اپنی ایک مصلحت تھی۔ فرض کیجیے کہ فقراء اور مساکین آپؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اُس وقت کوئی قریشی سردار آ گیا ہے تو اُس وقت آپؐ اس کی طرف التفات فرمائیں گے۔ یہ اس حقیقت پسندی کا تقاضا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ان فقراء اور مساکین کے دلوں پر چرکا لگے اور انہیں گمان ہو کہ کہیں ان کی نگاہ میں بھی دولت ہی کا تو اصل مقام نہیں ہے؟ کیا (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) ان کی نگاہ میں بھی دنیاوی مال و دولت اور وجاہت کی وہی قدر و قیمت ہے جو دوسروں کی نگاہوں میں ہے؟ تو اس سے شک وشبہ پیدا ہوگا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا' جس سے سورۂ عبس کا آغاز ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى (۱) اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰى (۲) وَمَا يُدۡرِيۡكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى (۳) اَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّكۡرٰى (۴) اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰى (۵) فَاَنۡتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۶) وَمَا عَلَيۡكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (۷) وَاَمَّا مَنۡ جَآءَكَ يَسۡعٰى (۸) وَهُوَ يَخۡشٰى (۹) فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰى (۱۰) كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ (۱۱) فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) فِىۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳) مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱۴) بِاَيۡدِىۡ سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۱۶)﴾

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ (اے نبیؐ!) تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے' یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نفع بخش ہو! جو شخص بے پروائی برتتا ہے' اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے' اور ڈر رہا ہوتا ہے' تو اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند رتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

اس انداز میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص شانِ جلالی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ قریشی سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ﷺ ان سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس دوران حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم آ گئے جو ایک نابینا صحابی تھے۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکے کہ صورتِ حال کیا ہے۔ وہ

اب بار بار حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں' جبکہ حضور ﷺ قریشی سرداروں سے محوِ گفتگو ہیں۔ ان سے حضور ﷺ کی (معاذ اللہ) کوئی ذاتی غرض نہ تھی' بلکہ ان غرباء اور فقراء کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ یہ صاحب حیثیت لوگ ایمان لے آئیں تو انہیں کچھ تحفظ حاصل ہو۔ دین کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ اقامت دین کی گاڑی آگے چلے گی۔ لیکن اُس وقت حضور ﷺ کو ذرا سی ناگواری ہو گئی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی کہ آپؐ کو یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس کا ایک اور رُخ بھی ہے کہ کفار اسے غلط رنگ دیتے تھے کہ اے محمدؐ! ہم تو آپؐ کے پاس آنا چاہتے ہیں' لیکن آپ نے ہمارے ان غلاموں کو جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں' اپنے گرد جمع کر رکھا ہے تو ہم کیسے آئیں! بہرحال ہمارا ایک مقام ہے۔ ہم اپنے مرتبے سے گر کر اِن لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے' لہٰذا اگر ہم سے گفتگو کرنی ہے تو ان کو ہٹائیے۔ یہ ان کی چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے اندر بددلی پیدا ہو اور جو جمعیت اکٹھی ہوئی ہے وہ بھی ساتھ نہ رہے اور ہم نے تو ساتھ دینا ہی نہیں ہے۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں تفصیل سے آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے خاص طور پر ان کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا کہ ﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾ (ھود: ۲۷) ''اور ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذِل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے''۔ یہ جو تمہارے گرد کچھ لوگ جمع ہیں یہ تو ہمارے گھٹیا درجے کے لوگ ہیں۔ اور یہ چشمِ سر سے دکھائی دے رہا ہے کہ کون لوگ تمہارے گرد جمع ہو گئے ہیں' ان کے اوپر گھمنڈ نہ کرنا' ان کی ہمارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تو یہ ایک نفسیاتی پیچیدگی ہے جو ہر تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور عملاً یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسائل ایک طرح سے اس دنیا میں پل صراط کی مانند ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ تھوڑا سا اِدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے اور تھوڑا سا اُدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے۔ ایک طرف Idealism

ہے اور دوسری طرف Realism ہے۔ ایک طرف واقعہ یہ ہے کہ اصل اہمیت تو تقویٰ' خشیت' انابت اور ایمان کی ہے اور دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کی کامیابی کا دارومدار اگرچہ بالکلیہ تو اللہ پر ہے لیکن اس کے جو بالفعل عوامل ہیں ان میں حیثیت اور وجاہت جیسی چیزیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ ان دونوں کے مابین ایک معتدل روش اختیار کرنے کے لیے بڑی بیدار مغزی اور فہم و فراست کی ضرورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا اِدھر اُدھر ہو جانا قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی اس معاملے میں گرفت ہوئی ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ہم سے تو خطا کا امکان سو گنا زیادہ رہے گا۔ تاہم اگر اصولی بات سامنے رکھتے ہوئے انسان اس معاملے میں متوازن رویہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہے تو اس کے لیے مفید ہوگا کہ قرآن حکیم کے ان مقامات کو اپنے سامنے رکھے جن میں اس کے لیے ہدایات موجود ہیں۔

اس ضمن میں سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ''اور روکے رکھیے اپنے آپ کو (تھامے رکھیے اپنے آپ کو) ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے ربّ کو صبح و شام پکارتے ہیں' وہ اُسی کے روئے انور کے طالب ہیں (اس کی رضا چاہتے ہیں)۔'' انسان کسی سے خوش ہوتا ہے تو اپنے پورے رُخ کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے ناراض ہیں تو رُخ دوسری طرف کر لیں گے اور بات کریں گے بھی تو آنکھوں میں آنکھیں نہیں ملائیں گے' بلکہ ذرا مغائرت کے ساتھ جواب دیں گے' اس سے زیادہ التفات نہیں ہو گا۔ چنانچہ اللہ کا رُخ چاہنا یا اللہ کے روئے انور کا طالب ہونا سے مراد ہے اس کی عنایت' شفقت اور محبت کی طلب کرنا کہ اللہ ان سے راضی ہو جائے' ان پر اللہ کی نظر کرم ہو۔ وہ اس کی عنایتوں کے طالب رہتے ہیں اور صبح و شام اس کو پکارتے رہتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ ''اور ان سے اپنی نگاہ نہ پھیریئے۔'' آپؐ دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ آپ کی توجہ کا اصل مرکز یہ ہونے چاہئیں' ان کی تربیت اور تزکیہ کیجیے' ان کو بہتر سے بہتر کیجیے! ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچانے

کے لیے مسلسل کوشاں رہیے اور ان سے اپنی توجہ کو ہٹائیے نہیں۔

آگے فرمایا: ﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''کیا تم دُنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہو؟'' یہ قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ ''تم چاہتے ہو دنیا کی زندگی کی چمک دمک'' لیکن ہم اس کی تاویل اس طرح کریں گے کہ آپؐ کے ظاہری طرزِ عمل سے لوگوں کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ آپ بھی (معاذ اللہ) دُنیوی زینت کے طلب گار ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے یہاں تو ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' کی رو سے طرزِ عمل کا معاملہ نیت پر موقوف ہے اور اللہ آپؐ کی نیت کو جانتا ہے۔ لیکن دنیا تو ظاہر سے فیصلہ کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپؐ کے ساتھی یہ سمجھیں کہ ہماری طرف نگاہِ کرم نہیں ہے' بلکہ نظرِ التفات ان صاحب حیثیت لوگوں کی طرف ہے اور شاید آپؐ کے دل میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے۔ چلیے یہ تو اپنے ہیں' آپؐ ان کی غلط فہمی رفع کر دیں گے' لیکن آپ کے مدّ مقابل بھی تو اسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ ان کی اقدار اور ترجیحات بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں' ان کی نگاہ میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے جن کی ہماری نگاہوں میں قدر و قیمت ہے۔ تو یہ درحقیقت اس اندیشے کا سدّ باب ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر (معاذ اللہ) الزام عائد کر رہے ہیں کہ آپ بھی فی الواقع حیاتِ دُنیوی کی زینت کے طالب ہیں۔

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ ''اور آپؐ اس کا کہنا نہ مانیے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔ نوٹ کیجیے یہاں الفاظ ہیں کہ انہیں ہم نے غافل کیا ہے' اصل میں وہ ہمارے یہاں سے مردود اور راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔ جیسے قرآن میں اہل ایمان کے لیے الفاظ ہیں کہ ''اللہ نے انہیں پسند کر لیا ہے'' اسی طرح جن کو یہ توفیق نہیں ملی گویا اللہ نے انہیں ردّ کر دیا ہے۔ اللہ نے انہیں آپؐ کی رفاقت و اعانت کے قابل ہی نہیں سمجھا تو ان کے دلوں کو اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ اب اگر وہ صاحب حیثیت ہیں یا اصحابِ سیادت و قیادت ہیں تو بھی آپؐ

ان کو چنداں اہمیت نہ دیجیے اور ان کی بات نہ سنیے! میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں امر کے معانی حکم اور مشورہ دونوں کے آتے ہیں۔ اسی طرح اطاعت کا معنی بالفعل کسی کی بات پر عمل کر لینا بھی ہے اور دلی آمادگی سے کسی کی بات بالفعل سن لینا بھی ہے۔ تو یہاں وَلَا تُطِعْ کا ترجمہ ہوگا کہ ''آپ ان کی بات پر کان ہی نہ دھریئے''۔ وہ لوگ آتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی مصلحتیں سمجھاتے تھے' مداہنت کی کوشش کرتے تھے۔ بار بار سفارتیں آ رہی ہیں' قریش کے بڑے بڑے سردار وفد کی صورت میں آتے تھے اور کہتے تھے کہ اے محمد (ﷺ)! جہاں آپ اشارہ کر دیں وہاں آپؐ کی شادی کر دی جائے گی' آپ جتنی کہیں گے دولت کا ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے' اور (معاذ اللہ) اگر آپ بادشاہ بننے کی ہوس میں ہیں تو اگرچہ آج تک کوئی ہمارا بادشاہ نہیں ہے اور ہم کسی کو بادشاہ تسلیم کرنے کے خوگر اور عادی نہیں ہیں' حریت ہمارے مزاج کا ایک جزوِ لاینفک ہے' لیکن ہم آپ کو بادشاہ مان لیتے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ تمام پیشکشیں موجود ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ اس طرح کی بات سننا بھی خطرے کی علامت ہے۔ آپ انہیں ایسا تأثر بھی نہ دیں کہ چلو بات سن تو رہے ہیں۔ اس سے انسان کو غلط امید وابستہ ہو جاتی ہے۔

مزید فرمایا: ﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴿۲۸﴾﴾ ''اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے''۔ یعنی آپ ان کی بات پر توجہ بھی نہ فرمائیے جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ وہ راندۂ درگاہ ہیں' ہم نے انہیں مسلوب التوفیق کر دیا ہے۔ اور وہ تو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے تمام معاملات حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ہر معاملے میں نظر آ رہا ہے کہ وہ کسی حد کے پابند نہیں ہیں' ان کی زندگی تو اس گھوڑے کی مانند ہے جس کی باگ ٹوٹ چکی ہو۔

یہی مضمون سورۃ الانعام میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ﴾ ''اور مت دھتکاریئے (اپنے سے دُور مت

کیجیے) ان لوگوں کو جو اپنے ربّ کو صبح وشام پکارتے ہیں' وہ اس کے رُخِ انور (اس کی رضا) کے متلاشی ہیں''۔ وہ اس کے نام کی مالا جپتے ہیں' اس کی تسبیح وتحمید وتہلیل کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں پنج وقتہ نماز کا نظام قائم نہیں ہوا تھا اور صرف صبح وشام کی نماز تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پنج وقتہ نماز کے نظام سے قبل کبھی دو اور کبھی تین وقت کی نماز تھی' بلکہ ابتدا میں تو صرف قیام اللیل ہی تھا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل کے نزول کے بعد پنج وقتہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہوا تو بات مختلف ہوگئی۔ یہاں صبح وشام اللہ کو پکارنے سے مراد صبح وشام کی نماز ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ''آپ پر ان کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں ہے اور نہ اُن پر آپ کے حساب کی کچھ ذمہ داری ہے''۔ ایک جگہ اہل ایمان سے یوں خطاب ہوا ہے: ﴿فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ﴾ (النور:۵۴) ''(لوگو!) ان (حضورﷺ) پر تو وہی ذمہ داری ہے جس کا بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے (وہی اس کے مسئول ہوں گے) اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے (اس کے مسئول تم ہی ہو)''۔ تو یہاں حضورﷺ سے خطاب ہے اور بصیغہ غائب اہل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ پر ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے' وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے وہ اپنا حساب اللہ کے ہاں خود دیں گے' اور نہ آپ کے حساب میں سے کسی شے کی مسئولیت ان پر ہے۔ آپؐ کو اپنا کام کرنا ہے اور آپؐ کا کام ہے پہنچا دینا۔ ﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (الشوریٰ:۴۸) ''آپ پر نہیں ہے مگر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری''۔ اب کون قبول کرتا ہے کون نہیں کرتا اس کی کوئی جواب دہی آپ سے نہیں ہے۔ ابوجہل نے کیوں نہیں مانا' بلالؓ نے کیوں مان لیا؟ اس سے آپ کا سروکار نہیں ہے۔ یہ یا تو اُن کا ارادہ ہے یا اللہ کی توفیق' دو ہی عوامل ہیں۔ آپ بلاتفریق اور بلاکم و کاست پہنچا دیجیے۔ اب کسے اللہ نے توفیق دی اور کسے ردّ کر دیا' یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون ردّ کیے جانے کے قابل تھا۔ نہ آپؐ کے ذمہ ان کے حساب میں سے کوئی شے ہے

اور نہ ان پر آپ کے حساب میں سے کوئی ذمہ داری ہے۔ ﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۲﴾ ''تو اگر آپ انہیں دھتکار دیں گے تو (معاذ اللہ) آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے''۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا اَهٰؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا﴾ ''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے' تاکہ یہ (انہیں دیکھ کر) کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے بڑا احسان فرمایا ہے؟'' یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو ہم قبول کرتے۔ یہ غریب غرباء' غلام' بے حیثیت لوگ' کیا یہ ہیں جن پر اللہ کا کرم ہوا؟ اگر یہ ایسے ہی اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے تو ان پر پہلے اللہ کا فضل وکرم کیوں نہیں ہوا اور کیوں انہیں اللہ نے مفلسی میں ڈالا ہوا تھا؟ کیوں ان کو فاقوں میں مبتلا کیا ہوا تھا؟ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر دنیا میں کسی کو کوئی حیثیت حاصل ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اس پر مہربان ہے۔ تو چونکہ اللہ دنیا میں ہم پر مہربان ہے تو یہ شے اگر واقعتاً قیمتی ہوتی تو ہمیں ملتی' انہیں نہ ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا کہ اللہ نے ان کو ان کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے اور وہ ان کے لیے اس حق کے پہچاننے میں ایک اوٹ بن گئے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝۵۳﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ خوب واقف نہیں ہے اپنے ان بندوں سے جو شکر کرنے والے ہیں؟'' اللہ ان کو خوب جانتا ہے جو اس حق (قرآن) کی اصل قدر و قیمت سے واقف ہیں اور اس کا شکر ادا کرنے والے ہیں۔

اب سورۃ الانعام کی اگلی آیت میں ایک اضافی بات آ رہی ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ ''اور جب آپ کے پاس (اے نبیؐ!) آئیں وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہیے: تم پر سلامتی ہو' تمہارے ربّ نے (تمہارے لیے) اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے''۔ اب یہاں وہی نقشہ آ رہا ہے جو پہلے حصے میں تھا'

یعنی شفقت اور تبشیر کا انداز۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے دونوں پہلو ہیں‘ جہاں انذار ہے وہاں تبشیر بھی ہے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کے لیے مبشر تھے‘ حوصلہ افزائی فرمانے والے تھے۔ ظاہر ہے بشارت کے اور کون مستحق ہوں گے؟ اب اس بشارت اور رحمت کا مظہر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ”یہ کہ اگر تم میں سے کوئی جہالت کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھے‘ پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ (اللہ تعالیٰ) معاف کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے“۔

یہاں ”اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ“ میں ”مِنْكُمْ“ اہم ہے۔ یعنی جن لوگوں نے رُخ ہی غلط اختیار کیا ہوا ہے تو اب اگر ان کی کوئی نیکی بھی ہے تو وہ کسی کھاتے میں نہیں‘ جبکہ تم سیدھے راستے پر آ گئے ہو‘ تم نے اپنا رُخ درست کر لیا ہے‘ تم نے وہ منزل طے کر لی ہے کہ ﴿اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا﴾ (میں نے تو اپنا رُخ پھیر لیا ہے یکسو ہو کر اُس ہستی کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) تو اگر تم میں سے کسی سے کسی وقت کوئی خطا سرزد ہو جائے‘ کوئی غلط حرکت صادر ہو جائے جہالت کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ یہاں ”بِجَهَالَةٍ“ کے لفظ کو بھی سمجھ لیجیے! اردو میں تو جہالت اَن پڑھ اور ناواقف ہونے کو کہتے ہیں‘ جبکہ عربی میں اگرچہ اس کا یہ مفہوم بھی ہے‘ لیکن یہ تابع ہے‘ اصل مفہوم یہ ہے کہ جذباتی ہونا‘ مشتعل مزاج ہونا۔ عمرو بن ہشام کو ابوجہل اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہی مشتعل مزاج اور اکھڑ مزاج آدمی تھا۔

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا عدمِ واقفیت کی بنا پر انسان سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے‘ پھر اس کے بعد وہ اس سے توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے‘ اپنے رویے کو درست کر لے‘ یہ نہیں کہ پرنالہ وہیں بہتا رہے‘ تو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ [توبہ کا پورا تصور ہمارے منتخب نصاب (۱) کے درس میں جو کہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل ہے‘ آ جاتا ہے۔] یہ گویا کہ تبشیر و بشارت ہے کہ اللہ

کی شانِ غفاری کو بار بار اُن کے سامنے لاتے رہنا کہ اگر خطا ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں ہے‘ تم بھی استغفار کرو‘ میں بھی تمہارے لیے استغفار کروں گا‘ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا۔ اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں امراء کی طرف سے اپنے ساتھیوں کی اسی طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہیے۔

۳) رأفت و رحمت اور خوئے دلنوازی

یہاں سے اب تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ وہی کیفیت جو پہلے حصے میں آئی تھی‘ یہاں اور زیادہ نمایاں ہو کر‘ زیادہ گاڑھی شکل میں نکھر کر اور ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک تو سورۃ التوبۃ کے آخری حصے کی آیت ہے جو بڑی پیاری آیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اہل ایمان کے ساتھ معاملے کی شاید اتنی پیاری تعبیر آپ کو کہیں اور نہ ملے۔ اسی کا ایک عکس داعئ حق کے اندر اپنے ساتھیوں کے لیے ہونا چاہیے۔ کسی بھی چھوٹے یا بڑے امیر سے اپنے مأمورین کے لیے یہی کیفیات مطلوب ہیں‘ اس لیے کہ ہمارے لیے تو مشعل راہ اُسوۂ محمدیؐ ہی ہے‘ ہمیں چلنا تو آپ ﷺ ہی کے نقش قدم پر ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ ”(لوگو!) آ گئے ہیں تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے“۔ مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے مختلف درجات ہوں گے۔ ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ ہم ان میں نہیں ہیں۔ اس کا مصداق پہلے درجے میں بنو ہاشم اور دوسرے درجے میں قریش ہیں‘ اس لیے کہ بنو ہاشم قریش کا ایک گھرانہ ہے۔ تیسرے درجے میں اہل عرب (اُمّیین‘ بنو اسماعیل) آئیں گے اور چوتھے درجے میں پوری بنی نوعِ انسانی ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ بھی بنی آدم میں سے ہیں‘ حوا کے بیٹے ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں درجہ بدرجہ تمام نوعِ انسانی شریک ہو جائے گی۔

آگے ارشاد ہے: ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ ”بہت شاق گزرتی ہے ان پر وہ چیز جو تمہارے لیے تکلیف دہ ہے“۔ جو چیز تم پر بھاری پڑ رہی ہو وہ اُن پر بہت گراں گزرتی ہے۔ وہ تو تمہارے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر چاہتے ہیں۔ اگر وہ تمہیں کھینچ رہے ہیں تو خیر کی طرف کھینچ رہے ہیں‘ ترغیب دے رہے ہیں تو بھلائی کے

لیے دے رہے ہیں۔ بظاہر تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَکَارِہِ))(۱) یعنی جہنم ایسی چیزوں سے چھپا دی گئی ہے جو نفس کو بہت مرغوب ہیں اور جنت ایسی چیزوں سے گھیر دی گئی ہے جو نفس انسانی کو پسند نہیں ہیں۔ لیکن تم یہ کانٹوں بھری باڑ عبور کر کے ہی جنت میں داخل ہو سکو گے۔ وہ اگر تمہیں ان کانٹوں بھری باڑ کی طرف لے جا رہے ہیں تو درحقیقت وہ تمہیں اس جنت کی طرف لے جا رہے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ﴾ ”وہ تم پر بہت ہی حریص ہیں“۔ یعنی تمہارے لیے ہر خیر کے طالب ہیں، ہر بھلائی کے جویا ہیں۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ابھی اہل ایمان کی تخصیص نہیں ہے، اہل ایمان کی تخصیص آگے چل کر آئے گی۔ یہ تو نبی اکرم ﷺ کی وہ قلبی کیفیت ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ آپ ﷺ کا سینہ مبارک نہایت کشادہ ہے کہ ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے آپؐ چاہیں گے کہ وہ سختی سے بچے اور اس کے لیے خیر و فلاح ہو، اس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ہوں۔ آنحضور ﷺ کے مزاج میں کوئی بخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ سابقہ انبیاء و رُسل کے برعکس آپؐ پوری نوعِ انسانی کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ انبیاء و رُسل کے ہاں ہمیں عالمگیر پیغام نہیں ملتا، بلکہ موجودہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ”یہ پیغام دوسروں کے لیے نہیں ہے“۔ اور ایسے سخت الفاظ بھی آئے ہیں کہ ”کوئی شخص اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالتا، یہ تمہارے بچوں (یعنی بنی اسرائیل) کے لیے ہے“۔ یہ بھی آیا ہے کہ ”میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں“۔ اگرچہ ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان الفاظ کی نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف درست ہے یا نہیں، لیکن منطقی طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل کی طرف تھی۔ قرآن مجید میں آپؑ کے لیے ﴿رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حجبت النار بالشھوات۔

اِسْرَآءِیْلَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور سوائے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے باقی تمام رسول کسی نہ کسی معین قوم، قبیلے یا شہر کی طرف بھیجے گئے تھے۔ صرف حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ بابرکات اس سے مستثنیٰ ہے کہ جن کی بعثت عام ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا: ۲۸) ”(اے نبیؐ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر“۔ اس پہلو سے یہاں جامعیت ہوگی، اس لیے کہ دعوتِ حق کے لیے یہی کیفیت تو مطلوب ہے کہ یہ خیر خواہی کے جذبے سے ہو۔ چونکہ آپ ﷺ نے پوری نوعِ انسانی کو دعوت دینی ہے تو اگر پوری نوعِ انسانی کے لیے خیر خواہی نہیں ہوگی تو دعوت کا تقاضا ابتدائی درجہ میں بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہاں ابھی تخصیص نہیں ہے، بلکہ عموم ہے۔ اسی لیے میں نے ﴿لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ﴾ کے مفہوم میں اس کا دائرہ بنی ہاشم سے لے کر بنی آدم تک وسیع کیا ہے۔ اور ﴿عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ﴾ میں بھی پوری نوعِ انسانی آئے گی۔

البتہ آیت کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ: ﴿بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ ”(آپ ﷺ) مؤمنین کے حق میں انتہائی رؤف اور رحیم ہیں“۔ ”رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ“ کے الفاظ پر مکمل بحث سورۃ الحدید کے چوتھے رکوع کے ضمن میں ہوئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سورۃ الحدید کے پہلے رکوع میں رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کی صفت اللہ کے لیے آئی ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹﴾﴾ ”وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے، تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق ہے نہایت مہربان ہے“۔ اور سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں یہ الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً ط﴾ (آیت ۲۷) ”اور ان کے دلوں میں ہم نے رأفت اور رحمت پیدا کر دی جنہوں نے آپ (علیہ السلام) کی پیروی

کی''۔ جبکہ یہاں رؤف اور رحیم کے الفاظ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لیے آئے ہیں۔ یہ جان لیجیے کہ رأفت اور رحمت ایک ہی کیفیت کے دو رُخ ہیں۔ پہلے کسی سے ہمدردی ہوتی ہے' پھر اس کی مدد کی جاتی ہے۔ پہلے کسی کے دکھ کو آپ اپنے اندر محسوس کریں' تب ہی تو آپ اس کی مدد پر آمادہ ہوں گے۔ ان کیفیات کو فزیالوجی میں sensory اور motor کہا جاتا ہے۔ یعنی پہلے آپ کو احساس ہوا کہ مجھے ہاتھ پر کسی چیز نے کاٹ لیا ہے' پھر آپ کا ہاتھ ایک دم وہاں سے ہٹا۔ ایک لمحے پر محیط یہ عمل دراصل اس طور سے انجام پاتا ہے کہ جہاں کاٹا گیا وہاں سے sensation دماغ میں گئی' دماغ نے اسے interpret کیا کہ وہاں کوئی تکلیف دہ شے ہے' وہاں سے فوراً ہاتھ جھٹک دینا چاہیے۔ وہاں سے احکام صادر ہوئے اور وہ motor nerves کے ذریعے ان عضلات تک پہنچے کہ حرکت کرو تاکہ ہاتھ یہاں سے ہٹ جائے۔ اسی طرح سے یہ ایک sensory پہلو ہے جس سے آپ کسی کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ جیسے امیر مینائی نے کہا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

''رأفت'' ﴿عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا مظہر ہے اور ''رحمت'' ﴿حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ﴾ کا مظہر ہے۔ اور آپ ﷺ کی ذات میں یہ دونوں مظہر اہل ایمان کے حق میں بتمام وکمال موجود تھے۔ ﴿بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ یعنی آپ اہل ایمان کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے اور ان کے حق میں انتہائی شفیق اور مہربان ہیں' دکھ درد کو دُور کرنے والے ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی شان ہے اہل ایمان کے حق میں۔ اسی طرح جو بھی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کو دعوت دیتا ہے اسے اسی کا ایک عکس اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے کہ سالارِ کارواں کی اصل متاع یہی ہے کہ نفس گرم بھی ہو اور دل روشن بھی ہو' اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہو اور ان کے دلوں کو موہ لینے والا بھی ہو۔ یہ ساری کیفیات مطلوب ہیں۔

اب ہم سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ آیت اس سلسلے کی اہم ترین آیت ہے۔ فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ﴾ ''(اے نبیؐ) یہ اللہ کی رحمت کا سبب ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں''۔ اب تک ہم نے جن آیات کا مطالعہ کیا ہے ان میں رسول اللہ ﷺ کو ہدایات تھیں کہ آپ اہل ایمان کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کیجیے' جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ فی الواقع مؤمنین کے لیے انتہائی شفیق اور رحیم ہیں۔ اب یہیں سے یہ موضوع شروع ہو رہا ہے کہ یہ سب اللہ کی رحمت اور شفقت کا مظہر ہے کہ اے نبیؐ! آپؐ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم ہیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا مزاج اور آپؐ کی طبیعت کی ساخت ہی اس طرح بنائی ہے۔ ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ''اور اگر آپؐ سخت دل اور تندخو ہوتے تو یہ آپؐ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے''۔ جیسے اقبال نے کہا ہے:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

اس کے برعکس اگر امیر کارواں میں خوئے دل نوازی ہو تو لوگ اس کے گرد کھنچے چلے آتے ہیں۔ بقول اقبال:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں؟
فقط یہ بات' کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق!

تو اگر داعئ حق تندخو اور سنگ دل ہو تو لوگ منتشر ہو جائیں گے۔

اب اصل بات یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے! نرمی تو آپؐ کے دل میں ہے' لیکن اس نرمی کا ظہور کیسے ہو۔ اس کے لیے آپ ﷺ کو چار کام گنوائے جا رہے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ انہیں معاف کرتے رہا کریں''۔ اس کی ضرورت ہر صاحب امر کو ہے' چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ سورۃ التغابن میں اہل وعیال کے بارے میں ہدایتِ قرآنی ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۴﴾ ''اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو یقیناً اللہ غفور ہے رحیم ہے''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل و عیال کی تربیت کے لیے معاف کرنے کی خُو نہایت مؤثر ہے۔ اس لیے کہ ہر وقت کا دنگا فساد' ڈانٹ ڈپٹ' اٹھتے بیٹھتے کی جھڑکی' یہ سب چیزیں گھر کے اندر میدانِ کارزار کا سا ماحول پیدا کرنے کے مترادف ہیں' اور ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس سے ضد' ہٹ دھرمی اور اپنی غلطی پر اصرار جیسے برے نتائج نکلتے ہیں' انسان ڈھیٹ ہو جاتا ہے' شرم و حیا کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ تو یہاں پر بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ (ﷺ) انہیں معاف کیا کریں''۔ یہ معاف کر دینا انسان کا شعوری فیصلہ ہونا چاہیے اور اپنے دل پر جو میل آیا ہوا سے دھو لینا چاہیے' ورنہ اس کھردری سطح پر میل جمع ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان شعوری طور پر فیصلہ کرے کہ میں نے معاف کیا' اور کوشش کر کے دل سے اس میل کو نکال دے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''اور ان کے لیے (اللہ سے) استغفار بھی کیا کریں''۔ یہ پہلی بات کا منطقی نتیجہ ہے۔ کیونکہ کسی کے لیے اللہ سے دعا اسی وقت ہوگی جب اس کی طرف سے دل صاف ہوگا۔ اس لیے کہ دعا کا اصل جوہر درحقیقت اخلاص ہے۔ اگر اخلاص نہیں ہے تو وہ دعا نہیں ہے' بلکہ ایک رسم ہے جو پوری کر دی گئی ہے۔ جبکہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (المؤمن: ۶۵) ''پس اللہ کو پکارو اُس کے لیے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے''۔ تو جب تک اس شخص کے لیے فی الواقع آپ کے دل میں یہ اخلاص پیدا نہ ہو تو چاہے آپ نے رٹے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کر دیے لیکن استغفار کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کا ایک عکس یہ بھی ہے کہ آپ استغفار کریں گے تو اس سے آپ کا دل بھی صاف ہوگا۔ تنہائی میں اگر آپ اپنے کسی ساتھی کی زیادتی پر جو اُس نے آپ پر کی ہو' اللہ سے استغفار کریں گے تو آپ کا دل میل سے بالکل صاف ہو جائے گا۔

تیسرے نمبر پر فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ ''اور معاملات میں انہیں

شریکِ مشورہ کیا کریں''۔ یہاں لفظ ''امر'' وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ یہ دراصل خاص طور پر کمزور اور ضعیف ساتھیوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے' کیونکہ سارا پس منظر انہی کے بارے میں ہے۔ ان کے لیے نرمی ہونی چاہیے' نہ یہ کہ درشتی' سختی اور ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ انہیں شعوری طور پر معاف کرنا ہے' ان کے لیے استغفار کرنا ہے۔ اور پھر ایسا بھی نہ ہو کہ تمہاری نگاہ میں ان کی قدر اس طرح گر جائے کہ اب انہیں مشوروں سے خارج کر دو۔ یہ تیسرا نتیجہ نکل سکتا تھا جس کا یہاں سدّ باب کیا گیا کہ اعتماد کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ اس لیے کہ انسان ہر چیز کا تأثر لیتا ہے۔ ایسا شخص لازماً یہ تأثر لے گا کہ اب میں ان کی good books میں نہیں رہا' یہ اب مجھ سے بات نہیں کرتے اور کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کرتے۔ یہ چیز اُن کے دل کو آپ سے دور کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ دلوں کے فاصلے اس اجتماعیت کے ضعف کا موجب ہوں گے جو آپ اللہ کے دین کے لیے قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں بھی مشوروں میں شریک کیا کریں۔ کسی کو مشورے میں شریک کرنا درحقیقت اس پر اظہارِ اعتماد ہے۔ آدمی کو جن کے خلوص اور فہم پر اعتماد ہوتا ہے ان سے ہی وہ مشورہ کرتا ہے۔

اس ضمن میں چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ ''پھر جب آپ کسی چیز کا عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجیے!'' آپ ان کو مشورے میں ضرور شریک کیجیے' البتہ آپ پر کوئی اپنا فیصلہ ٹھونسنے والا نہیں ہے۔ مشورے کے بعد فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ مشورہ اپنے نفس کے اعتبار سے ایسی چیز ہے کہ لازم نہیں کہ اس کو قبول کیا جائے۔ اس لیے تمام لوگوں کو مشورے میں شریک کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگر ووٹوں کی گنتی سے فیصلہ کرنا ہوتا تب تو آپ کو چھلنیاں لگانی ہوتیں کہ اگر سب پختہ و ناپختہ لوگوں کو مشوروں میں شریک کر لیا گیا تو غلط فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ صرف امیر کے ہاتھ میں ہے تو پھر لوگوں کے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے انہیں ضرور مشوروں میں شریک کیا جانا چاہیے!

بہت سے لوگوں نے یہاں خواہ مخواہ کھینچ تان کی ہے کہ امیر کے لیے مشورہ قبول

کرنا لازم ہے۔ ان کے نزدیک گویا یہاں لفظ ہونا چاہیے تھا: ''فَاِذَا عَزَمْتُمْ'' شاید اللہ تعالیٰ بھول گیا (معاذ اللہ)۔ اور اگر یقین ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس میں کوئی شوشا بھی یوں ہی الل ٹپ نہیں آ گیا ع

''زیر ہر ہر لفظ غالبؔ چیدہ ام میخانۂ''

اور ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

تو پھر ماننا پڑے گا کہ ''عَزَمْتَ'' میں یہ واحد مذکر حاضر کی ضمیر بڑی فیصلہ کن ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ط﴾ ''پس جب (اے نبیؐ!) آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کیجیے''۔ پھر یہ ہرگز نہ سوچیے کہ کس کی رائے مخالف تھی اور کس کی رائے حق میں تھی' اور یہ کہ اگر کسی کی رائے کے خلاف فیصلہ کر لیا تو اقامتِ دین کی گاڑی نہیں چلے گی۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے''۔ اللہ اپنے ان بندوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے معاملے کو اُس کے حوالے کریں اور اسی پر توکل کریں' اور یہ یقین رکھیں کہ وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا' باقی کسی کی ناراضگی اور رضامندی سے اور کسی کا ساتھ دینے یا نہ دینے سے کوئی فیصلہ کن فرق واقع نہیں ہوگا۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

☆ — ☆ — ☆

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ - اور - غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام　　نظامِ خلافت کا قیام



تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**